کوریا اور چین کا سفرنامہ

چین ہے تو چین میں



تاج محمد لشماہ

ارتقا پبلی کیشنز لاہور

کوریا اور چین کا سفرنامہ

چین ہے تو چین میں

تاج محمد لنگاہ

ارتقا پبلی کیشنز، لاہور

چلین ہے تو چین ہیں

مصنّف ——— تاج محمد لنگاہ

ناشِر ——— جاذب سہیل - ارتقاء پبلی کیشنز

الرحمٰن، ۶۵ دی مال، لاہور - فون: ۵۸۹۱۸

کتابت ——— خورشید - ڈبل شین

تاریخِ اشاعت ——— دسمبر ۱۹۷۶

تعداد ——— تین ہزار

مطبع ——— نظامی پریس - ۶ پریس مارکیٹ لاہور

قیمت ——— [redacted]

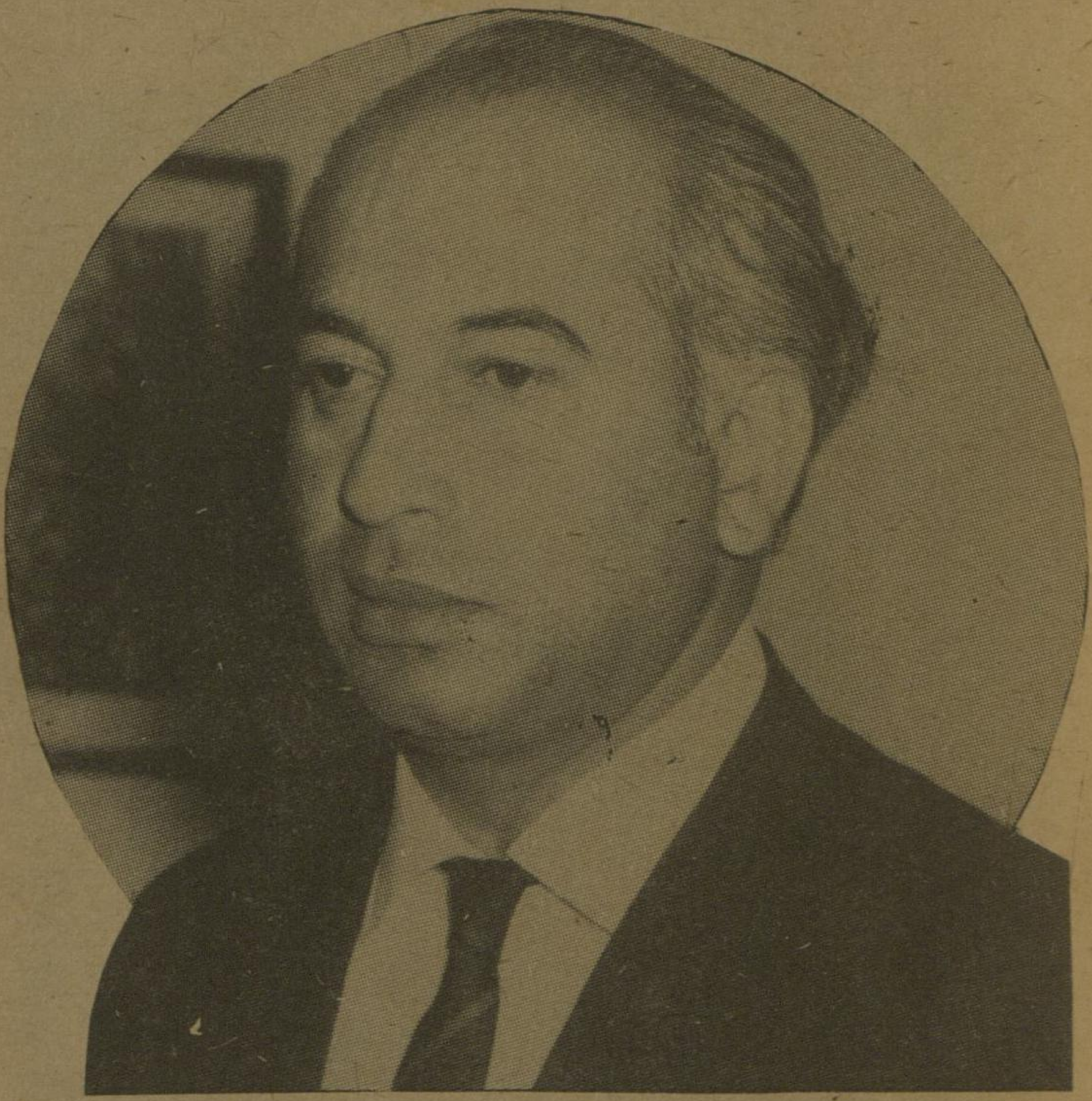
چین ہے تو چین میں



تاج محمّد لنگاہ

چین ہے تو چین میں

انتساب



چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو

کے نام جن کے ساتھ میں نے

کوریا اور چین کا دورہ کیا ،

تاج محمد لنگاہ



چیئرمین ماؤزے تنگ

چین ہے تو چین



صدر کِم اِل سُنگ

ترتیب

انتساب ——— چیئرمین بھٹو کے نام ——— ۷
حرفِ چند ——— تاج محمد لنگاہ ——— ۱۵
پیش لفظ ——— ظہیر کاشمیری ——— ۲۱
ہانگ کانگ ——— ۳۱
ہانگ کانگ کو روانگی ——— ۴۹
کچھ ہانگ کانگ کے بارے میں ——— ۶۹
عوامی جمہوریہ کوریا ——— ۷۳
شمالی کوریا کو روانگی ——— ۷۵
صنعتی نمائش ——— ۹۵
اوپرا ——— ۱۱۳
کم اِل سُنگ کا آبائی گاؤں ——— ۱۲۳

چلڈرن پیلس ۔۔۔۔۔۔ ۱۵۷
کوریا کے بارے میں چند مزید معلومات ۔۔۔۔۔۔ ۱۷۲
پاک کوریا دوستی کا مختصر جائزہ ۔۔۔۔۔۔ ۱۸۲
عوامی جمہوریہ چین ۔۔۔۔۔۔ ۱۸۷
عوامی جمہوریہ چین کو روانگی ۔۔۔۔۔۔ ۱۸۹
ممنوعہ شہر کا دورہ ۔۔۔۔۔۔ ۱۹۹
یونیورسٹی کا دورہ ۔۔۔۔۔۔ ۲۲۰
ثقافتی شو ۔۔۔۔۔۔ ۲۳۸
دیوارِ چین ۔۔۔۔۔۔ ۲۵۳
چین کے بارے میں مزید معلومات ۔۔۔۔۔۔ ۳۰۳
چین کی اہم شخصیات ۔۔۔۔۔۔ ۳۲۲
چیئرمین ماؤزے تنگ ۔۔۔۔۔۔ ۳۲۴
ہوا کو فنگ ۔۔۔۔۔۔ ۳۳۱
وانگ ہُن دِین ۔۔۔۔۔۔ ۳۳۵
یہہ چیئن ینگ ۔۔۔۔۔۔ ۳۳۹
مادام چیانگ چنگ ۔۔۔۔۔۔ ۳۴۳
لی سیئن نن ۔۔۔۔۔۔ ۳۴۵
چیاؤ کوآن ہوا ۔۔۔۔۔۔ ۳۴۸
پاک چین دوستی کا مختصر جائزہ ۔۔۔۔۔۔ ۳۵۱
چین کے بارے میں مزید معلومات ۔۔۔۔۔۔ ۳۵۷
عظیم ماؤ کو سلام ۔۔۔۔۔۔ ۳۷۴

حرفِ چند

میں کوئی ادیب، مؤرخ یا بہت بڑا مصنّف ہونے کا دعویدار نہیں ہوں لیکن ایک عرصہ سے میری خواہش تھی کہ کوئی اچھی کتاب لکھی جائے۔ اس سلسلہ میں ایک دوست صلاح الدین محمد نے میری حوصلہ افزائی کی چنانچہ ۱۹۷۶ء کے شروع میں میں نے اپنی پہلی تصنیف "نظام کی تبدیلی کے تقاضے" کے نام سے لکھنا شروع کی۔ یہ کتاب تقریباً مکمل ہو چکی تھی کہ مجھے وزیرِاعظم پاکستان کے ساتھ کوریا اور چین جانے کا موقع ملا جب میں وہاں سے واپس آیا تو بہت سے دوستوں نے اصرار کیا کہ میں کوریا اور چین کے مشاہدات کو سفرنامہ کی شکل میں تحریر کروں یہ بات میرے دل کو لگی۔ بھٹو صاحب اکثر دورے کرتے رہتے ہیں مگر ان دوروں کے وہ پہلو جو عوام کی دلچسپی کا باعث بن سکتے ہیں، ان کو آج تک ریکارڈ نہیں کیا گیا تھا۔ اور پھر کوریا جو کہ رقبہ کے لحاظ سے ایک چھوٹا ملک ہے۔ اس کی حیرت انگیز ترقی نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ پاکستان جیسے غریب ملک کے لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اپنے مشاہدات کو ضبطِ تحریر میں لاؤں۔ اور یہ کہ چین جیسا اہم ملک

جس کے بارے میں پاکستان کے عوام معمولی سے معمولی بات جاننا چاہتے ہیں ۔ میں نے جو کچھ اس عظیم ملک میں دیکھا اس سے پاکستانی عوام کو روشناس کرانا یقیناً ایک "نظریاتی عبادت" سے کم نہ تھا۔

اگرچہ چین اور کوریا کے بارے میں علیحدہ علیحدہ کتابیں بھی لکھی جاسکتی تھیں مگر سفرنامے کے فنی پہلوؤں اور کتاب کی دلچسپی کا تقاضا تھا کہ کوریا اور چین میں جو کچھ میں نے دیکھا، اسے ترتیب اور تسلسل سے قلمبند کر دیا جائے۔ یوں تو کوریا کے بارے میں پاکستان میں ترقی پسند لٹریچر کی کمی نہیں ہے لیکن کوریا کے بارے میں کسی پاکستانی کے تاثرات کتابی شکل میں موجود نہیں تھے۔ اس لئے یہاں کے مشاہدات عوام کے لئے صرف دلچسپی کا باعث ہی نہیں بن سکتے تھے بلکہ انہیں ایک مضبوط سوشلسٹ ملک کے تانے بانے کو سمجھنے میں بھی مدد دے سکتے تھے اور چین کی بین الاقوامی سطح پر جو اہمیت ہے اور دنیا بھر کی مظلوم قوموں کا جس پُر اثر انداز میں چین نے ساتھ دیا ہے اور اصولی سیاست کے ذریعے اقوامِ عالم میں جو مقام پیدا کیا ہے۔ اس کی سماجی، سیاسی، ثقافتی، ادبی اور عام زندگی کے بارے میں چشم دید حقائق کو عوام تک پہنچانے کی اہمیت چنداں

محتاجِ صراحت نہیں ہے۔ خاص طور پر ثقافتی انقلاب کے بعد چین میں جو ردو بدل ہوا، اس نے پاکستان ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے عوام کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔

میں نے "چین ہے تو چین میں" میں صرف وہ حالات و واقعات لکھے ہیں جنکا بچشمِ خود مشاہدہ کیا ہے۔ چو این لائی کے انتقال کے بعد چین میں قیادت کی جو تبدیلیاں ہوئیں کتاب میں انہیں بھی تحریر کردیا گیا ہے۔ البتہ ماؤ کے انتقال کے بعد کے واقعات کتاب میں درج نہیں ہیں کیونکہ یہ ایک سیدھا سادا اور سلیس سفرنامہ ہے جس کا مقصد کوریا اور چین کی روز مرہ زندگی اور سوشلسٹ نظام نے ان ملکوں کو جو کچھ دیا ہے اس سے عوام کو روشناس کرانا ہے۔ اس تصنیف کا مقصد کوئی تاریخی تحقیق نہیں اور نہ ابھی ماؤ کے انتقال کے بعد کے واقعات کھل کر سامنے آئے ہیں۔

یہ کتاب اردو زبان میں اس لئے لکھی گئی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ مزدور، کسان، طالب علم اور سیاسی کارکن مستفید ہوسکیں۔ میں چونکہ اُردو داں ہونے کا دعویدار نہیں ہوں اس لئے ہوسکتا ہے کتاب میں زبان و بیان کی وہ چاشنی موجود نہ ہو جو اُردو داں کا طرۂ

امتیاز ہوسکتی ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے کوریا اور چین میں ۱۲ دن کے دورے کے دوران جو کچھ دیکھا، اسے سیدھی سادی زبان میں تحریر کر دیا ہے اور مجھے توقع ہے کہ قارئین اس کتاب میں وہ سب کچھ پائیں گے جو کچھ وہ کوریا اور چین کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں تاہم اگر کوئی پہلو وضاحت طلب رہ گیا ہو یا اعداد و شمار میں کہیں غلطی رہ گئی ہو تو اسے میری سہوِ نظر سمجھنا چاہیئے۔

کتاب میں دورہ کے ساتھیوں اور دوسرے اکثر دوستوں کا ذکر آیا ہے جسے محض سفرنامے کے تسلسل سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ تاہم اگر کسی دوست کو میری تحریر یا رائے سے "اتفاق" نہ ہو تو یہ میں ان کا حق سمجھتا ہوں، میں نے کوشش کی ہے کہ کسی دوست کی دل آزاری نہ کی جائے اور امید ہے کہ دوست بھی فراخدلی کا ثبوت دیں گے۔

مجھے یہ دکھ سے لکھنا پڑ رہا ہے کہ کتاب کو شائع کرنے کے اخراجات کو برداشت کرنا میرے جیسے غریب کارکن کے بس کا روگ نہیں تھا اور اس ضمن میں جن عزیز ترین دوستوں نے اعانت کا وعدہ کر رکھا تھا وہ بھی وقت پر کام نہ آسکے۔ ان میں بے شمار وہ دوست بھی شامل ہیں جن کے لئے

میں نے اپنی "متاعِ جاں" تک قربان کرنے سے دریغ نہیں کیا تھا۔ اور پھر جن ناشرین سے رابطہ قائم کیا گیا ان کی اشاعتی شرائط اتنی تکلیف دہ اور غیر مناسب تھیں کہ میں چکرا کے رہ گیا۔ مقامِ شکر ہے کہ مجھے ارتقاء پبلی کیشنز کا تعاون میسّر آگیا اور میری مشکل حل ہوگئی۔ میں پبلشر مسٹر جاذب سہیل، اسد اللہ لنگاہ اور ادارے کے دیگر کارکنوں کا ممنون ہوں جن کے پُر خلوص تعاون سے میری کاوشیں بارآور ہوئیں اور میری کتاب کی تدوین و اشاعت ہو سکی۔

مجھے توقع ہے کہ "چین ہے تو چین میں" پاکستان کے نظریاتی حلقوں ہی میں پسند نہیں کی جائیگی بلکہ اسے تمام مکاتیبِ فکر پذیرائی بخشیں گے۔ میں نے کوریائی اور چینی ناموں کے تلفظ میں ہر ممکن احتیاط سے کام لیا ہے تاہم اگر کہیں حرکات و سکنات یا اعداد و شمار میں غلطی رہ گئی ہو تو میں امید رکھتا ہوں کہ کوریا اور چین کے دوست، وفد کے ساتھی اور نظریاتی اصحاب میری رہنمائی فرما کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

تاج محمد لنگاہ

پیش لفظ

تاج محمد لنگاہ کا نظریاتی سفر نامہ "چین ہے تو چین میں" عہدِ حاضر کے ترقی پسند قاری کے لئے خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کتاب کے، مصنف جدید سیاسی اور عمرانی تحریکوں پر گہری تنقیدی نظر ہی نہیں رکھتے بلکہ وہ ایک عرصہ سے اپنی قومی سیاست میں عملاً حصہ بھی لے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نظریاتی سفر نامے میں چینی معاشرے کے نصب العینی خد و خال کی وضاحت ہی نہیں ملتی بلکہ نظریے کے ساتھ ساتھ اس عمل پر بھی روشنی پڑتی ہے جو آج پورے چینی معاشرے میں جاری و ساری ہے۔

اس کتاب کے مصنف کا بنیادی مقصد چونکہ اپنے قاری کو اپنے اسلوبِ تحریر کے جوہر دکھانا مقصود نہیں بلکہ اسے مشرق میں ابھرتی ہوئی ایک عہد آفریں سوشلسٹ تہذیب سے آگاہی بخشنا ہے اور اپنی قومی زندگی کے لئے ایک محرک مہیا کرنا ہے۔ اس لئے "چین ہے تو چین میں" ان کا اندازِ تحریر استعاراتی یا گنجلک نہیں بلکہ شستہ اور آسان ہے اور انہوں نے سیدھے سادے انداز میں اپنے قاری کو چین اور شمالی کوریا کے عظیم ترقی پذیر معاشروں کی اندرونی تفصیلوں سے آگاہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

چین اور شمالی کوریا کے ابھرتے ہوئے نئے سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی نظام ایک طرف پوری معاصر عالمی تہذیب پر گہرے طریقے سے اثرانداز ہورہے ہیں تو دوسری طرف ان ابھرتی ہوئی تہذیبوں نے مشرقِ بعید اور جنوب مشرقی ایشیا کی سیاست کا نقشہ تبدیل کر دیا ہے۔ بہت عرصہ پہلے کی بات نہیں کہ بحرالکاہل سے بحرِ ہند تک تمام چھوٹے بڑے خطّے عالمی سامراجوں کی شکارگاہ بنے ہوئے تھے اور ان خطّوں کے عوام اپنی بے پناہ صلاحیتوں اور اپنے بے پناہ قدرتی وسائل کے باوجود غلامی اور انتہائی پسماندگی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ لیکن یہ کریڈٹ چین اور شمالی کوریا کے عوام کو جاتا ہے کہ انہوں نے اس خطّۂ دنیا کو آزاد و سربلند بنانے کے لئے دنیا بھر کے سامراجیوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا اور کئی طویل اور صبر آزما جنگوں کے بعد انہوں نے دنیا کے طاقتور ترین سامراجوں کو شکستِ فاش دی اور ہندچینی تک سے امریکہ جیسے مضبوط ترین سامراج کو نکال باہر کیا۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو چین اور شمالی کوریا کی سیاست و معیشت اور وہاں کی انقلاب آفریں جدوجہدِ آزادی سے تیسری دنیا اور خصوصاً ایشیا کے ترقی پذیر ممالک بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں اور وہ ان جگرداراور دانشمند ایشیائی ممالک کے نظریئے اور عمل کو اپنے قومی تقاضوں کے سانچوں میں ڈھال کر ترقی کی راہوں پر گامزن ہو سکتے ہیں۔ تاج محمد لنگاہ نے ایک گریزپا سیاح کی حیثیت سے کوریا اور چین کے معاشروں میں جو کچھ دیکھا، وہ سنی سنائی باتیں نہیں بلکہ آنکھوں دیکھی حقیقتیں ہیں اور پھر ان کے شمالی کوریا اور چین کے دورے کو کچھ زیادہ عرصہ بھی نہیں ہوا۔ اس لحاظ سے یہ کتاب اپنے موضوع پر جدید

بھی ہے اور معتبر بھی۔

مصنّف اپنے قافلہ کے ہمراہ شمالی کوریا جاتے ہوئے سب سے پہلے ہانگ کانگ میں قیام پذیر ہوئے۔ ہانگ کانگ برطانوی نوآبادی ہے اور بیدار ہوتے ہوئے مشرق میں پسپا ہوتے ہوئے مغربی سامراج کی نشانی سمجھی جاتی ہے یہاں دنیا بھر کے صنعتی ملکوں کا ساز و سامان ہمہ وقت ملتا ہے۔ اس کی عمارتیں، بنک، فلک بوس کاروباری ادارے اور عشرت کدے دیکھ کر نووارد کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہو جاتی ہے۔ "چین ہے تو چین میں" کے مصنّف اس دنیائے رنگ و بو میں قدم رکھتے ہیں، اس کی تہذیبی رنگینیوں کا نقشہ کھینچتے ہیں لیکن نوآبادیاتی نظام کے داخلی تضادات کو ایک لمحہ کے لئے فراموش نہیں کرتے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "ہم ایک ریستوران میں چائے پینے چلے گئے، بڑا پُر فضا ہوٹل تھا، کثیر تعداد میں لڑکے اور لڑکیاں چائے پی رہے تھے اور نہایت خوش باش نظر آ رہے تھے، یہاں کے چھوٹے دکانداروں کے معاشی اور معاشرتی حالات بہت اچھے ہیں اور وہ کاروباری لحاظ سے بہت خوشحال ہیں مگر سماجی برائیوں میں یہ معاشرہ سرتاپا ڈوبا ہوا ہے، قتل، ڈاکے، عصمت فروشی، دھوکہ دہی اور دوسرے سنگین جرائم معمول کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہانگ کانگ میں چینی لڑکیاں کھلے بندوں عصمت فروشی کرتی ہیں اور پیسے کی خاطر اپنا سب کچھ لٹانے پر تیار ہو جاتی ہیں۔ اس دلدل میں بڑے بڑے خاندانوں کی لڑکیاں بھی دھنسی ہوئی ہیں، بے شمار والدین اور خاوند اس کا برا نہیں مناتے، انہیں صرف سکے چاہئیں وہ کسی طرح بھی حاصل کئے جائیں۔"

ہانگ کانگ سے مصنّف شمالی کوریا کی انقلاب آفریں سرزمین پر قدم رکھتے ہیں۔

جہاں کے عوام صدر کِم اِل سُنگ کی قیادت میں "جُوچے" پروگرام پر عمل پیرا ہیں اور ایک تیز رفتار ارتقاء کے ذریعے زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کر رہے ہیں۔ شمالی کوریا کو موجودہ انقلابی منزلوں تک پہنچنے کے لئے بڑی طویل اور کٹھن مسافت طے کرنا پڑی ہے۔ جزیرہ نمائے کوریا ۵۰۰ برس تک چین کے زیرِ اقتدار رہا۔ ۱۹۰۵ء میں جاپان نے اس پر قبضہ کر لیا اور ۱۹۱۰ء میں اسے اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ کوریا میں چونکہ سونا، تانبا، کوئلہ، گریفائٹس اور ٹینگسٹن بکثرت پایا جاتا ہے۔ اس لئے بڑی طاقتیں شروع ہی سے اس کے بٹوارے کا خواب دیکھتی رہیں۔ ۱۸۹۶ء، ۱۹۰۳ء اور ۱۹۱۰ء میں زارِ روس اور جاپانی شہنشاہیت نے کوریا کو آپس میں تقسیم کرنے کے خفیہ معاہدے کئے اور ۳۸ خطِ متوازی کو خطِ تقسیم مقرر کیا۔ ۸ اگست ۱۹۴۵ء کو روس نے جاپان کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے کے بعد جب کوریا میں اپنی فوجیں داخل کر دیں تو کوریا کو روس اور امریکہ کے درمیان دو حصوں میں عارضی طور پر بانٹ دیا گیا اور ۳۸ خطِ متوازی، خطِ تقسیم قرار پایا۔

۱۰ مئی ۱۹۴۸ء کو امریکہ نے جنوبی کوریا میں انتخابات کروائے اور انتخابات کے بہانے شمالی کوریا پر بھی سیاسی اور پارلیمانی بالادستی قائم کرنا چاہی۔ اس سازش کے نتیجے میں ۲۵ جون ۱۹۵۰ء کو جب جنگِ کوریا کا آغاز ہوا تو امریکہ نے شمالی کوریا کا وجود ختم کرنے کے لئے اقوامِ متحدہ کے فورم کو استعمال کیا اور اس کے ممبر اراکین کو بلا وجہ جنگ میں گھسیٹ لیا۔ شمالی کوریا نے اس جنگ میں بے مثال حب الوطنی کا ثبوت دیا اور امریکہ اور اس کے حواریوں کی جارحیّت کو ناکام بنا دیا اس جنگ میں ۴۰۰۰ ۲ ۱ امریکی اور ۱۵۴۴ برطانوی فوجی توپوں کا ایندھن بنے۔

کتاب کے مصنف نے جنگوں کی بھٹی سے کندن بن کر نکلے ہوئے شمالی کوریا کی تقریبًا

کا حال بڑی خوبصورتی سے قلمبند کیا ہے۔ وہاں انہوں نے بچوں کی ریلیاں دیکھیں، سرکس دیکھا، اوپرا دیکھا، شمالی کوریا کے رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں اور سارے کے سارے معاشرے کو ایک ہی نصب العین کے رنگ میں رنگا ہوا پایا۔ جب انہوں نے شمالی کوریا کے ایک رہنما سے پوچھا "یہاں قتل، اغوا، ڈاکے اور اسی قسم کے جرائم کی شرح کیا ہے؟" تو اس رہنما نے ہنس کر جواب دیا "یہاں جرائم ہوتے ہی نہیں، جرائم تو قبائلی، سرداری اور سرمایہ دارانہ معاشروں کی میراث ہیں سوشلسٹ نظام میں ایسے جرائم واقع نہیں ہوتے۔" اس موقعہ پر مصنف یہ انکشاف بھی کرتے ہیں کہ وہاں اگرچہ پارٹی ممبرشپ کی شرائط بہت زیادہ کڑی ہیں اس کے باوصف شمالی کوریا کی ایک کروڑ ستر لاکھ کی کل آبادی میں کم و بیش تیس لاکھ افراد کوریا ورکرز پارٹی کے ممبر ہیں۔

مصنف نے صرف ضیافتوں، تقریروں، جوابی تقریروں، ستھرے ستھرے بازاروں اور پھلوں سے لدے پھندے باغوں اور سرسبز کوہساروں کا تذکرہ ہی نہیں کیا بلکہ انہوں نے شمالی کوریا کے پورے معاشی اور معاشرتی نظام پر روشنی ڈالی ہے اور عوامی جمہوریہ کوریا کے عوام نے صنعت و زراعت میں جو حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اس کے اعداد و شمار تک دیئے ہیں۔ اس حصہ کو پڑھ لینے سے قاری شمالی کوریا کے پورے سوشل پیٹرن اور اس کی ارتقائی سطح سے پوری طرح واقف ہو جاتا ہے اور وہ یہ بھی جان لیتا ہے کہ بین الاقوامی سیاست میں کم اِل سُنگ قیادت کا مؤقف کیا ہے۔

چین دنیا میں قدیم ترین تہذیب کا گہوارہ رہا ہے اور اس کی عمومی تاریخ سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے۔ عوامی جمہوریہ چین کی تاسیس کا اوّلین مرحلہ وہ تھا

جب کومنتانگ کا دایاں اور بایاں بازو کھل کر ایک دوسرے کے سامنے آگیا۔ اور ۱۹۲۷ء میں چیانگ کائی شیک کی دائیں بازو کی رجعت پسند فوجوں نے شنگھائی کے مزدوروں کا بے دریغ قتلِ عام کیا، چیانگ کائی شیک کو چونکہ دنیا بھر کے سامراجوں کی حمایت حاصل تھی۔ اس لئے اس کا دعویٰ تھا کہ وہ چین کی عوامی جدوجہد کو بہت جلد کچل کر رکھ دے گا۔ اس نے چین کے ان علاقوں پر جہاں عوامی فوجوں کا تسلط تھا، پانچ حملے کئے اور بچوں، بوڑھوں کا بے دریغ قتلِ عام کیا۔ تاریخ میں چیانگ کائی شیک کی ان فاشی مہموں کو — FIVE ANNIHILATION CAMPAIGNS — کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ ان مہموں کا ہی نتیجہ تھا کہ عوامی فوجوں اور انقلابی عوام نے اپنی حکمتِ عملی بدلی اور ۱۹۳۲ء میں ماؤزے تنگ کی قیادت میں لانگ مارچ کا آغاز کردیا ۱۹۳۶ء تک عوامی قوتیں چین کے شمال میں مجتمع ہوگئیں اور انہوں نے سامراجوں کے پٹھو چیانگ کائی شیک کی تنخواہ دار فوجوں پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے۔ اس خانہ جنگی میں چیانگ کائی شیک کو کامیاب بنانے کے لئے امریکہ اور دوسرے سامراجوں نے اربوں ڈالر خرچ کئے اور اربوں ڈالر کا دوسری عالمی جنگ کا بچا ہوا سامانِ حرب چیانگ کائی شیک کو بہم پہنچایا کہ چینی عوام کی بے پناہ عوامی طاقت کے سامنے رجعت پسند جرنیل، ان کے تنخواہ دار فوجی اور ان کے حامئی سامراج ریت کی دیوار ثابت ہوئے، چیانگ کائی شیک نے بھاگ کر فارموسا کے جزیرے میں پناہ لی اور چین کے طول و عرض میں عوامی جمہوریہ چین کا پرچم لہرا دیا گیا۔

"چین ہے تو چین میں" کے مصنف نے اپنے مختصر دورۂ چین کے دوران کافی کچھ دیکھا، انہوں نے دیوارِ چین سے ماڈل فارموں تک کی سیر کی انہوں نے چین میں جو ثقافتی

شو دیکھا، وہ تیرہ حصوں پر مشتمل تھا اور ہر حصہ عوامی چین کی تاریخِ انقلاب سے متعلق تھا۔ انہوں نے چینی قائدین سے ملاقاتیں کیں اور نئے چین کے بارے میں تازہ ترین معلومات حاصل کیں، انہوں نے پرانے شاہوں کے محلات، جمنیزیم ہال، بچوں کے شو اور یونیورسٹی کو دیکھا اور اپنے مشاہدے کو جزئیات کے ساتھ "چین ہے تو چین میں" میں قلمبند کر دیا۔ انہوں نے چینی کمیون اس کے طریقِ کار اور چینی سیاست اور معیشت میں اس کی اہمیت کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ بہت معلومات افزا ہے۔ انہوں نے ماؤزے تنگ کی پالیسی کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے۔ "ماؤزے تنگ لائن یہ ہے کہ چین ابھی ترقی پذیر سوشلسٹ ملک ہے اگرچہ نجی ملکیت کا خاتمہ ہو چکا ہے مگر ابھی پرانے جاگیرداروں کے بیٹے، بیٹیاں اور ان کے حواری سرمایہ داروں کی اولاد، گماشتہ افسر شاہی میں رجعت پسند اور ترمیم پسند کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ان لوگوں کی مسلسل کوشش ہے کہ چین میں انقلابی عمل کو نقصان پہنچایا جائے اور سرمایہ دارانہ نظام کو بحال کرنے کی کوشش کی جائے۔ ماؤزے تنگ لائن کے مطابق سوشلسٹ انقلاب کی تکمیل کے ضمن میں صرف ایک اہم منزل طے ہوئی ہے یعنی نجی ملکیت کا خاتمہ، اس کے علاوہ سرمایہ داری نظام کی لعنتوں کے دوسرے فکری عوامل اور باقیات ابھی موجود ہیں، ذرا سی کوتاہی پر بھی یہ لوگ پر پرزے نکال سکتے ہیں۔ جب کہ ایسا نہیں ہونا چاہیئے، ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۶ء تک کا ثقافتی انقلاب بھی موجودہ نظریاتی جدوجہد کا حصہ تھا۔"

مصنف نے ممنوعہ شہر کا دورہ کرتے ہوئے ایک چینی شہنشاہ کے "تخلیہ کے ہال" میں نصب شدہ ایک وزنی پتھر کا ذکر یوں کیا ہے: "یہ منگ خاندان کے زمانے کا عظیم ترین اور سب سے بڑا کندہ کیا ہوا پتھر ہے۔ یہ پتھر پیکنگ سے کئی سو میل دور سمندر کے کنارے

پہاڑی پر نصب تھا۔ اس کا وزن ۲۵۰ ٹن یعنی سات ہزار من ہے۔ اس پتھر کو ایک ہزار گھوڑوں کی گاڑی کے ذریعے رسوں وغیرہ سے کھینچ کر یہاں لایا گیا ظاہر ہے' ہزار گھوڑوں کی گاڑی کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں مزدور بھی ہوں گے، کہتے ہیں جب یہ گاڑی چین کے دیہی علاقوں سے گزری تو اس کی زد میں آنے والے ہزاروں غریب کچلے گئے، سینکڑوں کھیت ویران ہو گئے اور بے شمار مکانات گرا دیئے گئے جو بلاشبہ قدیم چین کے جاگیردارانہ نظام کے ظلم وستم کی بدترین مثال ہے"۔

مصنف نے اپنے مختصر قیام چین کے دوران چین کی قدیم وجدید تاریخ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور انہیں بڑے شستہ اور جامع انداز میں اپنی کتاب میں سمو دیا ہے۔ انہوں نے سفرنامہ چین کے آخر میں چین کی ممتاز شخصیتوں کے بارے میں ایک تعارف نامہ بھی دیا ہے جس سے کتاب کی افادیت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے عوامی چین کی ثقافت، تعلیم اور معاشرت پر ہی روشنی نہیں پڑتی بلکہ اس کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری چین کی قدیم وجدید تاریخ اور یہاں کی نظریاتی جدلیات اور سیاسی نظام سے واقفیت حاصل کرتا ہے اور اس عظیم ملک کے عظیم مستقبل کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے۔

مصنف کا انداز اگرچہ بیانیہ کا ہے لیکن اس میں کئی دیگر خصوصیات بھی ہیں جنہوں نے بیانیہ کو مرصع بنا دیا ہے۔ وہ جہاں جاتے ہیں جو کچھ دیکھتے ہیں اسے قلمبند کرتے وقت اس کی جزئیات اور تفصیلوں تک میں اتر جاتے ہیں اور موقع یا واقعہ کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ سیدھے سادے بیان میں ایک دو چلتے ہوئے اور زبردست کاٹ کرنے والے فقرے ڈال کر قاری کے ذہن

ڈرامائی (CUT) لگا دیتے ہیں بعض اوقات جب وہ جلسوں، ہجوموں اور پرانے محلات کی تصویر کشی کرتے ہیں تو ان کے اسلوب میں جمالیاتی قدریں تیزی سے ابھرتی ہیں اور ان کی تحریر کو متنوع اور بوقلموں بنا دیتی ہیں۔ ان کی نگارش میں رجعت یا ٹھہراؤ نہیں بلکہ مسلسل ارتقاء اور تیزی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے قاری کہیں بھی تھکن محسوس نہیں کرتا بلکہ بدلتے ہوئے واقعات، بدلتے ہوئے لینڈ اسکیپ اور بدلتے ہوئے کرداروں کے ساتھ ایک نئی زندگی اور فراغ محسوس کرتا ہے۔ مصنف جہاں اپنے (ENTOURAGE) کے ساتھیوں کا ذکر کرتے ہیں وہاں اپنی ژرف نگاہی اور بعض اوقات اپنی شوخیٔ تحریر سے انہیں شخصیتوں سے کردار بنا دیتے ہیں اور اپنی تخیل آفرینی کا مؤثر مظاہرہ کرتے ہیں۔

مصنف نے کتاب کا انتساب پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو کے نام کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان اور چین کے تعلقات اگرچہ عوامی چین کی تاسیس کے وقت سے ہی تھے لیکن ان تعلقات کو نئے ڈگر مجوشانہ مرحلوں میں داخل کرنے، دونوں ہمسایہ ملکوں کو قریب تر لانے، ان میں گہرے دو طرفہ رشتے استوار کرنے اور اہلِ پاکستان پر چین کی ارتقائی، انقلابی اور تہذیبی عظمت آشکار کرنے کا سہرا جناب ذوالفقار علی بھٹو کے سر ہے۔ پھر اس کے علاوہ اس انتساب کی وجہ یہ بھی ہے کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے وہ پہلے دانشور سیاستدان ہیں جنہوں نے قومی حالات کا تجزیہ ترقی پسندانہ اور سائنسی نقطۂ نظر سے کیا

اور پاکستان کو رجعت اور فرسودگی کے اندھیروں سے نکالنے کے لئے نہ صرف یہ کہ اندرونِ ملک تاریخ کی مخالف طاقتوں کے خلاف مورچہ بندی کی بلکہ خارجہ سطح پر رائل گورنمنٹ آف کمبوڈیا، شمالی ویت نام اور شمالی کوریا کو تسلیم کر کے پاکستان کو داخلی اور خارجی طور پر دنیا کے ترقی پسند اور سامراج دشمن ممالک کی صف میں لا کھڑا کیا۔

ظہیر کاشمیری

۹ بیڈن روڈ لاہور

ہانگ کانگ

○

چین اس لئے عظیم ملک نہیں کہ یہ پاکستان کا ہمسایہ ہے یا اس کے پاکستان کیساتھ خصوصی دوستانہ تعلقات ہیں بلکہ چین کی قدیم تاریخ، ثقافت، تہذیب اور عظمت کا دُنیا بھر میں اتنا چرچا ہے کہ دنیا بھر کے بیشتر ممالک کے ذی شعور افراد چین کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے تڑپتے ہیں اور پاکستان کے ترقی پسند نوجوانوں کے تصورات میں تو چین کا منظر رومان کی حیثیت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ خاص طور پر جب سے چین میں سوشلسٹ انقلاب آیا ہے۔ اور اسے عوامی جمہوریہ کی حیثیت حاصل ہوئی ہے یہاں کے عوام نے اپنی ترقی کی حیرت انگیز منزلیں طے کی ہیں۔ پاکستان کے شہری چین کا نظارہ کرنے کے لئے بے تاب نظر آتے ہیں اور اب جب کہ مغربی سامراجی اور سرمایہ دارانہ نظام فی الواقع دم توڑ رہا ہے، اور مغربی ممالک کے مفکرین بھی تسلیم کرنے لگے ہیں کہ عوامی جمہوریہ چین کا معاشی اور معاشرتی نظام اس صدی کے غریب اور مظلوم عوام کے مسائل کا بہترین حل ہے اور یہاں تک کہ بڑے سرمایہ دار ممالک بھی چین سے تجربات حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں اور پچھلے دو سال میں امریکہ کے دو صدر یکے بعد دیگرے بڑے تقدس کے ساتھ عوامی جمہوریہ چین کا دورہ کر چکے ہیں، اور امریکہ کے وزیر خارجہ ڈاکٹر ہنری کیسنگر تو چینی عوام کے عظیم لیڈر چیئرمین ماؤزے تنگ کے بارے میں تعریفی خیالات کا اظہار کرنے میں سب سے آگے ہیں تو پاکستان کے عوام جنہوں نے بچپن سے رسول اکرمؐ کی یہ حدیث کہ "علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین جانا پڑے" پڑھ رکھی ہے، ان کی چین سے ذہنی وابستگی فطرت کے عین مطابق ہے۔ بین الاقوامی سطح پر چین کی اہمیت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے

کہ مغربی ممالک کے ایک مفکّر جن کو زندگی میں بے شمار اعزازات ملے ہیں، جس وقت عملی زندگی سے علیحدہ ہو گئے ۔ اور جب ان سے پُوچھا گیا کہ کیا زندگی میں ان کی کوئی خواہش رہ گئی ہے تو انہوں نے جواب میں یہ کہا کہ " ہاں چین جانے کی خواہش پُوری نہیں ہو سکی "۔ اس طرح میں بھی ان سیاسی کارکنوں میں سے ہوں جو چین جیسے منصفانہ معاشی اور معاشرتی نظام پہ یقین رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میری ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ کوئی موقعہ ہاتھ لگے تو نئے چین کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں ۔ یہ اتفاق ہے کہ جب اکتوبر ۱۹۷۴ء میں وزیرِ اعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو روس کے دورے پر گئے تو میں بھی ان کے ساتھ تھا واپسی پہ وزیرِ اعظم نے مجھ سے روس کے دورے کے تاثرات پوچھے اور روس کے متعلق میرے تاثرات سن کر یہ رائے دی کہ مسٹر لنگاہ ! تمہارے جیسے آدمی کو چین کا بھی دورہ کرنا چاہیئے تاکہ روس اور چین کے نظام کا موازانہ کرنے کا موقع مِل سکے ۔ خیر بات آئی گئی ہو گئی اور جب مئی کے پہلے ہفتے میں وزارتِ خارجہ نے وائس آف امریکہ کی اس خبر کی تائید کی کہ عنقریب وزیرِ اعظم بھٹو چین کا دورہ کریں گے تو میرا بھی دل دھڑکنے لگا اور امید کی ایک کرن جاگ پڑی کہ شاید مجھے بھی اس دورہ میں ساتھ جانے کا موقعہ میسّر آ سکے میں دل ہی دِل میں انتظار کرنے لگا کہ چند دنوں کے بعد خوشی کا وہ لمحہ بھی آ گیا جب ۱۴ مئی کو وزارتِ خارجہ پاکستان کی طرف سے مجھے وزیرِ اعظم کے ساتھ شمالی کوریا اور چین جانے کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ اگرچہ وزارتِ خارجہ کے دعوت نامے کا مضحکہ خیز پہلو حسبِ دستور قائم رہا اور وہ یہ تھا کہ سابقہ " روایات کے مطابق وزارتِ خارجہ نے میرے گاؤں میں اطلاع دے دی کہ مجھے بھی وزیرِ اعظم کے ساتھ دورے پر جانا ہے مگر متعلقہ حکّام نے یہ تک گوارا نہ کیا کہ پنجاب پیپلز پارٹی کے عہدیدار کی حیثیت سے لاہور کے پتے پر مطلع کر دیا جاتے اس حالت میں یہ سلوک اور بھی حیرت انگیز تھا کہ موجودہ دورِ حکومت میں یہ میرا

چوتھا غیر ملکی دورہ تھا تعجّب کی بات ہے کہ ابھی تک وزارتِ خارجہ کے افسران کو میرے حدودِ اربعہ کا بھی مکمل پتہ نہیں چل سکا اور حسبِ سابق میرے نام کے ہجّے بھی غلط لکھے گئے تھے مجھے یقین ہے کہ دوسرے وفد کے اراکین کو بھی اسی طرح کی چھوٹی بڑی پریشانیاں پیش آئی ہونگی بہر حال دعوت نامہ ملنے کے بعد کاغذات یعنی ہیلتھ سرٹیفکیٹ، پاسپورٹ، ویزا، زرِ مبادلہ کا انتظام، وردی کا اہتمام اور دوسرے چھوٹے بڑے لمبے سفر کے انتظامات سر پر آ پڑے، میں اگرچہ پارٹی کا پرانا اور ذمہ دار عہدیدار ہوں مگر تاحال ایک یا دوسری وجہ سے پارٹی کی وردی نہیں بنوا سکا تھا۔ پچھلے دورے تو یاروں نے سادے سوٹ سے ہی بھگتا دیئے تھے مگر اس بار چین جیسے بااصول، پُروقار اور سوشلسٹ ملک کے دورے کیلئے سنجیدگی سے وردی کا اہتمام کرنا پڑ گیا۔ دن تھوڑے تھے کام زیادہ تھا، پاسپورٹ پر کوریا کا اندراج کرانے اسلام آباد جانا بھی ضروری تھا۔ چین اور کوریا کے ویزے بھی حاصل کرنا تھے۔ بڑی تیزی سے چند متعدد کام سرانجام دے کر میں ۱۵ مئی کو اسلام آباد میں وزارتِ خارجہ کے دفتر پہنچ گیا۔ یہاں پر مسٹر اقبال حسین اسسٹنٹ پراٹوکول آفیسر نے بڑی مہربانی فرمائی اور مجھے دو خطوط ایک چائنا کے سفارت خانے اور دوسرا پاسپورٹ آفس کے لیے لکھ کر دے دیئے ساتھ ہی ایک سٹاف کے ممبر کو بھی بھیجا تاکہ جلدی کام ہو سکے چائنا کے سفارت خانے میں جب صبح (میرے ساتھ ایک دو دوست بھی تھے) پہنچے تو استقبالیہ میں ایک چینی ساتھی سے ملاقات ہوئی وہ اگرچہ انگریزی زبان نہیں جانتا تھا لیکن یہ جانتے ہوئے کہ ہم وزیرِ اعظم کے وفد کے ارکان ہیں۔ ہمارا پرتپاک استقبال کیا، سگریٹ پیش کیا، چائے کا پوچھا اور اپنے متعلقہ آفیسر کو یہاں پہ بلوایا۔ آفیسر نے آکر میرا پاسپورٹ لیا اور دو ایک کاغذات پر دستخط کر دیئے اور پھر پندرہ منٹ کے اندر اندر پاسپورٹ پہ ویزا لگا کر مجھے دے دیا اس اثنا میں دیکھتے دیکھتے بہت سے

اور ساتھی جو وفد میں جا رہے تھے، یہاں پر تشریف لے آئے - میری طرح انکا بھی گرم جوشی سے استقبال کیا گیا اور تھوڑی دیر میں ان کے پاسپورٹ پر بھی ویزا لگا کر ان کو فارغ کر دیا گیا اس کے بعد ہمیں پاکستان کے پاسپورٹ کے دفتر واقع اسلام آباد جانا تھا- کیوں کہ ہمارے پاسپورٹوں پر شمالی کوریا کا اندراج کیا جانا ضروری تھا اگرچہ بعد میں معلوم ہوا کہ شمالی کوریا کے لیے ویزے کی ضرورت نہیں ہے- بہر حال ہم پاسپورٹ کے دفتر میں پہنچے تو پاسپورٹ آفیسر نے ایک تو ٹالنے کی کوشش کی کہ سوموار کو ہم دوبارہ ان کے دفتر آئیں، کیوں کہ بڑے آفیسر نہیں ہیں دوسرا انہوں نے یہ اعتراض کیا کہ پاسپورٹ پر کوریا کا اندراج کروانے کے لیے دو سو روپے کی کورٹ فیس لگانا لازمی ہے -ہم بڑے پریشان ہوئے کیونکہ دن تھوڑے تھے اور آج پندرہ مئی تھی جب کہ اٹھارہ مئی کو کراچی پہنچنا تھا اور ۱۹ مئی کو کوریا کے لیے روانہ ہونا تھا لہذا پاسپورٹ افسروں کی منت سماجت کی گئی اور انہیں احساس دلایا گیا" کہ ہم سرکاری وفد کے اراکین ہیں اس لیے کورٹ فیس کی ضرورت نہیں ہے اور پھر دوپہر کے دو بجنے والے تھے اور بنک بھی بند ہو چکے تھے اس لیے ہم کئی قسم کے خدشات میں گھرے کھڑے تھے کہ بڑے صاحب تشریف لے آئے اور انہوں نے یہ فیصلہ دے کر ہماری حوصلہ افزائی کی کہ وفد کے ارکان ہونے کی حیثیت سے ہمیں کورٹ فیس کی ضرورت نہیں ہے - اس طرح خدا خدا کر کے ہماری مشکل حل ہوئی

سولہ مئی کو میں واپس لاہور آ گیا، سترہ اور اٹھارہ کے دن دوسری ضروریات کی فراہمی میں گزر گئے اور اٹھارہ مئی کو سہ پہر تین بجکر بیس منٹ پر پی آئی اے کی پرواز سے کراچی جانے کے لیے میں گھر سے چند دوستوں کے ہمراہ چل پڑا ایسے موقعوں پر بے شمار دوست ہوائی اڈے پر آنے کے لیے اصرار

کرتے ہیں، لیکن میں نے کوشش کی کہ دوستوں کو تکلیف نہ دیجائے تاہم اس کے باوجود کافی دوست الوداع کہنے کے لیے ہوائی اڈہ پر پہنچ گئے۔ ان دوستوں میں مسٹر جاذب سہیل، مسٹر الطاف علی کھوکھر، مسٹر غلام صفدر، اسد اللہ خان نثار بھٹی اور دوسرے متعدد ساتھیوں کے نام قابلِ ذکر ہیں تین بجکر ۲۰ منٹ پر پی آئی اے کا طیارہ فضا میں ایک گمبھیر آواز کے ساتھ بلند ہوا جب طیارہ مہیب فضا کا سینہ چیرتے ہوئے کراچی کی جانب محوِ پرواز تھا تو میرے خیالات عوامی جمہوریہ کوریا اور عوامی جمہوریہ چین کے خوشگوار تصوّرات سے مہکے ہوئے تھے طیّارہ میں وفد کے اراکین میں سے کچھ لوگ موجود تھے، لیکن چونکہ میرا ذہن کوریا اور چین کے دورے کی بُنت میں الجھا ہوا تھا اس لیے طیارہ میں کسی کے ساتھ بات چیت نہ ہو سکی اس کی ایک وجہ اور بھی تھی وہ یہ کہ وزیرِاعظم پاکستان کا دورہ بہت اہمیت رکھتا تھا۔ کوریا میں پاکستان کی حکومت کے پہلے سربراہ تشریف لے جا رہے تھے اور ہم نے کوریا کے عوام کی جدّوجہد آزادی، ترقی، جرائت اور بہادری کے ڈھیر سارے مضامین پڑھ رکھے تھے اور چین میں حال ہی میں قیادت کی تبدیلیوں کی وجہ سے بین الاقوامی سطح پر یہ واقعات موضوعِ بحث بنے ہوئے تھے اوران واقعات پر نظر ڈالنا انتہائی اہمیت طلب اور معروضی حالات کے تحت ضروری تھا

ہمارا طیارہ پانچ بجکر چالیس منٹ پر کراچی کے ایئرپورٹ پر اُترا۔ میں سامان لینے کے لئے استقبالیہ میں انتظار کرنے لگا یہاں پر ایک دوست مسٹر اعجاز حسین بٹالوی بارِ ایٹ لا سے ملاقات ہوگئی اور انکے استفسار پر جب میں نے کہا کہ میں وزیرِ اعظم کے ساتھ چین جا رہا ہوں تو انہوں نے گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور ایک ہی لمحہ میں بے شمار سوالات کر ڈالے۔ میں نے

انہیں مطمئن کیا کہ واپسی پر ان کے سوالات کے تفصیلاً جوابات دوں گا۔ میرے اس اختصار پر انہوں نے اپنے ۱۹۶۴ء کے دورے کا ذکر شروع کر دیا۔ جب وہ ادیبوں کے ایک وفد کے ساتھ چین تشریف لے گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے دو ایک گلے شکوے بھی کیے تھے۔ ایک تو یہ کہ غالباً اب ان کے لیے ایسا ممکن نہ ہو گا کہ وہ کسی بھی حیثیت میں چین کا دورہ کر سکیں، دوسرا انہوں نے پیپلز پارٹی کے دو ساتھیوں کا ذکر کیا جو اس وقت اعلیٰ عہدوں پہ فائز ہیں۔ انہوں نے کہا "میں ان کا بیحد احترام کرتا ہوں مگر افسوس ہے کہ یہ دوست بھی عوام سے کٹ گئے ہیں بلکہ لوگ ان کے عمل پہ بھی انگلیاں اٹھانے لگے ہیں۔ اعلیٰ منصب کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں تاہم آپ کی جماعت کو اپنی صفوں میں تبدیلیاں لانی چاہئیں ورنہ چین کا دورہ بے معنی ثابت ہو گا"

اگرچہ میں نے اسلام آباد میں سفارت خانہ کے افسران سے درخواست کی تھی کہ کراچی جیسے اجنبی شہر میں ہماری ٹرانسپورٹ اور رہائش کا انتظام کیا جائے مگر یہاں پر کسی نے ہماری بات نہ پوچھی اور مسٹر اعجاز بٹالوی کی وساطت سے میں نے میٹروپول ہوٹل تک گاڑی میں لفٹ لی اور ہوٹل میٹروپول میں پہنچنے پہ پتہ چلا کہ یہاں پر کوئی کمرہ خالی نہیں کیونکہ یہ درمیانہ اور اوسط درجے کا ہوٹل ہے اور ہر وقت اس کے کمرے بک رہتے ہیں تاہم سستے سے سستا کمرہ دو سو ساٹھ روپے روزانہ پر مل رہا تھا۔ چنانچہ میں نے کسی دوسرے ہوٹل کی تلاش کی راہ لی۔ دو تین ہوٹلوں میں چکر لگانے کے بعد پتہ چلا کہ صرف ہوٹل مہران میں کمرہ مل سکتا ہے مسٹر اعجاز بٹالوی جو کہ خوش قسمتی سے پاکستان کے مایہ ناز کلب جمخانہ کے ممبر ہیں، بڑے آرام سے ہوٹل میٹروپول کے پہلو میں واقع سندھ کلب میں چلے گئے جہاں پر ان کا پہلے سے کمرہ بک تھا اگرچہ مجھے حیرت ہوئی کہ بٹالوی صاحب نے اپنی ادبی

اور بیرسٹری کی روایات کے برعکس مجھے اپنے کلب میں مدعو نہیں کیا۔ اب میں نے کراچی کے نئے نویلے ہوٹل مہران کی طرف رخ کیا، تا کہ رات گزاری جا سکے۔ تقریباً شام کے سات بجے کے قریب ہوٹل میں کمرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس ہوٹل میں وزارت خارجہ کی طرف سے اخباری نمائندوں اور وفد کے دوسرے ارکان کے ٹھہرانے کا اہتمام کیا جا چکا تھا، لیکن یہ بات میرے علم میں نہ تھی۔ ہوٹل مہران انٹرکان کی طرز پر بنایا گیا ہے اور غالباً کراچی کی کسی معروف شخصیت کی ملکیت ہے انتہائی تجسّس کے باوجود بھی میں ہوٹل کے اصل مالک کا کھوج نہ لگا سکا تاہم دو سو روپے یومیہ پر سنگل کمرہ نمبر ۳۲۴ مجھے الاٹ ہو گیا۔ اگرچہ یہ کمرہ نہایت خوبصورت طریقے سے آراستہ تھا اور حسب دستور فیشن کے طور پر سنگل کمرے میں بھی ایک کی بجائے دو نہایت آرام دہ بستر موجود تھے مگر کراچی جیسے بڑے شہر میں اتنے حسین کمرے میں آدمی تنہائی کے علاوہ اور کیا محسوس کر سکتا ہے چنانچہ میں نے ٹیلیفون اپریٹر سے رابطہ قائم کیا اور ڈائریکٹری کے اوراق الٹنے شروع کیے تا کہ کسی پرانے دوست کا نمبر تلاش کیا جا سکے اور اس کے ساتھ شام گزاری جا سکے پرانے دوستوں میں سے کرنل یزدانی صاحب ہوا کرتے تھے جو ہمیشہ کراچی ہوائی اڈہ پر مجھے لینے آتے اور اکثر و بیشتر اپنے یہاں ٹھہرانے کا بھی اصرار کیا کرتے تھے مگر اس مرتبہ معلوم ہوا کہ وہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں، ہمارے دوسرے پیارے دوست نجیب اللہ خان بار ایٹ لاء تھے۔ ان کا بھی سراغ نہ مل سکا۔ پارٹی میں سے کمال اظفر صاحب کی تلاش بھی سعیٔ لاحاصل ثابت ہوئی کراچی کے سب سے بڑے فیشن ایبل ریسٹ ہاؤس میں وفد کے دوسرے سینئر اراکین جن میں شیخ محمد رشید بھی شامل تھے میں نے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی پتہ چلا کہ وہ گھومنے پھرنے گئے ہوئے ہیں، دوستوں کی تلاش کی مہم

جاری رکھی گئی اور رات کے ۸ بجے کے قریب ڈاکٹر امیر محمد صاحب میرے ہتھے چڑھ گئے۔ ابھی تک وہ کلینک میں بیٹھے مکھی پہ مکھی مار رہے تھے۔ میں نے جب اصرار کیا کہ فوراً ہوٹل میں چلے آئیں تو انہوں نے گڑگڑانا شروع کر دیا کہ ۹ بجے رات تک انہیں معاف کر دیا جائے انہوں نے اس وعدہ کے ساتھ یہ مہلت مانگی کہ پھر وہ رات میرے ساتھ گزاریں گے

اتنا وقت گزارنے کے لئے میں نے سوچا کوئی اچھی کتاب خرید لی جائے۔ یہ فیصلہ کر کے میں ہوٹل کے استقبالیہ میں آیا یہاں پر واقع بکسٹال پہ نظر دوڑائی تاکہ چین کے موضوع پر کوئی کتاب مل سکے۔ توقع تو بہت کم تھی اتنے بڑے بکسٹال پہ سکیسی ناولوں کے علاوہ کسی سنجیدہ کتاب کا ہونا غیر ممکن تھا مگر اتفاق سے چین پہ ایک نہایت دلچسپ کتاب مل گئی۔ اسکا نام "چین کا جاری انقلاب" تھا اسکے مصنفین کے نام" جان مائر ڈال اور گن کیسل" تھے۔ یہ مصنفین سویڈن کے شہری ہیں اور انہوں نے اس سے پہلے بھی ایک کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے "چائنا کے گاؤں سے ایک رپورٹ" یہ دونوں کتابیں سویڈن کی زبان میں لکھی گئیں اور ان کا ترجمہ آل برائٹن آسٹن نے کیا ہے اور پنگ آن آسٹریلیا نے طبع کی ہے دونوں مصنفین میاں بیوی ہیں اور کافی عرصہ چین کے دیہاتوں میں گزار چکے ہیں۔ اس کتاب کی قیمت چونکہ بیس روپے تھی اس لیے فوراً خریدنے کی جرأت نہ ہوئی اور میں ہوٹل کے باہر گھومنے کے لیے چلا گیا ہوٹل میٹروپول کی پچھلی جانب ایک چھوٹے سے ریستوران میں کھانا کھایا اور واپس پیدل ہوٹل مہران میں آگیا، کیونکہ ۹ بجے ڈاکٹر امیر محمد صاحب کو آنا تھا۔ لابی میں بک سٹال پہ میں نے "چین کا جاری انقلاب" نامی کتاب خرید ہی ڈالی۔ میں ابھی کمرے میں پہنچا تھا کہ ڈاکٹر امیر محمد صاحب اپنے دو صحافی

دوستوں کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ پیپلز پارٹی کی تنظیم نو اور اہم انتظامی امور پر بات چیت ہوتی رہی انہوں نے مجھے بتایا کہ کراچی میں مصنّفین نے ان کی صدارت میں ایک قرار داد پاس کی ہے جس میں وزیر اعظم پاکستان مسٹر بھٹو کو کمال اتاترک کے بعد "غازی" کا لقب دیا گیا ہے انہوں نے مجھے قرار داد کی چھپی ہوئی کاپیاں دیں۔ تاکہ میں دورے کے دوران تقسیم کر دوں۔

رات گئے تک باتیں ہوئیں یہ لوگ چلے گئے تو میں اپنا سامان باندھنے میں جُت گیا اور دل ہی دل میں چین اور کوریا کے بارے میں سوچنے لگا کہ یہ جنت نشان وادیاں کیسی ہونگی؟ کہ احساسِ ذمہ داری نے مجھے چونکا دیا کیونکہ صبح کم از کم تین گھنٹے پہلے اپنا سامان بک کروانا تھا۔ یعنی سات بجے صبح سامان ہوائی اڈہ پر پہنچانا تھا اس پریشانی کی وجہ سے دو سو روپے والے اس کمرہ میں نیند تو کیا آنی تھی سامان بک کروانے کی فکر میں پانچ بجے علی الصبح ہی میں اٹھ کھڑا ہوا اور نہانے دھونے کے بعد سامان کو سمیٹ کر جب ساڑھے چھ بجے کے قریب ہوٹل کے ملازمین کو میں نے ٹیکسی منگوانے کے لیے کہا تو اچانک ڈاکٹر امیر محمد کا فون آیا کہ میں تمہیں جہاز پر سوار کروانے کے لیے آرہا ہوں۔ میری مشکل کافی حد تک حل ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب سات بجے کے قریب پہنچ گئے۔ جب ہم دونوں ہوٹل کی لابی میں پہنچے تو یہاں پر مسٹر ایچ کے برکی اور دوسرے صحافی کھڑے تھے۔ ہم علیک سلیک کے بعد آگے بڑھ گئے اور سوا سات بجے کے قریب ہوائی اڈے پر پہنچ گئے۔ وزارتِ خارجہ نے جو خصوصی ہدایات جاری کی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ سب سے پہلے وفد کے ہر رکن کو اپنا سامان کسٹم سے چیک کروانا تھا چنانچہ میں نے اپنے سوٹ کیس کا منہ کھول کر کسٹم کے افسر کے سامنے رکھ دیا۔ میرے سوٹ کیس میں کپڑوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھا پھر بھی کسٹم کے افسر

نے میرے سوٹ کیس اور بیگ کا کونہ کونہ چھان مارا۔ مجھے یقین ہے کہ معروف سمگلروں کو ایسے امتحان سے گزرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہو گی۔ ہاں تو جب میں اپنا سامان چیک کروا رہا تھا تو میرے پہلو میں ایک منگم سا شخص بھی سامان چیک کروا رہا تھا یہ آدمی ایتھوپیا کے مرحوم شہنشاہ ہیل سلاسی کا بیٹا یا پوتا لگتا تھا۔ اس کی داڑھی، مونچھیں، بشرٹ کی کاٹ، پتلون کی مہری، سر پر پادٔ کیپ، جوتوں کی شکل وصورت، الٹا سیدھا سگریٹ پینے کا انداز، ہاتھ میں ڈاکٹر مبشر کی تازہ ترین تصنیف "شاہراہِ انقلاب" اور انشورنس کے ایجنٹ سے ملتا جلتا بریف کیس، یہ سب کچھ دیکھ کر میری ہنسی دبائے نہیں دبتی تھی اور میں کافی محظوظ ہو رہا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ صاحب موصوف مسٹر محمد بخش مجاہد صدر قصبہ اوستو محمد ضلع نصیر آباد بلوچستان ہیں اور وفد کے رکن کی حیثیت سے وزیرِاعظم کے وفد کے ساتھ جا رہے ہیں۔ مجھے ۱۱ دن کے دورے کے دوران مجاہد صاحب کے ساتھ اکثر وقت گزارنا پڑا اور جو بذاتِ خود ایک دلچسپ داستان ہے جسے آگے چل کر بیان کیا جائے گا
کسٹم کے افسران سے خلاصی پا کر میری پی آئی اے ورکرز یونین کے صدر مسٹر فرحت رضوی سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے چھوٹتے ہی پی آئی کے حالیہ ریفرنڈم کے سلسلہ میں جو واقعات پیش آئے تھے ان کی تفصیل سنائی۔ لگے ہاتھوں ایک بڑی فائل جس میں ان کے مطالبات اور ان برطرف شدہ مزدور لیڈروں کی درخواستیں تھیں جو ٹریڈ یونین سرگرمیوں کے سلسلہ میں معطل کر دیئے گئے تھے، میرے حوالے کر دی اور کہا کہ میں دورہ کے دوران یہ گزارشات وزیرِاعظم صاحب تک پہنچا دوں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہوائی اڈہ پہ وزیرِاعظم کے استقبال کے انتظامات ان کی یونین نے کیے ہیں اور یہ کہ ان کے کارکن پیپلز پارٹی کے

بنیادی اراکین میں سے ہیں۔ ان کے مطابق پی آئی اے اس وقت سخت بحران سے گزر رہی ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کے جتنے لیڈر ہیں اتنے پی آئی اے کے دھڑے ہیں۔ گفتگو جاری تھی کہ "الفتح" کے شہرت یافتہ راؤ ارشاد صاحب تشریف لے آئے۔ فرحت رضوی صاحب ان سے گلہ کرنے لگ پڑے کہ الفتح کی رپورٹ میں مجھ سے گولی چلانے کا منسوب واقعہ انتہائی غیر ذمہ دارانہ بات تھی۔ راؤ صاحب نے معذرت کا اظہار کیا اتنے میں ہمارے دیرینہ دوست چاکر علی جنجو صدر پیپلز پارٹی ضلع لاڑکانہ آگئے۔ جنجو صاحب وفد کے رکن تو نہیں تھے۔ لیکن پارٹی کی یونیفارم پہنے ہوئے دوسرے وفد کے اراکین کو الوداع کہنے آئے تھے میں نے ان کے ساتھ سوڈان اور سعودی عرب کا نہایت دلچسپ بارہ دن کا دورہ کیا تھا چنانچہ جھٹ سے چاکر علی صاحب نے اس دورے کے تمام واقعات کو پوری تفصیلات کے ساتھ دہرایا۔

سوڈان سے واپسی کے بعد چاکر علی صاحب دو دفعہ اقوام متحدہ کے وفد کے ساتھ امریکہ یاترا بھی کر آئے تھے۔ میں نے ان سے گلہ کیا کہ آپ نے حسب وعدہ "صاحب" کو یہ نہیں کہا تھا کہ اقوام متحدہ میں مجھے بھی ساتھ لے جائیں انہوں نے جوابی گلہ کیا کہ میں نے "صاحب" سے ان کی چین جانے کی سفارش نہیں کی۔ خیر بات یہیں ختم ہو گئی۔ وہ کسی اور موضوع کی طرف رجوع کرنے والے تھے کہ لاڑکانہ کی ایک اور معروف ہستی بیگم اشرف عباسی تشریف لائیں انہوں نے آتے ہی سب سے پہلے مشفقانہ انداز میں پنجاب کے ان کارکنوں کے نام پوچھے جن کے ساتھ وہ متعدد ضلعوں میں دورے کر چکی ہیں خاص طور پر جن کارکنوں کے ساتھ انہوں نے حلقہ نمبر ۶ کے انتخابات

میں نہایت تندہی سے کام کیا تھا۔ میں بیگم صاحبہ کی بہت قدر کرتا ہوں جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک سال میں انہوں نے پنجاب کے دور دراز علاقوں میں مزدوروں، کسانوں، طالب علموں اور خواتین کے اتنے جلسے منعقد کیے ہیں کہ پیپلز پارٹی پنجاب کے صدر اور سیکرٹری جنرل دونوں نے مل کر بھی نہیں کیے ہوں گے۔ بیگم صاحبہ نے مجھ سے شکایت کی کہ جن علاقوں میں وہ تشریف لے گئی ہیں وہاں پر ممبرانِ اسمبلی نے کوئی کام نہیں کیا اور نہ عوام سے ان کا رابطہ ہے۔ میں نے مؤدبانہ عرض کی کہ یہ خصوصیت اکثر ممبرانِ اسمبلی کی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے مجھ سے گلہ کیا کہ میں پیپلز پارٹی کے لیے اتنا کام نہیں کرتا ہوں جتنا کرنا چاہیے، جب میں نے ان سے اپنی "داستانِ غم" اور دکھ درد کا ذکر کیا تو انہوں نے موضوع بدلتے ہوئے مجھے چین کے دورے پر جانے کی مبارکباد دی اور کہا قائدِ عوام تم پر آجکل بڑے مہربان نظر آتے ہیں۔ میں نے وضاحتاً کہا کہ ایسی کونسی بات ہے وہ ہمیشہ سے مہربان رہے ہیں بیگم صاحبہ ہمارے وفد کی رکن نہیں تھیں۔ ہم خوش گپیوں میں لگے ہوتے تھے کہ اسی اثناء میں وفد کے اہم ترین اراکین بھی ایئرپورٹ کی لائونج میں داخل ہونے شروع ہوئے سب سے پہلے ہماری ملاقات ناصر علی رضوی صاحب سے ہوئی۔ انہوں نے آتے ہی شکوہ کیا کہ "صاحب کراچی کے اخبارات نے کل شام یہ خبر شائع کر دی ہے کہ ڈاکٹر مبشر کو سیکرٹری جنرل کے عہدہ سے ہٹا کر یہ عہدہ مجھ ناچیز کو سونپا جا رہا ہے" ہم نے ان سے کہا کہ بھئی آپ ڈپٹی سیکرٹری جنرل ہیں۔ اور مناسب حالات میں سیکرٹری جنرل بھی بن سکتے ہیں مگر انہوں نے فلسفیانہ انداز میں فیصلہ کیا کہ رجعت پسند پریس نے پارٹی میں پھوٹ ڈالنے کے لیے یہ خبر شائع کی ہے یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس

روز ہوائی اڈہ پر وزیرِ اعلیٰ سندھ مسٹر غلام مصطفےٰ جتوئی نے وزیرِ اعظم صاحب کی طرف سے ایک تردیدی بیان میں کہا کہ ڈاکٹر مبشّر حسن کو سیکرٹری جنرل شپ کے عہدہ سے ہٹانے کی خبر غلط ہے، اس کے باوجود لاؤنج میں مبصّرین کھُسر پھُسر کرتے ہوئے سُنے گئے۔ کہ انگریزی کے محاورہ "جہاں دھواں ہو وہاں آگ جل رہی ہوتی ہے" کے مصداق کوئی بات ضرور ہوگی۔ ہم نے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔ شاید ابھی کچھ لوگ اس افواہ کی بغل میں بیساکھیاں دیتے کہ پی آئی اے کی انتظامیہ نے اعلان کیا کہ وزیرِ اعظم تشریف لانے والے ہیں اور وفد کے تمام اراکین جہاز میں سوار ہوجائیں اور اپنی اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ ہم نے باتوں کی خوشبو وہیں چھوڑی، پی آئی اے کا خصوصی طیارہ جس پر جگہ جگہ وی وی آئی پی تحریر تھا۔ سوار ہوگئے۔ جب میں بیتابی سے اپنی نشست ڈھونڈ رہا تھا تو معلوم ہوا کہ میرے پہلو میں جناب محمد بخش مجاہد صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ مجھے گیارہ اے نشست الاٹ تھی اور گیارہ بی پر مجاہد صاحب براجمان تھے اور گیارہ سی پر کراچی کے مسٹر امان اللہ خٹک بیٹھے ہوئے تھے۔ ساڑھے نو بجے کے قریب وزیرِ اعظم استقبالیہ کی لائن میں تشریف لائے اور یہاں پر موجود تمام معززین سے ہاتھ ملایا۔ ان کے ساتھ وزیرِ اعلیٰ سندھ مسٹر غلام مصطفےٰ جتوئی، وزیرِ اعلیٰ پنجاب مسٹر صادق حسین قریشی بھی تھے اس کے علاوہ چونکہ گزشتہ روز قومی اقتصادی کونسل کا اجلاس ہوا تھا۔ اسلیے دوسرے وفاقی وزراء کے علاوہ وفاقی وزیرِ خزانہ اور وزیرِ داخلہ بھی ایئرپورٹ پر موجود تھے اور سندھ کے صوبائی وزراء، ایم این اے، ایم پی اے، سینیٹر اور پارٹی کے اعلیٰ اراکین بھی وزیرِ اعظم کو الوداع کہنے آئے ہوئے تھے۔ جہاز میں سوار ہونے کے بعد جو سرکاری فہرست اراکینِ وفد کی مہیا کی گئی اِس

کے مطابق وزیرِ اعظم کے ساتھ مندرجہ ذیل حضرات سفر کر رہے تھے۔

بیگم نصرت بھٹو، مسٹر عزیز احمد، شیخ محمد رشید، عبدالحفیظ پیرزادہ، بیگم سعدیہ پیرزادہ، سید ناصر علی رضوی، ڈاکٹر عبدالخالق، مسٹر عبدالوحید کٹپر مسٹر عبدالرزاق، مسٹر عنایت الرحمٰن خان عباسی ایم این اے، بیگم زاہدہ سلطانہ، ایم این اے، ملک مظفر خان ایم این اے، تیمور شاہ جوگےزئی ایم پی اے، مسٹر عنایت اللہ گنڈا پور ایم پی اے، مسٹر نصر اللہ خان سنجرانی ایم پی اے، مسٹر محمد حنیف نارو ایم پی اے، مسٹر محمد بخش مجاہد، مسٹر محمد غلام رضا، مسٹر منیر محمد سیٹھڑ، مسٹر صغیر حسین جعفری۔ ان کے علاوہ اعلیٰ حکام اور وزیرِ اعظم کے ذاتی عملے کے افسران، پریس، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے نمائندگان اور پی آئی اے کا عملہ اس طرح وفد کے اراکین کی مجموعی تعداد بیکصد کے لگ بھگ تھی، ان میں بعض دوست سوشلسٹ ممالک سے تجربات حاصل کرنے جا رہے تھے جب کہ کچھ کا مقصد سیاحت کہا جا سکتا ہے۔

معیاری سروس

سربراہانِ مملکت کے دورے اکثر ہوتے رہتے ہیں مگر وزیرِ اعظم کے اس تاریخی دورے کی تفصیلات کے ساتھ قارئین کرام کو جہاز کے سفر کا خاکہ یقیناً پسند آئے گا۔ جیسا کہ ہم سب پاکستانی جانتے ہیں پی آئی اے، پاکستان کا مایہ ناز ادارہ ہے اور اس کی تمام بین الاقوامی پروازیں نہایت اعلیٰ اور معیاری ہوتی ہیں۔ مجھے کم و بیش آدھ درجن سے زیادہ مختلف ہوائی کمپنیوں کے ذریعہ سفر کرنے کا موقعہ ملا ہے مگر یہ بات فخر سے کہی جا سکتی ہے کہ ہماری ہوائی سروس بین الاقوامی معیار کی اعلیٰ ترین توقعات پر پوری اترتی

ہے چند دوست اندرونِ ملک سروس کا گلا کرتے ہیں اور خاص طور پہ ترقی پذیر علاقے یعنی ملتان، لائل پور، حیدر آباد، سکھر، لاڑکانہ، اور کوئٹہ وغیرہ کی سروس کی شکایات سننے میں آتی ہیں جن میں زیادہ تر یہ شکایت ہوتی ہے کہ پی آئی اے کے فرینڈشپ فوکر جہاز بہت ہی تکلیف دِہ ہیں۔ ان حضرات کو شاید یہ علم نہیں ہے کہ دوسرے ممالک میں اُس سطح کی سروس کا معیار پاکستان کے مقابلے میں چنداں بلند و بالا نہیں ہے" اور یہ اس سے واضح ہے جب ہمارے کوریا میں موجودگی کے دوران وفد کے اراکین کو پیانگ یانگ سے ہم ہانگ لوکل ہوائی سروس کے ذریعے جانا پڑا۔ میں نے اس پرواز میں سفر نہیں کیا مگر جب میں ایئر مارشل ذوالفقار علی سے فوکر فرینڈشپ کا گلہ کرنے لگا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ اگر میں نے ہم ہانگ کا سفر کیا ہوتا تو فوکر فرینڈشپ کی قدر کرنے لگ جاتا اس سے یقیناً ظاہر ہوتا ہے کہ پی آئی اے ایک اعلیٰ ہوائی سروس ہے اور وزیرِ اعظم کے وفد کا طیارہ ہماری سروس کا بہترین نمونہ ہے

اس طیارہ میں کپتان کی سیٹ کے پیچھے فسٹ کلاس کے مسافروں کی نشستیں تھیں جن پہ وفد کے وزراء اراکین تشریف رکھتے تھے انہیں سیٹوں پر ایک طرف وزیرِ اعظم اور بیگم بھٹو کی خصوصی نشستیں تھیں ان نشستوں کے بعد تقریباً تین نشستوں کی قطار کی جگہ دونوں طرف دو بستر آراستہ تھے تاکہ وزیرِ اعظم اور بیگم بھٹو دورانِ سفر آرام کر سکیں اس کے پچھلی طرف کی نشستیں وزیرِ اعظم کے پرسنل سٹاف یعنی ملٹری سیکرٹری اور اے ڈی سی کے لیے مخصوص تھیں۔ درمیان میں پردہ لٹکایا گیا تھا اس کے بعد دوسرے درجے کے مسافروں کی نشستیں تھیں ان نشستوں پر سب سے پہلے باقی ماندہ سینئر اراکینِ وفد، جن میں

صوبائی وزیر، وفاقی سیکرٹری ، ایم این اے ، ایم پی اے ، پارٹی کے دوسرے عہدے دار اور باقی ماندہ وزارت خارجہ کے افسران اور دوسرے اعلیٰ عہدیدار بیٹھے تھے۔ اس کے بعد پریس ، ریڈیو ، ٹیلی ویژن فوٹو گرافر حضرات کی نشستیں تھیں۔ ان کے ساتھ ہی وزیر اعظم کی سیکورٹی کا عملہ پی آئی اے کی سیکورٹی کے افراد اور پی آئی اے کے سٹاف کے اراکین اپنی اپنی نشستیں سنبھالے بیٹھے تھے۔ پی آئی اے کے اس خصوصی بوئنگ جہاز میں ڈیڑھ سو کے قریب نشستیں تھیں۔ وزیر اعظم کے ایسے دوروں پر پی آئی اے کے چیف ایئر مارشل نور خان بھی ساتھ ہوتے ہیں۔ اب کی مرتبہ سرکاری فہرست میں ان کا نام تو نہیں تھا لیکن وہ ہمارے ساتھ سفر کر رہے تھے۔

ان کے علاوہ پی آئی اے کے تین یا چار سینئر مہمان نواز حضرات بھی شامل تھے۔ جہاز میں تین ایئر ہوسٹسیں تھیں ان میں ایک کا نام مس شاہین انور تھا۔ پی آئی اے سٹاف کے تمام اراکین اعلیٰ تربیت یافتہ اور باصلاحیت لوگ ہیں۔ طیارہ میں کافی خوراک ، مشروبات ، پھل ، پینے کا پانی ، اور دوسری ضروریات ، وافر مقدار میں موجود تھیں ،

ہانگ کانگ کورونگی

۱۹ مئی ۱۹۷۶ء

۹ بجکر ۴۵ منٹ پر طیارے کے کپتان نے وزیر اعظم، بیگم بھٹو اور وفد کے دوسرے اراکین کو خوش آمدید کہا اور طیارے کی پرواز کے آغاز کا اعلان کیا۔ تھوڑی دیر میں طیارہ کراچی کے ہوائی اڈے سے دوڑتا ہوا فضا میں بلند ہو گیا۔ کھڑکی سے کراچی کی خوبصورت عمارتیں اور سمندر کا دلکش نظارہ دیکھا جاسکتا تھا۔ چند منٹ میں بوئنگ طیارہ کئی ہزار فٹ کی بلندی پر اڑنے لگا، بوئنگ طیارہ کئی ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر سکتا ہے۔ اور اس کی رفتار چھ سات سو میل فی گھنٹہ ہے۔

طیارے میں بیٹھنے کے فوراً بعد روایات کے مطابق پی آئی اے کی انتظامیہ کی طرف سے وفد کے اراکین کو سفر کی ضروریات کے چند تحائف دیئے گئے۔ میرے حصہ میں ربر کے باتھ روم کے سلیپر اور سفر کے دوران شیو کرنے کا سامان جس میں سیفٹی، بلیڈ، چھوٹا سا ٹوتھ پیسٹ، شیونگ کریم، آفٹر شیو لوشن اور دوسری چھوٹی چھوٹی ضروریات کی چیزیں آئیں۔ تحائف تقسیم کرنے کے بعد پی آئی اے کی ہوسٹسوں نے پینے کے لیے مشروبات پیش کیے۔ پڑھنے کے لیے اخبارات اور رسائل بھی وافر تعداد میں مہیا کیے گئے تاکہ مسافر حضرات خود کو مصروف رکھ سکیں۔ ابھی ہم نے ورق گردانی شروع کی ہی تھی کہ ہمارے سامنے مرغ کی ٹانگوں

اور بھنی ہوئی سبزی کا ناشتہ آگیا۔ ابھی ہم ہاتھ منہ صاف کر کے اپنی نشستوں پر بیٹھے ہی تھے کہ ایئر ہوسٹس صاحبہ نے دوپہر کا کھانا لگانے کے لیے چیزیں لانی شروع کر دیں۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو ابھی بارہ بجے تھے۔ ہمیں بڑا تعجب ہوا کہ اتنی جلدی دوپہر کا کھانا کیوں لگایا جا رہا ہے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ پاکستان کے وقت کے مطابق ہمارا طیارہ چار بجے ہانگ کانگ پہنچے گا، جب کہ یہاں مقامی وقت کے مطابق رات کے آٹھ بج چکے ہوں گے، چونکہ پاکستان اور ہانگ کانگ کے وقت میں چار گھنٹے کا فرق ہے۔ اس لیے دوپہر کا کھانا پہلے دیا جا رہا ہے تاکہ ہانگ کانگ پہنچ کر مناسب وقت پر رات کا کھانا کھایا جا سکے۔ پی آئی اے کے پُر تکلف کھانے میں بھنی ہوئی سبزی، مرغ، پلاؤ اور تکے شامل تھے۔ کھانے کے بعد سیب، کیلے، سنگترے پیش کیے گئے اس کے بعد چائے اور کافی بھی دی گئی۔ اس سارے وقت میں ہمیں مصروف رکھا گیا تاکہ سفر خوشگوار طریقے سے گزر سکے۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے اپنی نشست سے اٹھ کر طیارے کے دوسرے جن ساتھیوں سے گپ شپ لگائی۔ ان میں عارف نظامی (نوائے وقت) اور "الفتح" کے ارشاد راؤ، راجہ محمد انور، مسٹر عبدالوحید کٹپر قابلِ ذکر ہیں، ہمارے گیارہ دن کے دورے کے دوران محمد بخش مجاہد کے علاوہ سب سے زیادہ زندہ دلی کا مظاہرہ جناب عبدالوحید کٹپر سینیئر وزیر صوبہ سندھ نے کیا۔ سفر کے دوران ہم جلد ہی مجاہد صاحب سے خاصے بے تکلف ہو گئے تھے ویسے بھی مجاہد صاحب باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے کھانے اور پینے کی "مناسب کارکردگی" کے بعد ہوسٹس سے پوچھا کہ نماز کہاں ادا

کی جا سکتی ہے ۔ انہوں نے طیارے کے پچھلے حصے کی طرف اشارہ کیا کہ پی آئی اے کے کپتان کی طرف سے یہ اعلان گونجا کہ ”حضرات ہم تھوڑی دیر میں ہانگ کانگ کے عالمی ہوائی اڈہ پر لینڈ کرنے والے ہیں“۔ پاکستان سے ہانگ کانگ کا سفر چھ گھنٹے کا ہے۔

یہ سنتے ہی میں نے تجسس کے ساتھ جہاز کی کھڑکی سے نیچے کی طرف دیکھا مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے چند ہوائی جہاز ہمارے طیارے کے پہلو میں پرواز کر رہے ہیں۔ غور کرنے پر پتہ چلا کہ یہ ہوائی جہاز نہیں بلکہ وہ موٹر لانچیں ہیں جو نیچے سمندر میں پھر رہی ہیں ، اب ہمارا ہوائی جہاز ہانگ کانگ کے ہوائی اڈہ پر اترا۔ یہ ہوائی اڈہ سطح سمندر پر بنایا گیا ہے اور انسانی محنت اور فن کا خوبصورت شہکار ہے جب اڈہ پر جہاز اترنے لگتا ہے تو یہ انتہائی دلکش منظر میں ڈھل جاتا ہے ہمارا طیارہ خصوصی انتظامات کے تحت پبلک گیلری سے دو میل دور کھڑا ہوا اس طرح استقبال کے لیے آنے والے ہزاروں پاکستانیوں کو ہم قریب سے نہ مل سکے۔ یہ بتانا تو یاد ہی نہ رہا کہ جب کراچی سے پرواز کے بعد ہمارا طیارہ ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوا اور شہر کلکتہ کے اوپر سے ہوتا ہوا فرخا بیراج پر سے گزرا ۔ معاً ہم نے کھڑکی سے نیچے دیکھا تو لاکھوں عوام کا ہجوم نظر آیا۔ یہ وہ ہجوم تھا جو پچھلے دنوں مولانا عبدالحمید خان بھاشانی کی اپیل پر فرخا بیراج کی طرف مارچ کرتے ہوئے جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر ہمیں اپنے حقوق حاصل کرنے کی ہر وہ جنگ یاد آ گئی، جو دنیا کے مختلف خطوں میں دلیرانہ انداز میں لڑی گئی۔ طیارہ چین کی سرحد میں داخل ہوا اور شہر شنگھائی کو پیچھے چھوڑتا ہوا ہانگ کانگ پہنچ گیا۔ جب ہمارا طیارہ ہندوستان کے اوپر سے گزر رہا تھا تو روایت کے مطابق پاکستان

کے وزیر اعظم نے ہوائی جہاز سے وائرلیس کے ذریعے ہندوستان کی وزیر اعظم کو خیر سگالی کا پیغام بھیجا۔ دونوں پیغامات میں پاک و ہند کے باہمی تعاون، دونوں ملکوں کے عوام کی ترقی اور خوشحالی کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا گیا۔ اچھا تو ہم ہانگ کانگ کے ہوائی اڈہ کا ذکر کر رہے تھے ۔ طیارہ رکنے کے بعد سب سے پہلے فرسٹ کلاس کی کھڑکی کے پاس سیڑھی لگی وزیر اعظم نیچے اترے تو پاکستان کے کونسل جنرل نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا ان کے بعد وفد کے دوسرے ارکان کا استقبال کیا گیا۔ اس موقعہ پر ہانگ کانگ کی حکومت کا نمائندہ بھی تھا۔ جہاز کے ساتھ ساتھ وفد کی کاریں کھڑی تھیں، سب سے پہلی کار جو غالباً برطانیہ کی معروف کار "بینٹ لے" کا پرانا ماڈل تھا اس میں وزیر اعظم اور بیگم بھٹو سوار ہوئے، دوسری کار میں مسٹر عزیز احمد، تیسری میں شیخ رشید، علی الترتیب دوسرے حضرات بھی اپنی کاروں میں سوار ہو گئے۔ میری کار کا نمبر ۲۲ تھا اور میرے ساتھ ڈاکٹر کرنل محبوب احمد ذاتی معالج وزیر اعظم سوار ہوئے، ہمارا استقبال کرنے والے پاکستانی خاصی تعداد میں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے رنگ برنگے جھنڈے اور بینر بھی اٹھا رکھے تھے۔

رات ہو چکی تھی اور ہوائی اڈہ خوبصورت روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ ان روشنیوں میں ہم دور دراز تک استقبال کرنے والوں کو باآسانی دیکھ سکتے تھے۔ نہایت سہانا سماں تھا۔ وزیر اعظم صاحب اور دوسرے سینیئر اراکین کی کاریں تھوڑی دیر میں ہوائی اڈہ کی حدود سے باہر نکل گئیں، لیکن مجھے اور کچھ دوسرے اراکین کو اپنی گاڑیاں تلاش کرنے میں کافی دقّت ہوئی ہماری یہ مشکل ہوائی اڈہ پر موجود چاک و چوبند اور سڈول جسم والی تیز طرار خوبصورت خواتین نے حل کی جو غالباً ایئر ہوسٹس تھیں اور وفد کے اراکین

کو اپنی کاروں تک چھوڑنے میں مدد دے رہی تھیں وہ ہمیں کاروں تک چھوڑ آئیں۔ ہانگ کانگ چونکہ ۹۰ فیصد چینی نسل کی آبادی پر مشتمل ہے اس لیے میرا یہ تصور تھا کہ چینی لڑکیاں چھوٹے چھوٹے قد والی اور منحنی سی شخصیت کی مالک ہوں گی۔ مگر جب ہوائی اڈہ پر لمبی لمبی، تراشیدہ خطوط اور منی سکرٹ والی ان لڑکیوں کو دیکھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی اور میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو گیا کہ آخر یہ چینیوں سے اتنی مختلف کیوں ہیں؟ ٹوہ لگانے پر معلوم ہوا کہ ایک تو ہانگ کانگ کے رہنے والے چینی اپنی بے پناہ خوشحالی اور جدید دور کی زیبائش کی سہولتوں کی وجہ سے کافی لمبے قد، خوبصورت شکل اور صحت مند نسل کا روپ دھار چکے ہیں، دوسرا ہانگ کانگ کی آبادی کچھ ایسا ملغوبہ بن چکی ہے کہ کسی مخصوص نسل کی تمیز مشکل ہو گئی ہے۔ یہاں پر ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں پاکستانی، ہندوستانی، جاپانی، انگریز اور کئی دوسری نسلیں آباد ہونے کی وجہ سے کافی زیادہ نسلی تبدیلی ہو چکی ہے، مبصرین کی رائے میں اس نئی ملغوبہ نسل کی پیدائش میں جائز اور ناجائز دونوں عوامل شامل ہیں۔ میں اس ادھیڑ بن میں مصروف تھا کہ نوجوان خاتون نے میرے الٹے سیدھے خیالات کا تسلسل توڑتے ہوئے مجھے اپنی کار کے پاس لا کر کھڑا کر دیا کرنل صاحب پہلے ہی کار کی سیٹ پر تشریف فرما تھے۔ چونکہ ہمارا تعارف نہیں تھا۔ لہذا کافی دیر تک کار کے اندر سناٹا رہا۔ آخر کار میں نے جمود توڑا اور ان سے اپنا تعارف کرایا۔ پھر کرنل صاحب نے بھی اپنا تعارف کرا دیا اور ہماری دوستی کی رسمی ابتدا ہو گئی۔ بعد میں تمام دورے کے دوران تقریباً ہر ضیافت پر جہاں میرے ایک طرف محمد بخش مجاہد صاحب ہوا کرتے تھے تو دوسری طرف کرنل محبوب صاحب ہوتے تھے۔ اب ہماری کاروں کا قافلہ آہستہ آہستہ شہر

کی جانب روانہ ہوا۔ ہوائی اڈہ ہانگ کانگ کے اس حصہ میں واقع ہے جس کو "کالون" کہتے ہیں اور یہ مرکزی شہر سے کافی دور ہے واضح رہے کہ ہانگ کانگ کے دو حصّے ہیں ایک کو "کالون" کہتے ہیں جب کہ دوسرے کو نیا ہانگ کانگ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ دونوں حصّے دو میل سمندر کے ٹکڑے کے دونوں طرف واقع ہیں۔ ہماری گاڑیوں کا قافلہ آدھ گھنٹے میں ہوائی اڈہ سے ہماری منزلِ مقصود ہوٹل "مینڈرین" پہنچا۔ راستے میں ہانگ کانگ شہر کی پچاس اور پچپن منزلوں والی عمارتیں یوں کھڑی تھیں جیسے دیو قامت پہاڑ کھڑے ہوں۔ یہ منزلیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ شہر کی سڑکیں اور چوراہے خوبصورتی سے سجے ہوئے تھے۔ مگر ایک طرف دور دور تک سمندر میں چھوٹی چھوٹی روشنیاں تھیں

یہ روشنیاں ہانگ کانگ شہر کی خوبصورتی اور عظمت کے ساتھ ساتھ اِس کا تاریک پہلو بھی واضح کرتی ہیں، وہ یہ کہ اتنے ہشّاش بشّاش شہر میں پچاس ہزار کے قریب ایسے خاندان آباد ہیں جو چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سمندر میں رہنے پر مجبور ہیں یہ لوگ زیادہ تر ماہی گیری کے پیشہ سے تعلق رکھتے ہیں مگر اس کے ساتھ بے شمار سمگلر، ڈاکو، قاتل اور غنڈے بھی ان کشتیوں کو پناہ گاہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ سفر کے دوران ہمارا قافلہ ایک دم سُرنگ کے اُس حصّے میں داخل ہوا جو سمندر میں "کالون" اور ہانگ کانگ کے دوسرے حِصّے کو مِلانے کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہ سُرنگ صرف دو سال پہلے بنی ہے اس سے قبل دونوں حصّے سمندری کشتی کے ذریعے ملے ہوتے تھے۔ اور تمام لوگ ان بڑی کشتیوں کے ذریعے اپنا سامان اور گاڑیاں منتقل کرتے اور ایک طرف سے دوسری طرف جایا کرتے تھے مگر یہ سُرنگ بننے کے بعد دونوں حصّے مِلا دیئے گئے ہیں اور کافی سہولت ہو گئی ہے اِس دو میل لمبی سُرنگ کو دیکھ کر مجھے کافی حیرت ہوئی۔ کیوں کہ سمندر میں سُرنگ

بنانا بہت مشکل کام ہے۔ برطانیہ اور فرانس ایک دوسرے کو ۱۶ میل لمبی سُرنگ کے ذریعے مِلانے کے لیے گزشتہ ۲ سال سے منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ مگر اس کی ابھی ابتدا ابھی نہیں ہو پائی جب کہ ہانگ کانگ کی سُرنگ بنا کر ایک عظیم و تاریخی کارنامہ سر انجام دیا جا چکا ہے۔ یہ سرنگ اس طرح بنائی گئی ہے کہ سمندر کی تہ میں کئی فٹ نیچے پانی کے اندر لوہے کی چادریں اور شہتیر بچھا دیئے گئے ہیں اور سیمنٹ سے یہ بڑا منصوبہ مکمل کیا گیا ہے سرنگ کے اندر دو طرفہ ٹریفک کے لیے بڑی وسیع سڑک بنائی گئی ہے جسمیں تین گاڑیاں ایک طرف اور تین دوسری طرف آ جا سکتی ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ سڑک تقریباً ۴۰ فٹ چوڑی ہوگی سرنگ کے اندر بجلی اور دوسری جدید سہولتیں بھی موجود ہیں۔ ہم سرنگ کو پار کرتے ہوئے اپنے ہوٹل تک پہنچے۔ کاروں سے باہر نکل کر استقبالیہ میں گئے اور ہوائی جہاز سے اُترتے ہی ہمیں جن کمروں کے نمبر مہیا کیے گئے تھے۔ استقبالیہ سے ہم نے ان کمروں کی چابیاں لیں ہمارے ہوٹل کا نام جیسے اوپر کہا گیا ہے ہوٹل مینڈرین تھا اور یہ ہوٹل معیار اور خوبصورتی کے لحاظ سے ہانگ کانگ میں نمبر ایک ہے اور دنیا کے بہترین ہوٹلوں کے معیار کے مطابق دوسرے نمبر پر ہے۔ دنیا میں سب سے نمبر ایک نیویارک کا ہوٹل "وارڈوف آسٹوریا" ہے۔ مینڈرین کی ۲۴ منزلیں ہیں اور مجھے ۲۳ ویں منزل پر کمرہ نمبر ۲ الاٹ تھا۔ وزیرِ اعظم، وزراء اور دوسرے سینئر ارکان ۲۱ ویں منزل پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ وفد کے دوسرے اراکین میں سے کچھ ۲۲ ویں منزل پر تھے۔

پریس اور وفد کے کچھ اور اراکین ایک اور ہوٹل میں ٹھہرائے گئے تھے۔ جب میں اپنے کمرے میں پہنچا تو یہاں پر سٹاف کے ایک آدمی نے مجھے ضروری ہدایات مہیا کیں، ہوٹل کے کمرے نہایت شاندار طریقے سے آراستہ تھے۔

یہ کمرے ہمارے پاکستان کے ہوٹل انٹرکان سے کہیں زیادہ معیاری تھے۔ میرے کمرے کی کھڑکی شہر کے فیشن ایبل علاقے کی طرف کھلتی تھی اور کھڑکی سے شہر کی بڑی بڑی خوبصورت روشنیاں، سمندر کی جھلک اور ہزاروں کی تعداد میں کشتی نما جھونپڑیاں جن میں معمولی سی روشنی ہو رہی تھی کو میں بڑی محویت سے دیکھ رہا تھا۔ کھڑکی سے تقریباً کئی سو گز کے فاصلے پر کشتیوں کا ایک خوبصورت سا روشنی کا ہالہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے علاوہ اور بےشمار منظر دل کو گدگدا رہے تھے ہانگ کانگ کے جس علاقے میں ہمارا ہوٹل تھا۔ یہ ویسٹ انڈ یعنی شہر کا مرکزی اور فیشن ایبل ترین علاقہ تھا۔ یہ شہر پہاڑیوں کے اوپر بنا ہوا ہے بعض عمارتیں تو بالکل ایسے بنی ہوئی ہیں جیسے پہاڑی کی چوٹی کا ڈھلوان ہو اور ان عمارتوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے جیسے کسی آندھی کے جھونکے کے ساتھ یہ عمارتیں ابھی گر جائیں گی۔ مگر ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ بلند قامت عمارتیں بہت مضبوط ہیں میرے کمرے کے ساتھ والا کمرہ کرنل محبوب صاحب کا تھا اس سے اگلا کمرہ حنیف نارو ایم پی اے کا تھا۔ چونکہ ہمارے سوٹ کیس ابھی ہوائی اڈہ سے نہیں پہنچے تھے اور ہم پارٹی یونیفارم ہی میں تھے اس لیے ہم کو وقت کاٹنے میں کافی دقت ہوئی میں نے حنیف نارو کے علاوہ دو ایک دوستوں کو فون کیے تاکہ گپ شپ لگا سکیں۔ ناصر علی رضوی صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ ۹ بجے تک مجھے فون کریں گے۔ اور ہم ساتھ مل کر شہر کے دوسرے علاقوں کی سیر کرنے جائیں گے۔ میں اور حنیف نارو رات ۱۱ بجے تک انتظار کرتے رہے مگر ناصر صاحب کا کوئی اتہ پتہ نہ چل سکا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وزیر اعظم صاحب نے وزراء حضرات کو کھانا دیا تھا۔ ناصر صاحب وہاں چلے گئے تھے۔ ہم چائے اور مشروب سے انتظار کا غم غلط کرتے رہے۔ رات ۱۱ بجے کے بعد ۲۴ ویں منزل پر جب ہم کھانا کھانے گئے تو ناصر صاحب سے ملاقات ہو گئی ہ

ریستوران میں ہلکا پھلکا میوزک بج رہا تھا اور برطانیہ کی معروف مغنیہ مس سوڈرلینڈ خود گانا سنا رہی تھی۔ اس مغنیہ کا نام کافی سنا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد مس سوڈرلینڈ چلی گئی۔ اس کے بعد ہانگ کانگ کے چینی دوستوں نے بے ہنگم بینڈ اور گانے کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ ہم خاصے بور ہو رہے تھے کہ ناصر صاحب سے مڈھ بھیڑ ہو گئی انہوں نے ملتے ہی اپنی وعدہ خلافی کی وجوہات بتائیں۔ اس کی تلافی کے لیے انہوں نے اپنے کمرے میں مشروبات کی دعوت دی ہم گئے تو دعوت کے ساتھ ہلکا پھلکا میوزک بھی سنایا۔

سگریٹ اور سگار پیش کیے۔ ابھی ہم ریستوران ہی میں بیٹھے تھے کہ ہمارے مشن کے مسٹر اظفر بھی تشریف لے آئے انہوں نے چھوٹتے ہی خرید و فروخت کرنے کے آداب پہ ایک لیکچر جھاڑ دیا۔ اگرچہ ابھی پاکستان کے وقت کے مطابق رات کے دس ہی بجے تھے لیکن ہانگ کانگ کے دو بج چکے تھے۔ ہم اڑھائی بجے تک گپیں ہانکتے رہے اور بعد میں اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لیے چلے گئے۔

۲۰ر مئی ۱۹۷۶ء

گزشتہ شب چونکہ ہم ہانگ کانگ کے وقت کے مطابق ۲ ½ بجے سوئے تھے اس لیے صبح دیر سے اٹھے ویسے بھی معلوم ہوا کہ ہانگ کانگ کے لوگ صبح دیر سے اٹھتے ہیں اور کاروبار بھی دس بجے دن کے قریب شروع کرتے ہیں اس کی غالباً ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لوگ شام تک سخت محنت سے کام کرتے ہیں اور رات کو بے شمار لوگ مل کر ڈانس ہال، ریستوران اور دوسری تفریح گاہوں میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں اور صبح دیر سے بیدار ہونے کے عادی ہیں۔ لیکن ہمارے لیے ایک اور مسئلہ بھی تھا وہ یہ کہ ہوٹل کی انتظامیہ کو ناشتہ کیلئے صبح چھ بجے سے پہلے آرڈر دینا پڑتا ہے اور آٹھ بجے تک بمشکل ناشتہ تیار ہوتا

ہے۔ناشتہ تیار ہوا تو ہم بھی آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔

نو بجے کے قریب میں، حنیف نارو صاحب کے کمرے میں گیا اور شہر میں گھومنے پھرنے کا پروگرام بنایا سفارتخانہ کے عملہ نے ہمیں یہ کہا تھا کہ جو گاڑیاں رات کو ہمیں چھوڑنے آئی تھیں وہ ہماری تحویل میں رہیں گی۔ مگر ہانگ کانگ کے چور ٹیکسی ڈرائیور، ہمیں ہوٹل میں اتار کر گم ہو گئے۔اور رات کو بھی تلاش کرنے کے باوجود دستیاب نہ ہو سکے۔ہم ہوٹل سے نیچے آئے اور ہوٹل کی انتظامیہ سے سواری منگوانے کی درخواست کی۔ ایک گھنٹے کے شدید انتظار کرنے کے باوجود ہمیں کار میسّر نہ آسکی۔معلوم ہوا کہ ٹیکسی ڈرائیور دانستہ کاریں وقت پر نہیں لا رہے ہیں۔جب کہ ہماری حکومت نے ان کو ہانگ کانگ میں قیام کے دوران کا مکمل کرایہ دے دیا تھا اور وہ مستقل ہمارے ساتھ رہنے کے پابند تھے۔جب کافی انتظار کے بعد ہم اپنے کمروں کو واپس جا رہے تھے تو ہوٹل کی لابی میں چند پاکستانیوں سے ملاقات ہو گئی ان میں سے ایک صاحب کا نام مسٹر حبیب احمد تھا وہ حنیف نارو صاحب سے ملنے کیلئے آئے تھے یہ صاحب کسی بنک میں "وارڈن" کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور ہانگ کانگ کی ہاکی ٹیم کے کپتان تھے۔ہم نے ان سے شہر میں گھومنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے ترغیب دی کہ کار کی بجائے پیدل چلنا مناسب ہو گا۔یاروں نے لنگوٹ کسا اور شہر کے فیشن ایبل ایریا کی طرف پیدل چل پڑے۔ کئی ایک بڑے خریداری کے مرکزوں سے گزرتے ہوئے ہانگ کانگ کے مرکزی ڈاکخانہ میں پہنچ گئے۔جہاں سے ہم نے پاکستان میں دوستوں کو خط لکھنے کے لیے ڈاک کے لفافے خریدے۔ تھوڑے سے آگے بڑھے تو ایک کتابوں

کی دکان پر نظر پڑی جس پر ہانگ کانگ کے خوبصورت مناظر والے پوسٹ کارڈوں کے علاوہ فحش رسائل و جرائد کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ان رسالوں میں مشہورِ زمانہ رسالہ "پلے بوائے" یعنی عیاش مردوں کا کھلونا اور "پلے گرل" یعنی عیاش عورتوں کا کھلونا بھی بک رہے تھے اور من چلے اس کی اجتماعی خریداری کر رہے تھے۔ "پلے بوائے" میں عیاش ترین عورتوں اور "پلے گرل" میں ایسے ہی مردوں کی ننگی تصاویر تھیں۔ اس جنسی آوارگی کا سیلاب پاکستان میں ہانگ کانگ کی فحش منڈی سے داخل ہوتا ہے ان جرائد کو ایک پرکشش عورت بڑی بے تکلّفی سے بیچ رہی تھی۔ میں اور حنیف نارو وہاں کھڑے تھے کہ ایک پاکستانی کے منہ سے بھی رال ٹپک پڑی اور اس نے جھجکتے شرماتے ہوئے ایک عدد "پلے بوائے" خرید کر اپنے کپڑوں میں چھپا لیا۔ غالباً اس پاکستانی دوست نے اپنے فلیٹ میں جا کر اپنے تنہائی کے لمحوں کو گرم کیا ہوگا۔ ہم اس کی حالتِ زار پر صرف ترس ہی کھا سکتے ہیں۔ کیوں کہ ہانگ کانگ جیسے دل لبھانے والے شہر میں تصویروں کی ضرورت کسی دیوانے کو ہی ہو سکتی ہے۔ بہر حال ہم تو خرید و فروخت کرنے کے لیے نکلے تھے۔ جیب صاحب کے ساتھ مختلف دکانوں میں چیزوں کے بھاؤ دریافت کرتے ہوئے ایک چھ منزلہ سٹور میں داخل ہو گئے۔ ہم ریڈی میڈ قمیصوں کی تلاش میں تھے۔ نچلی منزل پر چونکہ عورتوں کے میک اپ کا سامان تھا اس لیے ہمیں چوتھی منزل پر جانا پڑا جہاں قمیضیں فروخت ہو رہی تھیں۔ میں اور نارو صاحب نے یہاں سے عالمی شہرت پانے والی "ایرو ڈسٹرٹ" خریدی جو ستر (۷۰) روپے میں ملی۔ اس سٹور پر خوبصورت نوجوان چینی لڑکیاں چیزیں بیچ رہی تھیں۔ تقریباً ہر لڑکی شستہ انگریزی بول سکتی تھی اور اپنے گاہکوں کا دل بہلانے کے کاروباری حربوں سے پوری طرح واقف تھی۔ اتّفاق سے ہمارے پاس ہانگ کانگ کے

ڈالر نہیں تھے امریکی ڈالر تھے اس سٹور پر یہ کم قیمت پر بک رہے تھے۔ ہم امریکی ڈالروں کو ہانگ کانگ کے ڈالروں میں تبدیل کروانے کے لیے جب ساتھ ہی ایک بنک میں گئے تو بنک کے دروازے پہ متعدد پنجابی نوجوانوں نے ہمارا استقبال کیا۔ یہ دوست بھی اس بنک میں وارڈر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے انکا لیڈر جس کا نام یاد نہیں ہے ہم سے مِل کر بہت خوش ہوا اور اُس نے کہا کہ وہ تین سو پاکستانی وارڈرز کا صدر رہا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ہانگ کانگ میں بہت بڑے ڈاکے پڑتے ہیں اور دن دیہاڑے بنک اور بڑے بڑے کاروباری مراکز لوٹ لیے جاتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ کئی مرتبہ ہم نے ڈاکوؤں کا بڑی جرأت مندی اور بہادری سے مقابلہ کیا ہے اور انسانی جانیں بچائی ہیں یہی وجہ ہے کہ یہاں کے تجارتی اور مالیاتی مراکز میں پنجابی نوجوانوں کو وارڈر کی حیثیت سے جھٹ ملازمت مِل جاتی ہے اور ان کو معقول تنخواہ ملتی ہے۔ ہمارے اس ساتھی کو پاکستانی سکّے کے مطابق چار ہزار روپے ماہوار مِل رہے ہیں۔

اس علاقے میں ڈاکہ زنی کی وارداتوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ پچھلے دنوں ان کے بنک میں چھٹے دن ہانگ کانگ کی تاریخ میں سب سے بڑا ڈاکہ پڑا اور ڈاکو کوئی تیس لاکھ ہانگ کانگ کے ڈالر یعنی ۶۰ لاکھ پاکستانی روپے لوٹ کر لے گئے انہوں نے گولیوں کی بارش میں بھی ڈاکوؤں کا تعاقب کیا مگر وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی طرح چوری، ڈاکے، قتل اور دوسرے سنگین جرائم میں ہانگ کانگ سرمایہ دارانہ معاشرہ کی ننگی تصویر ہے۔

ہاں تو جب ڈالر تبدیل کرانے کے لیے بنک کے عملہ کو دیئے تو ہمیں یاد آیا کہ ہم اپنے پاسپورٹ ہوٹل میں بھول آئے ہیں۔ ان کے بغیر ڈالروں کی تبدیلی ناممکن تھی ہم بہت گھبرائے تو ہمارے اس پاکستانی وارڈر دوست نے

اپنی ذاتی ذمہ داری پر ہمارے ڈالر کیش کروا دیئے اور ہم نے شرٹون کا بل ادا کیا اس کے بعد ہم حبیب صاحب کے مشورے پر ہانگ کانگ میں واقع نسبتاً ارزاں چائنا کے سٹور پر چلے گئے یہاں چین کے متعدد سٹورز ہیں جو عوامی جمہوریہ چین کی طرف سے کھولے گئے ہیں۔ ان پر اشیاء دوسرے سٹوروں کے مقابلے میں نسبتاً" کم قیمتوں میں فروخت ہوتی ہیں۔ سٹور پر موجود تمام اشیاء اعلیٰ معیار کی تھیں اور تعجب ہے کہ ایسے سٹورز کے ہوتے ہوئے دوسرے سٹور کیسے چل رہے ہیں۔ اصل میں سرمایہ دارانہ نظام کا یہ خاصا ہے کہ لوگ" اونچی دکان پھیکا پکوان" کے مصداق مختلف سٹورز پر خرید و فروخت کرتے ہیں۔ ہم نے چائنا کے سٹور سے تیس روپے کے حساب سے دو شرٹیں خریدیں۔ یہ قیمت دوسرے سٹورز کے مقابلے میں آدھی تھی۔ ویسے تو سٹور پر ہر قسم کی ضروریاتِ زندگی کی چیزیں موجود تھیں۔ مگر کپڑا اور کپڑے سے تیار شدہ مال کافی اچھا اور سستا تھا قمیضوں کے علاوہ ہم نے بچوں کے بہت سے کپڑے خریدے جو نہایت ارزاں تھے۔ کچھ دوستوں نے خواتین کے ریڈی میڈ کپڑے بھی خریدے۔ ہم پھرتے پھراتے کافی تھک گئے تھے اور اب جلد ہی واپس ہوٹل میں آنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ وزیرِ اعظم صاحب کے ملٹری سیکرٹری نے مجھے پیغام دیا کہ میں فوراً ہوٹل پہنچ جاؤں کیوں کہ اے ڈی سی صاحب مجھ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں جلدی سے ہوٹل میں پہنچا۔ اے ڈی سی صاحب سے رابطہ قائم کیا تو پتہ چلا کہ بھٹو صاحب نے یاد کیا تھا۔ اور یہ حکم ملا ہے کہ پانچ بجے ہانگ کانگ میں پاکستانی شہریوں کا اجتماع منعقد ہونے والا ہے۔ میں اور ناصر رضوی وزیرِ اعظم صاحب کے آنے تک عوام سے خطاب کریں۔ ابھی چونکہ صرف ساڑھے تین بجے تھے۔ ہم نے سوچا ابھی کچھ اور گھوم پھر لیں ہمیں معلوم ہوا کہ یہاں ہندوستانی

دکان بھی ہے جہاں اچھی ساڑھیاں بکتی ہیں۔ ہم اس دکان پر چلے گئے وہاں فرانسیسی ساخت کی پرنٹ والی ساڑھیاں تین ساڑھے تین سو ہانگ کانگ ڈالر یعنی چھ سات سو روپے میں فروخت ہو رہی تھیں اس کے علاوہ بھی بہت سستی اور معیاری ساڑھیاں دستیاب تھیں۔ دکان میں داخل ہوتے ہی ہندوستانی مالک نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں خریداری پر مائل کرنے کے لیے وفد کے ان اراکین کے نام اور پتے دکھائے جو بیشمار ساڑھیاں خرید کر جا چکے تھے ان میں سے ایک خاتون نے بہت ساڑھیاں خریدی تھیں۔ بعد میں یہ خاتون شہر کے دوسرے حصوں میں بیشمار وگیں بھی خریدتی ہوئی دیکھی گئیں۔ ہم نے بھی ایک نظر میں جائزہ لیا کہ ہانگ کانگ میں بڑی اچھی اور سستی خواتین کی وگیں بک رہی تھیں خوش قسمتی سے ہمارے دوستوں میں کوئی مکمل گنجا نہیں تھا ورنہ ہمیں بھی مصیبت پڑ جاتی۔ گشت کے دوران حنیف نارو صاحب کو اچانک احساس ہوا کہ ان کی وردی پر غلط رنگ کی پٹی لگی ہوئی ہے اب پٹی بدلوانے کے لیے کسی درزی کی تلاش کو نکلے، درزی تو نہ مل سکا البتہ ایک دکان سے سرخ کپڑا خرید لیا اور ہوٹل میں واپس آکر کافی دیر تک نارو صاحب عورتوں کی طرح گھٹنوں میں کپڑا دبائے سرخ پٹی لگاتے رہے۔

ٹانکے لگاتے وقت کئی مرتبہ ان کے ہاتھ کی پوروں میں سوئی چبھی اور وہ دبی سی ہائے کر کے رہ جاتے۔ میں یہ منظر دیکھ کر قہقہے لگاتا رہا۔ نارو صاحب پٹی لگانے میں تو کامیاب ہو گئے۔ مگر یہ پٹی اتنی بھدی لگی، کہ ہمارے دورے کے دوران طنز و مزاح کا موضوع بنی رہی یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ وفد میں شامل تمام ممبرانِ قومی اسمبلی اور پارٹی کے عہدہ داروں کو ہوائی اڈہ پر استقبال اور ضیافت کے مواقع پر وردیاں پہننی پڑتی ہیں۔ ان وردیوں کے رنگ علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں

جن سے بآسانی ان کے عہدوں کی پہچان ہو جاتی ہے ، وزیر اعظم صاحب کی سنہری، وزرا صاحب کی نیلی، ممبران اسمبلی کی سرخ اور پارٹی کے عہدیداروں کی گلے کی پٹیوں کا رنگ سبز ہوتا ہے۔ اتفاق ہے کہ وفد کے ارکان کی پٹیاں عجیب بے تکی تھیں کئی احباب نے بالکل غلط پٹیاں لگائی ہوئی تھیں۔ جن میں ایک حنیف نارو بھی تھے ، انہوں نے پارٹی پرالوٹوکول کی ڈانٹ ڈپٹ سے بچنے کے لیے رات گئے تک اپنی سبز پٹی کو سرخ میں تبدیل کرنے کے لیے کافی سوزن کاری کی یہ الگ بات ہے کہ اسکے بعد بھی وہ نیم سرخ ہی رہی۔

میں پانچ بجے کے قریب ہوٹل کی دوسری منزل پر جا پہنچا۔ ایک بہت بڑے ہال میں کرسیاں بچھائی ہوئی تھیں اور کوئی ایک ہزار کے قریب پاکستانی شہری جمع تھے۔ مجھ سے پہلے ناصر رضوی صاحب کے علاوہ اور دوسرے دوست آچکے تھے اور حاضرین کو مصروف رکھنے کیلئے سب سے پہلے ناصر رضوی صاحب نے تقریر کی ، جس میں انہوں نے ۲۰ منٹ تک پیپلز پارٹی کے چار اصولوں یعنی اسلام ہمارا دین ہے۔ جمہوریت ہماری سیاست ہے ، سوشلزم ہماری معیشت ہے۔ اور طاقت کا اصل سرچشمہ عوام ہیں۔ کی وضاحت کی۔ ان کے بعد مجھے خطاب کرنے کی دعوت دی گئی میں نے ہانگ کانگ کے شہریوں کو دعوت فکر دی کہ وہ وہاں پر پارٹی کا یونٹ قائم کریں میں نے اپنی تقریر میں پیپلز پارٹی کے کارہائے نمایاں پر روشنی ڈالتے ہوئے خاص طور پر سرداری نظام کے خاتمے ، مالیہ کی معافی ، مزدوروں ، کسانوں کو مراعات کی فراہمی اور خارجہ پالیسی کا تفصیل سے جائزہ لیا اور پاکستان میں حزب اختلاف کے منفی کردار اور رجعت پسند جماعتوں کے عوام دشمن کردار کو بے نقاب کیا

میں نے پاکستان کے چین کے ساتھ خصوصی تعلقات اور پاکستان کے وزیر اعظم کے عوامی جمہوریہ کوریا میں لمبے دورے کے پس منظر پر بھی روشنی ڈالی وزیر اعظم صاحب کو آنے میں دیر ہو گئی اس لیے مجھے اپنی تقریر کو مزید کھینچنا پڑ گیا اور پاکستان کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی رشتوں اور حالات تک پھیلا دیا پڑا ابھی دولت خطابت کا زور دکھا رہے تھے کہ وزیر اعظم صاحب تشریف لے آئے۔ ہوٹل کا ہال نعروں اور تالیوں کے اودھم سے گونج اٹھا، چند منٹ تک وزیر اعظم صاحب کو تالیوں سے خراج تحسین پیش کیا گیا۔ ہال میں پاکستان کی نیوز ایجنسیوں کے علاوہ غیر ملکی اخباروں اور ریڈیو کے نمائندے پاکستان اور ہانگ کانگ کے ٹیلی ویژن کیمرے کافی تعداد میں ساز و سامان کے ساتھ موجود تھے، میں نے تقریر ختم کرنا چاہی، مگر وزیر اعظم صاحب نے تقریر جاری رکھنے کے لیے کہا۔ میں نے ملکی حالات کا جائزہ لینے کے بعد پیپلز پارٹی کے مزید کارہائے نمایاں پر روشنی ڈالی میرے بعد وزیر اعظم صاحب تقریر کے لیے اٹھے تو انہوں نے سب سے پہلے یہ کہا کہ چونکہ میں ملک سے باہر ہوں لہٰذا صرف خارجہ پالیسی پر بات کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ ملکی پالیسیوں پر میرے دوست ناصر رضوی اور تاج محمد لنگاہ کافی کچھ کہہ چکے ہیں اس لیے خارجہ معاملات پر بات کرنا بہتر رہے گا۔ جناب بھٹو صاحب نے اپنے دورۂ عوامی جمہوریہ کوریا اور عوامی جمہوریہ چین کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ انہوں نے پاکستان کے ہندوستان کے ساتھ تعلقات کی بحالی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے تعلقات کی بحالی اصولوں کے ساتھ ہو گی اور کسی صورت میں بھی کشمیری عوام کے حقوق کا سودا نہیں کیا جائے گا، وزیر اعظم صاحب نے پاکستان کی ایٹمی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان جنوب مشرقی ایشیا کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک علاقہ قرار دینے کا پُر زور مطالبہ کرتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ پاکستان

ایٹم بم بنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔
مگر پاکستان کے پاس بجلی کے وسائل محدود ہیں اس لیے ایٹم سے بجلی تیار کرنے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے اور اس سائنسی دور میں پاکستانی سائنسدانوں کو بھی نیوکلیئر فزکس پڑھنے اور ریسرچ کرنے کا حق حاصل ہے۔ ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے خلاف بین الاقوامی معاہدوں کا ذکر کرتے ہوئے بھٹو صاحب نے کہا کہ جب ایٹم بم بنانا اتنا ہی غلط بات ہے تو پھر ایک ملک نے کیوں بنایا تھا اسی طرح دوسرے تیسرے چوتھے اور پانچویں ملک نے کیوں بنایا تھا انہوں نے کہا دراصل ہماری سمجھ میں اب آیا ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں پر پابندی کے معاہدہ میں پابندی کا اطلاق "کالے ممالک" اور "پیلی قوموں" پر ہے جب کہ سفید قوموں پر ایٹمی یا دوسرے ہتھیاروں کی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ اس کے بعد انہوں نے بین الاقوامی اقتصادی تعلقات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ حالیہ پیرس اور نیروبی کی کانفرنسیں ناکام ہو گئی ہیں اور ترقی پذیر ممالک کا تحفظ کرنے کے لیے اقتصادی نظام کو عملی شکل دینے کے لیے بین الاقوامی برادری بری طرح ناکام ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا صرف خالی خولی باتیں زیادہ عرصہ نہیں چل سکتیں وقت کا تقاضا ہے کہ تیسری دنیا کے غریب ممالک یعنی ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ علیحدہ اپنی کانفرنس بلائیں۔ جن میں نئے، اقتصادی نظام کے بارے میں عملی طور پر اقدامات کا فیصلہ کیا جائے۔ اس بات کو آگے چل کر وزیر اعظم نے کوریا اور چین میں اپنے قیام کے دوران تقریبات میں دہرایا۔ کوریا کے دورے کے اختتام پر مشترکہ اعلامیہ میں دونوں ممالک کے سربراہوں نے اس تجویز پر اتفاق کیا اور دوسرے ممالک کو دعوت فکر دی کہ اس کانفرنس کے انعقاد کے بارے میں سنجیدگی سے سوچیں۔ وزیر اعظم نے اپنے آنے والے افغانستان کے دورے کے بارے میں بھی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ پاکستانی مرحوم شہریوں کو قومی اتحاد اور یکجہتی کا پیغام دیا۔ وزیر اعظم کی تقریر تقریباً آدھ گھنٹہ جاری رہی اپنی سیٹ پر بیٹھتے

وقت بھٹو صاحب نے کہا کہ میرے دو ساتھیوں نے تو اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ شیخ رشید چاہیں تو سامعین سے خطاب کریں۔ شیخ صاحب یہاں موجود نہیں تھے اس لیے بھٹو صاحب نے پیرزادہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "ہاں ہمارے داشوک کمار بھی بیٹھے ہیں، اگر وہ کچھ کہنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں" اس پر ایک زوردار قہقہہ گونجا، پیرزادہ صاحب نے کچھ کہنے سے گریز کیا تو جلسہ برخاست ہو گیا وزیراعظم چلے گئے دیگر حضرات کو چائے کی دعوت کے لیے بلا لیا گیا، اس موقعہ پر مقامی راہنماؤں نے ہمیں اپنے مسائل پیش کیے جن میں سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ہانگ کانگ کی پولیس پاکستانیوں کو تنگ کرتی ہے اور معمولی بات پر شہر بدر کر دیتی ہے ایک پاکستانی مسٹر ملک نے بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے انھوں نے پیپلز پارٹی کا دفتر کھولنے کی کوشش کی تو پولیس اس کے گھر آئی اور اسے کسی قسم کی سیاسی سرگرمی میں حصہ لینے سے منع کر دیا۔ پاکستانی دوستوں نے مطالبہ کیا کہ وزارت خارجہ کو ہانگ کانگ کی حکومت سے ہمیں اجازت لے کے دینی چاہیے کہ ہم پاکستان پیپلز پارٹی کا یہاں دفتر کھول سکیں یہ امر تعجب انگیز ہے کہ دنیا میں جمہوریت کا ٹھیکیدار برطانیہ اپنی ایک کالونی میں جمہوریت کا اسقدر گلا دبائے ہوئے ہے کہ وہاں پر شہریوں کو کسی قسم کی سیاسی آزادی دینے کو تیار نہیں۔ پاکستانی شہریوں نے اس کے علاوہ اور بھی بیشمار سفاکانہ اور ظالمانہ واقعات کا ذکر کیا جو کہ ہانگ کانگ کا معمول ہیں۔ ہانگ کانگ تو ایک طرف، آجکل برطانیہ جو کچھ شمالی آئرلینڈ اور اسکاٹ لینڈ میں کر رہا ہے، وہ سب ساری دنیا جانتی ہے اور نام نہاد مغربی آزادیوں کا پول دنیا کے سامنے کھل گیا ہے ایک اندازے کے مطابق آئرلینڈ کے واقعات کے بعد پُرامن شہریوں کی بہت بڑی تعداد کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا ہے اور ملک دشمنی کے الزام میں ان پر بیشمار مقدمات چلائے جا رہے ہیں۔ ہانگ کانگ تو سیاسی آزادی کے لحاظ سے ایک جہنم پایا گیا ہے۔

پاکستانی شہریوں نے ایک اور شکایت کی کہ جب وہ کئی سالوں کے بعد پاکستان میں جاتے ہیں تو پاکستانی کسٹم کے حکّام ان کی استعمال شدہ اشیاء، پہننے کے کپڑے، ریڈیو اور ٹیلی ویژن وغیرہ تک ضبط کر لیتے ہیں یا بہت بھاری ڈیوٹی لگا دیتے ہیں۔ ان حالات میں ڈیوٹی اشیاء کی قیمت سے بڑھ جاتی ہے اور رشوت دے کر خلاصی کرانی پڑتی ہے۔ جب کہ کراچی کے بیشمار سمگلر سال میں کروڑوں روپے کی اسمگلنگ کرتے ہیں۔ ہوائی جہاز، سمندری جہاز اور کسٹم کے حکّام کی وساطت سے یہ کروڑوں روپوں کا سمگل شدہ مال پاکستان کی منڈی میں بلا روک ٹوک پہنچ جاتا ہے ان سماج دشمنوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جاتی۔ پاکستان کے کونسلیٹ کے چند افراد بھی سمگلروں اور سماج دشمن عناصر کی امداد کرتے ہیں۔ مگر قانونی گرفت سے بچے رہتے ہیں، اس کے برعکس غریب شہریوں کا معمولی معمولی بات پر پاسپورٹ منسوخ کر دیا جاتا ہے۔ جس سے ان کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پاکستانیوں نے یہ بھی کہا کہ سمگلنگ کے کاروبار میں بعض سفارت خانہ کے افراد بھی ملوّث ہیں۔ جن سے کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوتی ان پاکستانیوں سے فارغ ہوئے تو بج چکے تھے۔ مسٹر ملک نے مجھے شہر کے دوسرے حصے "کالون" کی سیر و تفریح کی دعوت دی، ہم تین دوست وہاں سے پیدل چل کر قریبی سمندری کشتی کے سٹیشن پر پہنچے، یہاں ہزاروں کی تعداد میں شہری کشتیوں کے ذریعے آجا رہے تھے وہ ہر روز ایک سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے ہیں ہم ایک کشتی میں سوار ہو گئے جس نے ہمیں پانچ منٹ میں دوسرے کنارے پر پہنچا دیا شہر کے اس حصے میں مقابلتہً تمام ضروریات کی چیزیں سستے داموں مل جاتی ہیں، یہ نئے فیشن اور آرائش کے اعتبار سے ہانگ کانگ سے کافی آگے ہے ایک دوست کی خواہش کے مطابق میں نے ایک دکان سے "کاسمیٹکس" کی اشیاء خریدیں جو کافی ارزاں

تھیں اس کے بعد عام آدمی کی زندگی کا جائزہ لینے ہم ایک ریسٹوران میں چائے پینے کے لیے چلے گئے۔ بڑا پُر فضا ہوٹل تھا کثیر تعداد میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں چائے پی رہے تھے اور نہایت خوش باش نظر آتے تھے۔ ہانگ کانگ کی مقبول ترین آئس کریم جس میں مسور کی دال ملی ہوتی ہے کھائی، یہ بہت لذیذ تھی پاکستانی سکّے کے مطابق ایک کپ کی قیمت اڑھائی روپے تھی۔ یہاں کے چھوٹے دکانداروں کے معاشی اور معاشرتی حالات بہت اچھے ہیں، اور وہ کاروباری لحاظ سے بہت خوشحال ہیں۔ مگر سماجی برائیوں میں یہ معاشرہ سرتاپا ڈوبا ہوا ہے قتل، ڈاکے، عصمت فروشی، دھوکہ دہی اور دوسرے سنگین جرائم معمول کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہانگ کانگ میں چینی لڑکیاں کھلے بندوں عصمت فروشی کرتی ہیں اور پیسے کی خاطر اپنا سب کچھ لٹانے کو راضی ہو جاتی ہیں۔ اس دلدل میں بڑے بڑے خاندانوں کی لڑکیاں بھی دھنسی ہوئی ہیں، بے شمار والدین اور خاوند اس بات کا برا نہیں مانتے۔ انہیں صرف سکّے چاہییں وہ چاہے کسی طرح سے حاصل کیے جائیں۔ یہاں ایک اور دلچسپ اور عجیب قسم کی بات دیکھنے میں آئی ہے وہ یہ کہ اگر کوئی لڑکی کسی مرد سے ناراض ہو جائے، وجہ چاہے کوئی بھی ہو اور پولیس سے شکایت کر دے تو اس لڑکی کو پولیس کچھ نہیں کہتی، مگر مرد کا کباڑہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ لڑکیاں پاکستانیوں سے خصوصاً اور دوسرے غیر ملکیوں سے عموماً بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے رقم بٹورتی ہیں۔ اس میں پولیس کا برابر کا ہاتھ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر پولیس کسی پاکستانی کو ملک سے باہر نکالنا چاہتی ہے، تو ایک فاحشہ کو اسکے پاس بھیج دیا جاتا ہے، بعد میں یہ لڑکی پولیس میں جا کر شکایت کر دیتی ہے کہ اس مرد نے یا تو میرا حساب کتاب پورا نہیں دیا یا یہ کہ میرے ساتھ کیے ہوئے معاہدہ سے روگردانی کرتے ہوئے مجھ سے زیادتی کی ہے۔ یہ واقعات "ذوقِ عجم کو پورا کرنے" کی شکل میں بھی پیش آتے

ہیں ۔ کچھ پاکستانی حضرات بھی لڑکیوں کی فراخدلی کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور تھانے میں پٹائی کروانے کی بجائے خلوت گاہوں کو سجانے پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ یہ تمام عیاشی کا نتیجہ ہے کہ بہت کم خاندان برائی سے پاک دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں بچوں کی شرحِ پیدائش خطرے کے نشان سے بہت اونچی ہے ۔ زمین کی قلّت کی وجہ سے مکانات کی شدید قلّت ہے ۔ بڑی بڑی فلیٹ نما عمارتیں عام ہیں لیکن عام آدمی کو رہائش کی سخت مشکل پیش آتی ہے مکانات کی قلّت ہی کا نتیجہ ہے کہ پچاس ہزار کے قریب غریب خاندان کشتی نما جھونپڑیوں میں رہتے ہیں اور اسی تضاد کا نتیجہ ہے کہ ہانگ کانگ میں جرائم میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے ۔ ہم ارد گرد کا مشاہدہ کرتے ہوئے ساڑھے دس بجے کے قریب ہوٹل میں واپس آئے تو ہمیں پراٹوکول کیطرف سے ہدایت نامہ ملا کہ صبح آٹھ بجے ہمارا طیارہ شمالی کوریا روانہ ہو جائے گا اس لیے چار بجے سامان تیار رکھنا چاہیے' دو گھنٹے سامان تیار کرنے میں لگ گئے' اس طرح رات بارہ بجے کے قریب کھانا نصیب ہوا اور قدرے ستا سکے ۔

کچھ ہانگ کانگ کے بارے میں

ہانگ کانگ دنیا میں کئی وجوہات کی بنا پر بہت مشہور ہے ۔ یہ بین الاقوامی کھلی تجارتی بندر گاہ ہے یہاں دنیا بھر کی اشیاء ڈیوٹی کے بغیر لائی جاتی ہیں اور کھلے بندوں فروخت ہوتی ہیں ۔ بین الاقوامی مارکیٹ کے لحاظ سے قیمتیں بہت تھوڑی ہیں ۔ جاپان ، برطانیہ اور امریکہ کی اعلیٰ اور معیاری اشیاء ان ممالک کے مقابلے میں یہاں سستی بکتی ہیں مثلاً گرم کپڑے کا اعلیٰ سوٹ سلا سلایا صرف ہزار بارہ سو روپے میں مل جاتا ہے ۔ بلکہ اگر کوئی سوٹ سلانا چاہے تو صرف چند گھنٹوں میں آرڈر دے کر تیار کر دیا جاتا ہے ۔ ہانگ کانگ کی اس سہولت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمارے وفد کے ایک سینئر رکن نے دس بجے اعلیٰ انگلش

کپڑے کے سوٹ کا آرڈر دیا جو شام چار بجے تیار مل گیا۔ یہ سوٹ اپنی خوبصورتی کی وجہ سے تمام اراکین وفد کی دلچسپی کا موضوع بنا رہا۔ یوں بھی وفد کے یہ رکن گہری دلچسپ شخصیت کے حامل ہیں۔ اس طرح ایک دوسرے رکن نے چودہ ہزار روپے کی کلائی گھڑی لینے میں دلچسپی کا اظہار کیا' اس بات کی تصدیق نہ ہو سکی کہ انہوں نے واقعی اتنی قیمتی گھڑی خریدی یا نہیں کیونکہ زر مبادلہ صرف تین ہزار روپے کے قریب میسر تھا تاہم دورہ کے دوران میری تجسس بھری نگاہ ایک خوبصورت گھڑی اور بیش قیمت کیمرے پر پڑتی رہی جو غالباً ہانگ کانگ میں خریدا گیا تھا۔ پاکستانی عوام میں ہانگ کانگ کی شہرت رنگیلے کی اس فلم سے ہوئی جس میں رنگیلے کا یہ تکیہ کلام تھا کہ "وہ کوئی ایسا معمولی آدمی نہیں ہے بلکہ اس نے ہانگ کانگ کے نلکوں کا پانی پیا ہوا ہے" حالانکہ ہانگ کانگ میں کوئی نلکہ نہیں۔ چاروں طرف سمندر ہے اور یہ شہر ایک جزیرہ نما ہے یہاں پر پینے کا پانی عوامی جمہوریہ چین سے خریدا جاتا ہے یہ شہر کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے ایک برطانوی تاجر نے سمندر کے کنارے آباد کیا تھا تاکہ برطانوی سمندری جہاز چین اور جاپان کی تجارت کے دوران یہاں پر رک سکیں اور تجارتی فوائد اٹھائے جا سکیں کسی زمانہ میں یہ ایک معمولی بستی تھی لیکن اس صدی کے اوائل ۱۹۰۲ء میں برطانوی حکومت نے اس شہر کو منڈی بنا لیا اور شہر کو وسعت دینا شروع کر دی۔ جزیرہ نما حصے کے دوسری طرف عوامی جمہوریہ چین کا علاقہ تھا اس علاقے کے ایک حصے کو اس وقت چینی حکومت سے برطانوی حکومت نے ۹۹ سال کے لیے پٹہ پر لے لیا۔ یہ حصہ چین کی سرزمین کا ٹکڑا تھا۔ یہاں سے صرف ۲۵، ۳۰ میل کے فاصلے پر چین کی سرحد واقع ہے۔ یہ علاقہ خشکی کے راستے دور دراز تک ریل کے ذریعے چین کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ اس حصہ کو "کالون" کہتے ہیں دوسرا حصہ جو

ہانگ کانگ کہلاتا ہے وہ پٹہ پر نہیں ہے حکومت چین کی ملکیت بھی نہیں ہے۔ "کالون" کا ٹھیکہ ۱۹۹۷ء میں ختم ہو رہا ہے اور یہ بین الاقوامی دلچسپی کا موضوع ہے کہ آیا چین پٹہ کے خاتمے کے بعد ہانگ کانگ کے حصے "کالون" کو قبضہ میں لے لے گا یا نہیں سیاسی مبصرین کے مطابق اگر چین آج بھی چاہے تو یہ حصّہ قبضہ میں لے سکتا ہے۔ مگر چند سیاسی اور تجارتی وجوہ کی بنا پر اس پر قبضہ نہیں کیا گیا عین ممکن ہے کہ ۱۹۹۷ کے بعد بھی اس حصّے کی سیاسی حیثیت عوامی جمہوریہ چین کے لیے دوسرے علاقوں سے مختلف رہے جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ ہانگ کانگ ایک بہت بڑی سرمایہ دارانہ منڈی ہے اور برائیوں، جرائم، پسماندگی اور اخلاقی گراوٹ کی وجہ سے یہ شہر عبرتناک حد تک سرمایہ داری نظام کا مکمل عکس ہے پچاس لاکھ کی آبادی کا یہ شہر بین الاقوامی سمگلروں، جاسوسوں، قاتلوں، راہزنوں، ڈاکوؤں، چوروں، اخلاقی مجرموں اور جنس زدہ جوانوں کی آماجگاہ بھی ہے مگر اس کے باوجود ظاہری طور پر بڑی بڑی پتھر اور شیشے کی عمارتوں اور صاف و شفاف سڑکوں، دلکش مناظر، مرطوب آب و ہوا اور مخصوص طبقوں کی خوشحالی، تفریح طبع اور تھرکتی بل کھاتی حسیناؤں کا شہر ہے۔ یہ برطانیہ کی نوآبادی ہے اور یہاں پر ایک برطانوی حکومت کا نامزد گورنر رہتا ہے جو آمرانہ سیاسی نظام کا محافظ و نگران ہے۔ برطانوی طرز کے قوانین اور عدالتیں قائم ہیں۔ کوئی سیاسی جماعت نہیں ہے یہاں ہر قسم کی تحریر و تقریر کی آزادی مفقود ہے۔ معمولی سی سیاسی تحریک پر لوگوں کو دھر لیا جاتا ہے۔ ہانگ کانگ کے چینی عوامی جمہوریہ چین کے نظام کے مقابلے میں برطانوی سامراجی نظام سے بظاہر خوش نظر آتے ہیں کیونکہ اس میں لوٹ کھسوٹ اور جنسی عیاشی کی کھلی چھٹی ہے لیکن یہ لوگ اندر سے کھوکھلے ہوتے جا رہے ہیں۔ چند ایک اخبارات ضرور نکلتے ہیں جن میں قتل،

ڈکیتی جنسی جرائم کے علاوہ صرف تجارتی اور مالیاتی اداروں کی خبریں ہوتی ہیں۔ ہمارے ہانگ کانگ میں ۳۶ گھنٹے قیام کے دوران سب سے نمایاں اور سنسنی خیز خبر" ہانگ کانگ سٹینڈرڈ" میں یہ تھی کہ "روسی جاسوسی کرنے والے سمندری جہازوں کو ہانگ کانگ کی سمندری حدود میں داخل ہونے سے روک دیا گیا ہے" اس طویل کہانی میں یہ بات لکھی گئی تھی کہ چونکہ روس ہانگ کانگ میں عوامی جمہوریہ چین کی جاسوسی کے لئے اڈے قائم کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اس کے ایجنٹ کسی صورت میں گھسنے نہیں دیئے جائیں گے۔ اسی روز ایک خصوصی مضمون میں عوامی جمہوریہ چین کی پارٹی کے اندرونی تضادات پر قیاس آرائیاں کی گئی تھیں اور چیئرمین ماؤزے تنگ کی کمزور صحت کے بارے میں نیوزی لینڈ کے وزیر اعظم کی ماؤ سے حالیہ ملاقات کے حوالے سے بتایا گیا کہ وہ روز بروز کمزور ہو رہے ہیں اور ان کے انتقال کے بعد چین میں قیادت کے بحران سے متعلق لغو اور بے بنیاد پروپیگنڈا کیا گیا تھا۔

ہانگ کانگ میں برطانوی طرز کا نظامِ تعلیم رائج ہے اور یہ تعلیم کافی مہنگی ہے یہاں کے عوام کو اعلیٰ تعلیم کے لئے برطانوی یونیورسٹیوں میں جانا پڑتا ہے صحت کی سہولتیں تسلی بخش نہیں ہیں۔ اس کو عوام کے مسائل سے بے توجہی کہا جائے یا پاکستان سے عناد کہ ایک پاکستانی لیڈی ڈاکٹر یہاں پریکٹس کرنا چاہتی تھیں، ان کو اجازت نہ دی گئی۔ اب وہ غیر قانونی طور پر غریب پاکستانیوں کی طبی امداد کرتی ہے۔ کھاتے پیتے لوگوں کی صحت اچھی ہے مگر مزدوروں، ماہی گیروں اور کم آمدنی والے لوگ خستہ حالت میں ہیں۔
ہانگ کانگ کا کل رقبہ ۱۶۹ مربع میل ہے۔

●

عوامی جمہوریہ کوریا

شمالی کوریا کو روانگی

۲۱۰۵۰۷۶ ہم صبح سات بجے ہوٹل سے ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہو گئے۔ آٹھ بجے کے قریب ہم نے اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ وزیر اعظم صاحب سوا آٹھ بجے طیارے میں سوار ہوئے اور تھوڑی دیر کے بعد ہمارا طیارہ آہستہ آہستہ ہانگ کانگ کے ہوائی اڈے سے پرواز کرتا ہوا سمندر کے اوپر ہی اوپر شمالی کوریا کی جانب بڑھنے لگا اور ہانگ کانگ کی بلند و بالا پہاڑیوں اور سبزہ زار پر تکونے گھر پس منظر میں اوجھل ہو گئے۔ جہاز میں بیٹھنے کے بعد کپتان صاحب نے وزیر اعظم بیگم بھٹو اور وفد کے دوسرے اراکین کو خوش آمدید کہا اور پرواز کی ضروری ہدایات دیتے ہوئے بتایا کہ ہانگ کانگ سے شمالی کوریا کے دارالخلافہ پیانگ یانگ کا تقریباً اڑھائی ہزار میل کا فاصلہ ہے جس کو طے کرنے میں چار گھنٹے صرف ہوں گے۔ اتفاق سے ہانگ کانگ اور پیانگ یانگ کا مقامی وقت ایک ہی ہے۔ چار گھنٹے کے سفر کے بعد بارہ بجکر بیس منٹ پر طیارہ پیانگ یانگ پہنچنا تھا۔ چونکہ وفد کے اراکین صبح ہوتے ہی ہوٹل سے نکل آئے تھے اِس لیے ان کے ناشتے کا انتظام طیارہ میں کیا گیا تھا۔ حسبِ معمول۔ پی آئی اے کا ناشتہ نہایت لذیذ اور معیاری تھا۔ ناشتے کے بعد میں نے طیارہ میں گھوم پھر کے کافی دوستوں اور دوسرے سیاسی کارکنوں سے ہانگ کانگ کے تجربات پر تبادلۂ خیال کیا۔ بیشتر لوگوں نے ہماری رائے سے اتفاق کیا۔ سب سے زیادہ دلچسپ مشاہدات مسٹر محمد بخش مجاہد نے بیان کیے۔ پچھلے صفحات میں ہمارے سفرنامے سے محمد بخش مجاہد ذرا غائب ہو گئے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ کسی اور ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور ہانگ کانگ میں قیام کے دوران ان کی کمی شدّت سے محسوس



پیانگ یانگ کے ہوائی اڈے پر آنے کے بعد صدر کم ال سنگ اور وزیراعظم بھٹو شہریوں کے استقبال کا ہاتھ ہلا کر جواب دے رہے ہیں



کوریا: پیانگ یانگ کے ہوائی اڈے پر پاکستانی وفد کے استقبال کا ایک منظر (دائیں سے بائیں) کامریڈ کم ال سنگ اور ذوالفقار علی بھٹو۔

ہوتی رہی۔کوریا کی پرواز میں اس بات کا انکشاف ہوا کہ محمد بخش مجاہد صاحب پندرہ سال ہانگ کانگ پولیس میں ملازمت کر چکے تھے اور معمولی سی بات پر حکومت نے ۱۹۶۵ء میں انہیں ملک بدر کر دیا تھا۔ پھر وہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستانی فوج میں خدمات سرانجام دیتے رہے اور جنگ کے بعد کچھ عرصہ پولیس انٹیلیجنس میں رہے جب پاکستان پیپلز پارٹی کا لاہور میں تاسیسی اجلاس منعقد ہوا تو وہ بلوچستان سے واحد مندوب کی حیثیت سے کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔ بڑی گوناگوں صفات کے مالک ہیں طیارے میں انہوں نے ہانگ کانگ کے سابقہ تجربات پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی ڈائری کے وہ صفحات دکھائے جن میں یہ لکھا تھا "تاریخ کتنی بے رحم ہے کہ برطانوی سامراج جس نے چند سال پہلے مجاہد صاحب کو ملک بدر کر دیا تھا ۱۹ امئی کو ان کے نمائندے انہیں سلامی دینے کے لیے آئے ہوئے تھے"۔ وقت تیزی سے گذرتا جا رہا تھا اور ہم کوریا کے دارالخلافہ کی طرف بڑھ رہے تھے کہ وزارت خارجہ کے افسران نے پیانگ یانگ میں ہوائی اڈے کی رسومات کے بارے میں تحریری ہدایات تقسیم کیں۔ ہدایات تھیں کہ طیارہ اترنے کے فوراً بعد جب سیڑھیاں لگ جائیں تو سیکنڈ کلاس کے دروازے سے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخباری نمائندے سب سے پہلے اتریں گے تاکہ جب اسکے بعد وزیر اعظم طیارے سے اتریں اور کوریا کے صدر کامریڈ کم اِل سنگ ان کا استقبال کرنے کے لیے آگے بڑھیں تو کیمرہ مین اور صحافی صاحبان اس منظر کو ریکارڈ کر سکیں۔ چنانچہ کپتان نے مخصوص انداز میں اعلان کیا کہ تھوڑی دیر میں ہم پیانگ یانگ کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں، جب میں نے جہاز کی کھڑکی سے نیچے کی طرف دیکھا تو کوریا کے سرسبز کھیت، لہلہاتی ہوئی فصلیں، گھنے درخت اور چھوٹے چھوٹے خوبصورت مکان دلکش نظر آرہے تھے۔ پہلا منظر دیکھتے ہی تصورات نکھر گئے اور ذہن میں یک گونہ طراوت کا احساس

اچانک ہمارا طیارہ سرسبز و شاداب چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر سے گزرتا ہوا رن وے کی طرف نیچے اترنے لگا۔ چند لمحات میں آہستہ آہستہ طیارہ ہوائی اڈے کے قریب کھڑا کر دیا گیا۔ ہدایت کے مطابق صحافی حضرات سب سے پہلے نیچے اترے۔ اس کے بعد وزیر اعظم و بیگم بھٹو طیارے سے نیچے اترے، صدر اور مادام کم اِل سُنگ نے ان کا استقبال کیا۔

ہوائی اڈہ کو سرخ جھنڈوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ سب سے اونچی جگہ پاکستان اور کوریا کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ درمیان میں وزیر اعظم بھٹو اور صدر کم اِل سُنگ کی قد آور تصویریں نصب تھیں۔ ان کے دونوں طرف بڑے بڑے بینرز لگے ہوئے تھے۔ جن پر پاک کوریا دوستی زندہ باد اور وزیر اعظم بھٹو اور صدر کم اِل سُنگ زندہ باد کے نعرے درج تھے۔

کامریڈ کم اِل سُنگ نے بھٹو صاحب سے مصافحہ کیا، اب وفد کے سینئر ارکان نیچے اترے، وزیر اعظم نے فوج کی سلامی لی اس کے بعد صدر کم اِل سُنگ آگے آگے اور وفد کے ارکان پیچھے پیچھے استقبالیہ لائن کی طرف گئے جہاں پر حکومتِ کوریا کے وزراء، اعلیٰ فوجی و سول عہدیداران، کوریا ورکرز پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے اراکین اور پارٹی کارڈرز قطار میں کھڑے تھے جبکہ صدر کم اِل سُنگ نے وزیر اعظم بھٹو اور وفد کے دوسرے اراکین سے تعارف کرایا۔ اس کے بعد پاکستانی سفارت خانہ کے عملے اور معدودے چند پاکستانی شہریوں سے وزیر اعظم نے مصافحہ کیا۔ اس عرصے میں وزیر اعظم کی گاڑی اور دوسرے اراکین کی گاڑیاں قطار میں کھڑی ہو چکی تھیں۔ فوج کے سلامی دینے والے دستے، معزز عہدیداران اور شہریوں کی استقبالیہ لائن کے علاوہ ہوائی اڈہ پر ہزاروں کی تعداد میں لڑکے اور لڑکیاں رنگ برنگی وردیاں پہنے اور پھولوں کے گلدستے لیے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ سامنے کی طرف دوسری قطار میں نہایت منظم

شکل میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہلکا پھلکا رقص کرتے ہوئے خوش آمدید اور پاک کوریا دوستی زندہ باد' اور وزیر اعظم بھٹو زندہ باد' صدر کم اِل سُنگ زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ ہماری معلومات کے مطابق خوشگوار موسم ہونا تھا مگر جب ہم ہوائی اڈے پر اترے تو موسم پاکستان میں مارچ کے مہینے کی طرح ذرا گرم تھا۔ البتہ مرطوب ہوا چل رہی تھی اور ہم اپنی وردیوں میں گرمی محسوس نہیں کر رہے تھے۔ استقبال نہایت فقید المثال اور تاریخی تھا۔ اسی اثنا میں وزیر اعظم کے پیچھے ہم اپنی گاڑی میں بیٹھ کر شہر کی طرف روانہ ہوئے۔

ہوائی اڈہ شہر سے چالیس کلومیٹر یعنی کوئی ۲۵ میل ہے۔ ہوائی اڈہ سے شہر کی جانب جانے والی سڑک دو طرفہ تھی اور نہایت کشادہ اور صاف ستھری، صاف ستھری سڑک کے دونوں طرف لاکھوں کی تعداد میں چھوٹے بڑے درختوں کی خوبصورت قطاریں اس قوم کے بلند ارادوں کو ظاہر کر رہی تھیں۔ قرب و جوار کے کھیت خوبصورت ترتیب سے سجے ہوئے تھے اور نوجوان مرد اور عورتیں مِل جل کر کھیتوں میں کام کر رہی تھیں۔ چونکہ چاول کے کاشت کرنے کا موسم تھا۔ تمام لوگ پنیری لگانے میں مصروف تھے اکثر جگہ چاول کی پنیری لگانے والی چھوٹی چھوٹی مشینیں کام کر رہی تھیں مگر کئی دوسری جگہوں پہ ہاتھ سے بھی پنیری لگائی جا رہی تھی۔ آس پاس کے دیہات نہایت صاف شفاف نظر آ رہے تھے۔ کوریا کے دیہاتوں میں مکانات پختہ ہیں چھوٹے چھوٹے دیہاتوں کو مِلانے کے لیے پختہ اور نیم پختہ سڑکیں موجود ہیں۔ کاروں کا قافلہ کھیتوں کے قریب سے گذرا تو احساس ہوا کہ ہم جنت نشان وادیوں سے گذر رہے ہیں کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں نے کھیتوں کے اندر سرخ جھنڈے اور بڑے بڑے بینرز جن پر پاک کوریا دوستی زندہ باد کے نعرے لکھے ہوئے تھے کھیتوں میں

لگائے ہوئے تھے۔ شہر کو جاتے ہوئے جہاں کہیں پہاڑیاں دکھائی دیں تو ان پر بھی تازہ ترین درخت اور پھلوں کے پودے اُگے ہوئے نظر آئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زمین کے اِنچ اِنچ پر کھیتی باڑی کے علاوہ درختوں اور پھلوں کے پودے اُگائے ہوئے ہیں۔ ہمیں سب سے بڑی حیرت اس بات پر ہوئی کہ تمام کھیت چاہے وہ ڈھلوان پر واقع تھے ان میں وافر پانی بھرا ہوا تھا۔ یہاں نہروں کا کوئی جال نہیں بچھایا گیا بلکہ تمام کھیتوں کے اردگرد بے شمار پانی کے ذخیرے بنائے گئے ہیں جن میں پانی پمپ کرنے والی مشینیں لگی ہوئی ہیں انکے ذریعے پانی چھوٹی چھوٹی ندیوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس طرح ہر جگہ کھیت سیراب کرنے کا ایک منظم اور مربوط نظامِ آبپاشی موجود ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہوائی اڈہ کے شاندار استقبال کے بعد ہم شہر کی طرف خموشی سے سفر طے کرتے ہوئے اپنی رہائش گاہوں کی طرف جا رہے ہیں۔ لیکن میرا یہ خیال اس وقت غلط ثابت ہوا جب شہر اور ہوائی اڈہ کے وسط یعنی بیس کلومیٹر کا فاصلہ کر چکنے کے بعد یکدم ایک بہت بڑا پھولوں سے آراستہ دروازہ سامنے آیا اور وہاں پر بے پناہ منظم عوام کے ہجوم نے والہانہ استقبال کیا اور نعرے لگائے یہ ہجوم سڑک کے دونوں طرف تھا۔ سب سے آگے خواتین کھڑی تھیں اور ان کے پیچھے مرد کھڑے تھے۔ ہر ایک کے ہاتھوں میں پھول یا پھولوں کے گلدستے تھے اور وہ اپنی زبان میں خوشگوار لہجہ میں خوش آمدید کے نعرے لگا رہے تھے۔ یہ ہجوم نہایت منظم اور گھمبیر تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اسی طرح منظم اور مربوط شکل میں نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کا قافلہ سامنے آتا اور جمناسٹک، پی ٹی قلابازیوں، میوزک اور ہلکے پھلکے رقص کا مظاہرہ کرتا۔ کئی جگہوں پر طالب علموں کے قافلے بھی آئے جنہوں نے بڑے بڑے پھولوں کے ہار اور

فرش پر پھولوں کے قالین سجائے ہوئے تھے وہ وزیرِ اعظم اور صدر کم اِل سُنگ کی گاڑی کو روک لیتے اور چند منٹ کی نمائش اور فنی کرتبّوں کے مظاہروں کے بعد گاڑیوں کو آگے بڑھنے کا راستہ دے دیتے ۔ جوں جوں شہر قریب آتا گیا عوام کا یہ ہجوم اور طالب علموں کے فن کے مظاہرے بڑھتے گئے ۔ لاکھوں انسانوں کے اس ہجوم نے رنگ برنگے کپڑوں اور پھولوں کی وجہ سے بہاروں کا سماں پیدا کر دیا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے سرخ، سبز، سفید اور نیلے سمندروں کی لہریں ناچ رہی ھیں، ہمارے تعجّب کی کوئی انتہا نہ رہی جب تقریباً ۱۵ میل کی مسافت کے دوران نظارہ اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ فگن رہا ۔ انسانوں کے اتنے بڑے ہجوم میں کوئی مرد یا عورت پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس نہیں تھا، نہایت سادہ مگر دیدہ زیب ستھرے لباس میں محنت کش پہچانے جا سکتے تھے، نوجوان لڑکے لڑکیاں، اور طالب علموں کے یونیفارم اور لباس نہایت خوبصورت اور رنگ برنگے تھے ۔ جہاں جہاں راستے میں پہاڑیاں اور اونچے نیچے ڈھلوان آتے تھے تو ان کے اوپر بھی ترتیب سے لڑکے لڑکیاں فن کا مظاہرہ کر رہے تھے جس تعداد میں پھولوں کے گلدستے ہاتھوں میں اور زمین پر سجے ہوئے تھے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے جب ہم شہر کے بالکل قریب پہنچے تو یہاں پر پہاڑی کی چوٹی پر ایک بہت بڑا مینار بنا ہوا تھا جس پر کوریا کے عوام نے کامریڈ کم اِل سُنگ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ان کا بت نصب کیا ہوا ہے اور چوٹی کے پاس ہی ایک اور مینار کے اوپر کامریڈ لینن کا بہت بڑا بت موجود ہے شہر کی دوسری بڑی بڑی عمارتوں پر وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو اور کامریڈ کم اِل سُنگ کی قدِ آدم تصویریں لگی ہوئی تھیں اور ہزاروں کی تعداد میں کوریا اور پاکستان کے

جھنڈے لہرا رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پاک کوریا دوستی کے بڑے بڑے بینر لگے ہوئے تھے سڑک کے دونوں جانب تقریباً آٹھ منزلہ فلیٹ جدید کوریا کی نمائندگی کر رہے تھے۔ شہر میں کوئی بھی پرانا اور بوسیدہ مکان نظر نہیں آیا۔ کئی عمارتوں پر مینارِ پاکستان کی تصاویر لٹک رہی تھیں جب ہمارا قافلہ شہر کے آخری چوراہے پر پہنچا تو ہزاروں کی تعداد میں بالکل چھوٹے بچے اور بچیوں نے خوبصورت پھولوں سے ہمارا استقبال کیا۔ ان بچے اور بچیوں کی عمر چار یا پانچ سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ چوراہے کے کونے پر جہاں سے ہماری گاڑیاں مہمان خانے کی طرف مڑنے لگیں، ایک بہت اونچے مینار پر رنگ برنگی پٹیاں بندھی ہوئی تھی اور درجنوں کی تعداد میں بچیاں اور بچے دوسرے کونے کو پکڑے ہوئے اس مینار کے ارد گرد ایسے انداز سے گھوم رہے تھے۔ کہ ایک طرف چکر لگاتے تو پاکستان کا جھنڈا بن جاتا تھا۔ دوسری طرف گھومتے تو وہ پٹیاں کوریا کے جھنڈے کا روپ دھار لیتیں یہ دلکش منظر کوریا میں قیام کے دوران دوسری جگہوں پر بھی دیکھا گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ فن کوریا کی ثقافتی خصوصیات کا مظہر ہے۔ اس سے قبل اس قسم کا منظر دوسرے ممالک میں نہیں دیکھا گیا اور نہ ہم نے اتنا منظم اور فقید المثال استقبال دنیا کے کسی سربراہ مملکت کا دیکھا اور نہ سنا ہے۔ مردوں، عورتوں، بچے بچیوں کی تنظیم، سلیقہ، فنی صلاحیتیں اور محبت کے جذبات کا اسقدر اظہار کسی غیر ملکی کے استقبال کے سلسلے میں ہوتے کہیں نہیں دیکھا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق پیانگ یانگ کی بارہ لاکھ آبادی میں سے شاید ہی کسی حصّہ کے لوگ اپنے گھروں میں رہ گئے ہوں، ہو سکتا ہے صرف وہ مرد اور عورتیں جو نہایت اہم قومی یا نجی امور کے سلسلے میں مصروف ہوں استقبال کے لیے نہ آسکے ہوں پیانگ یانگ میں موجود سفارتی حلقوں کے مطابق کوریا کی تاریخ میں یہ سب سے بڑا استقبال تھا

اب ہمارا قافلہ شہر کے بڑے چوراہے کے اس کونے پر پہنچ چکا تھا، جہاں سے دائیں طرف دریا کا پُل شہر کے دوسرے حصّے کو ملاتا ہے اور بائیں طرف دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ سڑک پہاڑی کے دامن سے گزرتی ہوئی سرکاری مہمان خانوں کی طرف جاتی تھی۔ یہاں پر نہایت گرمجوشی اور منظم طریقے سے عوام کا ہجوم ختم ہوا اور ہماری گاڑیاں آہستہ آہستہ دریا کے شمالی ساحل پر قصرِ صدارت سے گزرتی ہوئی مہمان خانوں میں پہنچ گئیں چونکہ قصرِ صدارت راستے میں پڑتا تھا۔ صدر کِم اِل سُنگ قصر میں چلے گئے اور وزیرِ اعظم اور ان کا ذاتی عملہ مہمان خانہ نمبر ۱ میں چلا گیا۔ کاروں کا قافلہ دو حصوں میں بٹ گیا۔ وزیرِ اعظم کے خصوصی معاونین اور نجی عملہ کے افراد مہمان خانہ نمبر ۱ کی طرف مڑ گئے۔ اور دوسرا قافلہ جس میں وزراء، ممبرانِ اسمبلی، اور پارٹی کے عہدیدار شامل تھے وہ مہمان خانہ نمبر ۲ میں منتقل ہو گئے۔ تیسرا قافلہ صحافیوں اور اور پی آئی اے کے عملہ پر مشتمل تھا وہ شہر کے بڑے ہوٹل میں منتقل ہو گیا۔ ہم مہمان خانہ میں دن کے اڑھائی بجے کے قریب پہنچ گئے۔ ہوائی اڈہ پر جن کاروں میں ہم نے سفر کیا وہ تمام کی تمام جرمنی کی معروف مرسڈیز کاریں تھیں۔ وزیرِ اعظم اور وزراء کی کاریں مہنگے ماڈل کی تھیں مگر اس کے علاوہ تمام دوسرے اراکین کی کاریں بھی ذرا چھوٹے مرسڈیز ماڈل کی تھیں۔ تمام کاروں کے مرتبے کے لحاظ سے نمبر الاٹ کیے گئے تھے میرے حصّے میں کار نمبر ۲۲ آئی۔ گیسٹ ہاؤس میں آنے کے فوراً بعد ہمیں بڑے استقبالیہ کمرے میں ٹھہرایا گیا اور اس کے بعد ہمیں کمروں کے نمبر دیئے گئے۔ میرے ساتھ کمرے میں حنیف تارو کو ٹھہرایا گیا اور یہ کمرہ پہلی منزل پر واقع تھا۔ جہاں پر صوبائی وزیر، ممبرانِ اسمبلی، سرکاری افسران اور پارٹی کے عہدیداران ٹھہرے ہوئے تھے، اوپر کی منزل پر مرکزی وزراء، پاک افواج کے سینئر افسران اور دوسرے سینئر وفد کے اراکین ٹھہرے ہوئے تھے۔ وزراء کے کمرے

بہت بڑے تھے اور ان کے ساتھ بیٹھنے کا کمرہ اور کافی آرائش کا سامان موجود تھا ہمارے حصہ میں جو کمرے آئے وہ بہت خوبصورتی سے سجائے گئے تھے، مگر دو آدمیوں کے لیے نسبتاً چھوٹے کمرے تھے۔ کمرے میں موجود بستر پر سفید چادروں سے ڈھکے ہوئے گدّے اور رضائیوں سے سجے ہوئے تھے۔ اتنی سفید چادریں پہلے ہم نے کم ہی دیکھی ہیں۔ ایسی چادریں صرف کوریا میں تیار کی جاتی ہیں۔ یہاں ایک نہایت سفید پہاڑی پتھر سے کیمیاوی طور پر مصنوعی کپاس تیار کی جاتی ہے جس سے کاٹن کے پہننے کے کپڑے، بستروں کی چادریں اور اور دوسری آرائش کی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ ہمارے بستروں پر بچھی ہوئی چادریں بھی اس پتھر کے سوت کی تیار کردہ تھیں۔ اس کے علاوہ کمرے میں غسلخانے میں پہننے کے تولیہ نما گون، رات کو سونے کے پاجامے، کمرے میں پہننے کے چپل، غسلخانے میں پہننے کے چپل، شیو کرنے کا سامان، مردانہ میک اپ کی ضروری اشیاء اور دھلے ہوئے صاف تولیے رکھے ہوئے تھے۔ موسم خوشگوار تھا اس لیے ایرکنڈیشنر کی ضرورت نہیں تھی تاہم ہر کمرہ میں جاپان کا بنایا ہوا نہایت قیمتی ایرکنڈیشنر لگا ہوا تھا۔ کمرے میں جتنی چیزیں موجود تھیں ان میں صرف ایرکنڈیشنر غیر ملکی مصنوعات میں سے تھا۔ باقی تمام اشیاء کوریا کی اپنی تیار کی ہوئی تھیں۔ کمرے میں ایک عدد ریڈیو بھی موجود تھا۔ پلنگ کے ساتھ کی میز پر کامریڈ کم ال سنگ کی مشہور و معروف کتب کا سٹ اور دوسرے چھوٹے بڑے پمفلٹ رکھے تھے۔ اوپر اکے کتابچے اور بے شمار مفید کتابیں جو انگریزی میں لکھی ہوئی تھیں، پڑی تھیں، ایک گول میز اور دو کرسیاں بھی کمرے میں تھیں۔ گول میز کے اوپر چائے کے خوبصورت برتن اور پانی پینے کے گلاس لگائے گئے تھے۔ میز پر رکھی ہوئی تھرماس میں گرم پانی موجود تھا جب کہ دو چھوٹی پیالیوں

میں مختلف اقسام کی چائے پڑی تھی۔ ایک پاؤڈر نما پڑیا میں پاکستان جیسی چائے رکھی تھی جب کہ دوسرے برتن میں معروف سبز چینی چائے کی پتیاں پڑی تھیں، پاس ہی ایک فرج پڑا تھا۔ اس میں تین چار قسم کے مشروبات تھے جن میں منرل واٹر (یہ سوڈے کی قسم کا ایک مشروب ہے) پینے کا صاف پانی، سیب کا جوس اور بیئر کی بوتلیں شامل تھیں۔ فرج کے اندر ایک خانے میں ایک بہت بڑی پلیٹ میں تین بہت بڑے سیب جن کا فی سیب وزن آدھ سیر ہوگا پڑے ہوئے تھے ان کے اوپر ایک بہت بڑی ناشپاتی پڑی تھی جس کا وزن سیبوں سے بھی زیادہ ہوگا۔ کوریا میں رہائش کے دوران یہ معلوم ہوا کہ یہ سیب اور ناشپاتی کوریا میں کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں، اور مٹھاس میں شاید ہی ان کا کوئی نعم البدل ہو۔ کہتے ہیں کہ بین الاقوامی مارکیٹ میں اس سیب اور ناشپاتی کی بہت مانگ ہے یقیناً یہ بات مبالغہ نہیں ہے کیونکہ اتنے میٹھے سیب اور ناشپاتیاں دنیا بھر میں کہیں نہیں ہیں

کمرے میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد استقبالیہ کمرے کے ساتھ واقع کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ یہاں کے دستور کے مطابق ہر آدمی کو کھانے کے کمرے میں جانا پڑتا ہے۔ رہائش کے کمرے میں کھانا منگوانا ممنوع ہے۔ نیچے کی منزل پر رہنے والے تمام حضرات ایک کمرے میں کھانا کھاتے تھے اور اوپر کی منزل والے دوسرے کمرے میں، یہ متقابلتہً نوجوان اور زندہ دل وفد کے ارکان تھے اوپر کی منزل پر سینئر اور سنجیدہ اراکین کا ڈیرہ تھا یہی وجہ تھی کہ نیچے کی منزل کے ایک رکن مسٹر عبدالوحید کو جب یہ کہا گیا کہ وہ مرتبہ کے لحاظ سے اوپر کی منزل پر کھانا کھایا کریں تو انہوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ اوپر اتنا سنجیدہ اور بور ماحول ہے کہ جی نہیں لگتا۔ وہ دورے کے تمام دنوں میں احتجاجاً نیچے کی منزل پر کھانا کھاتے رہے۔ انہوں نے پہلے روز بھی دوپہر کا کھانا

نچلی منزل پر ہی کھایا۔ کھانا نہایت پرُ تکلّف اور لذیذ تھا۔ اب کچھ کھانے کے بارے میں بھی سنتے چلیں۔ ہم جتنے دن کوریا میں رہے اتنے روز ہمیں یہی کھانا دیا گیا جس میں دنبہ، مرغا، مچھلی شامل تھی اور سبزیوں کے اچار سے کھانا شروع کیا جاتا اُس کے بعد سبزی یا گوشت کا سوپ آتا تھا، اس کے ساتھ پیالے میں خشک چاول رکھے ہوتے تھے۔ ابتدا میں ہمیں معلوم نہیں تھا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ کوریا میں اور غالباً چین جاپان میں بھی یہ رواج ہے کہ سوپ میں خشک چاول ڈال کر کھائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد گرم کھانے کا دور شروع ہوتا جو دنبے کے گوشت، مرغ کے گوشت، کئی قسم کی مچھلیوں اور مختلف قسم کی سبزیوں پر مشتمل ہوتا۔ یہاں مرچوں والا شوربہ نہیں ہوتا۔ البتہ یخنی ہوتی ہے۔ بھنے ہوئے گوشت اور سبزی کے کھانے بھی علیحدہ علیحدہ دیئے جاتے ہیں۔ اتنی لذیذ خوراک کے بعد میٹھی ڈش بہت کم کھائی جاتی ہے صرف دو ایک مرتبہ ہمیں آئس کریم کھلائی گئی۔ کھانے کے بعد میٹھے سیب اور ناشپاتی کے پھل پیش کیے جاتے اور سب سے آخر میں کوریا کا لذیذ ترین پھل "تربوز" خوبصورت ٹکڑوں میں کاٹ کر پیش کیا جاتا۔ یہ تربوز شکل وصورت میں پاکستانی تربوز سے ملتا جلتا ہے مگر شہد کی طرح میٹھا ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں کا تربوز اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے اس میں بیج بھی بہت باریک ہوتے ہیں۔ جب کھانا کھا چکتے تو سبز چائے اور کافی سے تواضع کی جاتی۔ کھانے کی میز پر متذکرہ اشیاء کے علاوہ دوسرے مشروبات بھی رکھے جاتے تھے۔ ہم نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور اپنے کمروں میں چلے گئے اور تھوڑی دیر کے لیے آرام کیا۔

شام کو وزیرِ اعظم صاحب اور بیگم بھٹو تقریباً چھ بجے صدر اور مادام کم اِل سنگ کی اقامت گاہ پر احتراماً مختصر وقفہ کے لیے ملنے گئے ساڑھے سات

بجے صدر عوامی جمہوریہ کوریا اور مادام کم اِل سُنگ نے وزیرِ اعظم اور بیگم بھٹو کے اعزاز میں عظیم عوامی ثقافتی ہال میں ضیافت دی یہ ہال تقریباً دو سال ہوئے بنا ہے اور خوبصورتی اور عظمت کے لحاظ سے کوریا کے عظیم محنت کش عوام کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

ضیافت

ضیافت والا کمرہ بہت بڑا اور خوبصورت ہے جس میں ایک وقت میں کئی ہزار افراد کھانا کھا سکتے ہیں۔ سامنے بڑی لمبی میز پر وزیرِ اعظم بھٹو، بیگم بھٹو، مادام کم اِل سُنگ اور دوسرے سینئر ارکان بیٹھے تھے سامنے رکھی ہوئی گول میز پر ایک درجن کے قریب، برابر کی تعداد میں مراتب کے لحاظ سے پاکستانی اور کوریا کے نمائندوں کے علاوہ پیانگ یانگ میں موجود سفارت خانوں کے نمائندے بیٹھے ہوئے تھے۔ پونے آٹھ بجے کے قریب جب تمام افراد ہال میں پہنچ چکے تو میزبان اور مہمانِ خصوصی تشریف لائے ہال زوردار تالیوں سے گونج اٹھا ہال میں نصب شدہ نہایت پُرکشش روشنیوں کے علاوہ ٹیلی ویژن کے کیمروں کی روشنیوں سے مہمانوں کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ اپنی اپنی میزوں پر بیٹھنے کے بعد کھانے کا پہلا دور ٹھنڈے گوشت اور سبزیوں سے شروع ہوا اس کے بعد کامریڈ کِم اِل سُنگ نے تقریر کی جس میں انہوں نے پاکستان اور کوریا کی دوستی کی تعریف کی۔ اس کے علاوہ دونوں ممالک کی ترقی اور خوشحالی کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ کوریا کے عوام کی آزادی، سامراج کیخلاف جنگ اور تیسری دنیا کے ممالک کے ساتھ مل کر بین الاقوامی آزادی کی تحریکوں کی حمایت کا ذکر کیا۔ شمالی اور جنوبی کوریا کے اتحاد کی بین الاقوامی اپیل کی۔ وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے کارہائے نمایاں کو سراہا اور ان کی قیادت میں پاکستان کی ترقی اور خوشحالی کے لیے نیک

خواہشات کا اظہار کیا۔ تیسری دنیا کے مظلوم عوام کے اتحاد اور سامراجی نوآبادیاتی اور نیم نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے لیے کوریا کے عوام کے مکمل تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ آخر میں پاکستان اور کوریا کے عوام کی دوستی کے لیے "ٹوسٹ" پیش کیا اور اپنی سیٹ پر واپس آ گئے۔ اس کے بعد کھانے کا دوسرا دور شروع ہوا۔ گرم کھانوں کے متعدد کورس پیش کیے گئے۔ ان کے اختتام پر وزیر اعظم بھٹو اپنی جوابی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کوریا کے عوام کی عظیم انقلابی جدوجہد، ترقی کرنے کی رفتار اور خوشحالی حاصل کرنے کی تاریخی کاوشوں کو سراہا۔ انہوں نے شمالی اور جنوبی کوریا کو متحد کرنے کے عوامی اور بین الاقوامی منصفانہ مطالبے کی پُرزور حمایت کی۔ بھٹو صاحب نے پاکستان کی اندرونی اور بیرونی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے ۱۹۷۱ء میں بین الاقوامی سازش کے تحت پاکستان کے ٹکڑے کرنے کا ذکر کیا۔ ہندوستان کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ انہوں نے کشمیری عوام کے جائز اور منصفانہ حقوق پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہ کرنے کے عزم کا اعادہ کیا۔ جناب بھٹو نے بین الاقوامی آزادی کی تحریکوں، افریقہ، لاطینی امریکہ، فلسطین اور دوسرے مظلوم عوام کی جدوجہد آزادی کی پرزور حمایت کی۔ وزیر اعظم نے بین الاقوامی نئے اقتصادی نظام کے قیام کے لیے عالمی سطح پر تیسری دنیا کے لیے کانفرنس کے منعقد ہونے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اپنی ہانگ کانگ کی تقریر کے موقف کو دہرایا۔ آخر میں انہوں نے دونوں ملکوں کی ترقی اور خوشحالی کے لیے "ٹوسٹ" پیش کیا اور اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ اب کھانے کا تیسرا دور شروع ہوا اس کے اختتام پر ثقافتی شو پیش کیا گیا۔ یہ شو پیانگ یانگ آرٹس کونسل کے تعاون سے پیش کیا گیا تھا اور اس کے مرد اور خواتین فنکار ملک کے مایہ ناز فنکاروں میں سے تھے۔ موسیقی کے سازوں کا مجموعی گروپ بہت معیاری اور

دلکش تھا۔ اس ثقافتی شو میں چار نمونے پیش کیے گئے ہر نمونے کے دو حصے تھے۔ ایک حصّہ میں پاکستانی موسیقی اور گانا اور دوسرے میں کوریائی موسیقی اور گانا تھا۔ پہلے نمونے میں پاکستان کا میوزک بجایا گیا۔ اس کے بعد کوریا کا موسم بہار کا خوشگوار میوزک بجایا گیا۔ یہ پیشکش پچاس کے قریب خواتین کی تھی. دوسرے گروپ نے جیوے جیوے پاکستان" کا اردو میں گانا گایا، اسی گروپ نے کوریا کا مقبول گانا، جس میں عوامی رہنما کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ اس نے ملک میں انقلاب برپا کیا" گایا گیا۔ تیسرے گروپ میں خواتین نے پاکستان کا مقبول گانا "چندا رے چندا" گا کر سنایا۔ اس کے بعد کوریا کا قومی گانا جس میں بے پناہ دلی جذبہ اور وفاداری کا اعادہ کیا جاتا ہے گایا گیا، آخر میں مردوں کے گروپ نے پاکستان کا مقبول ترین گانا "سوہنی دھرتی" گایا اور بعد میں کوریا کا مقبول ترین گانا "سرزمین کوریا کی بے پناہ خوشحالی اور عظمت کی مثال نہیں ہے" گایا گیا۔ جب سوہنی دھرتی اللہ رکھے "گایا گیا تو وزیرِ اعظم پاکستان جذبات میں آکر سٹیج پر چڑھ گئے اور ان کے ساتھ شیخ محمد رشید، حفیظ پیرزادہ، عزیز احمد اور ناصر علی رضوی بھی سٹیج پہ گئے اور مل کر سوہنی دھرتی تالیاں بجا بجا کر گروپ کے ساتھ گایا۔ اس منظر سے تمام ہال میں موجود دو ہزار افراد وجد میں آکر کھڑے ہو گئے اور تالیاں بجا بجا کر داد دینے لگے۔ ضیافت کا یہ نظارہ ایک یادگار تاریخی حیثیت کا حامل تھا۔ ضیافت کے موقع پر میز پر میرے ساتھ پاکستانی وفد کے اراکین میں سے مسٹر محمد بخش مجاہد امان اللہ خٹک کراچی، منیر محمد شکار پور (سندھ)، غلام رضا جائنٹ سیکرٹری پی پی پی کوئٹہ کے علاوہ کوریا کی وزارتِ خارجہ کے عالمی امور کے شعبہ کے ڈائریکٹر مسٹر لی، ہوسون بیٹھے تھے۔ کھانے کے دوران ترجمان کی وساطت سے میں نے مسٹر لی کے ساتھ کوریا کے مختلف پہلوؤں پہ باتیں کیں میں نے جب استفسار



کوریا: مہمان خانہ سے باہر (بائیں سے دائیں) امان اللہ خٹک، تاج محمد لنگاہ اور محمد بخش مجاہد

کیا کہ "کیا کوریا میں تمام علاقوں میں بجلی مہیا کی جا چکی ہے" تو انہوں نے جواب دیا کہ "بجلی کا مسئلہ کوریا میں پندرہ سال پہلے طے ہو چکا ہے اور دور دراز کے علاقوں میں بجلی پہنچائی جا چکی ہے۔ ان کی رائے تھی کہ کوریا کے دیہی عوام کی ترقی، خوشحالی اور زراعت کے شعبے میں عظیم کارہائے نمایاں، دیہاتوں میں بجلی کی بہم رسانی کے باعث انجام دیئے گئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کوریا کے نظامِ تعلیم سے بھی روشناس کرایا۔ اس کا ہم آگے چل کر ذکر کریں گے چونکہ مکانات کی فراہمی کا مسئلہ میرے لیے سب سے زیادہ دلچسپی کا موضوع ہے۔ اس لیے میں نے اس کے بارے میں تفصیلات پوچھیں معلوم ہوا کہ کوریا میں شہروں اور دیہاتوں میں ہر خاندان کو مفت مکان مہیا کر دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں کوئی دقت وغیرہ نہیں ہے۔ کوریا میں بچوں کے نرسری سکول کے بارے میں ہم نے استفسار کیا اس کا بھی آگے ذکر کیا جائے گا۔ کوریا کمیونسٹ پارٹی کے تنظیمی ڈھانچے کے بارے میں ہم نے گفتگو کی۔ اس کی تفصیلات بھی آئندہ کے صفحات میں درج کی جائیں گی۔

میرے پوچھنے پر مسٹر لی نے بتایا کہ کوریا کے عوام پاکستان کے عوام کی خوشحالی اور ترقی میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ جب میں نے یہ کہا کہ کامریڈ کِم اِل سُنگ کی اردو اور انگریزی کی تصنیفات پاکستان میں کافی مقبول ہیں خاص طور پر نوجوانوں میں گہری دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ اور پاکستان کے اخبارات و رسائل میں کامریڈ کِم اِل سُنگ کی چیدہ چیدہ تقاریر، اقوال اور ارشادات چھپتے رہتے ہیں۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ کوریا میں بھی وزیرِ اعظم بھٹو کی تقاریر، تحریریں اور ارشادات بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ اور کوریا کے اخبارات اور رسائل اس کی بھرپور اور آزادانہ تشہیر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی

پاکستان کے عوام کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا جاتا ہے اور پڑھا جاتا ہے۔ ضیافت کے دوران ہال میں جو دلکش آرکسٹرا بج رہا تھا۔ اس کی تفصیلات پوچھنے پر مسٹر لی نے مجھے کوریا کی ثقافتی روایات بتلائیں۔
اس موقعہ پر جب میں نے مسٹر لی سے کوریا کے میوزک اور ترقی یافتہ موسیقی کی تعریف کرتے ہوئے یہ دریافت کیا کہ "آیا کوریا میں مغربی ممالک یا سوویت روس کے قدیم زمانے کے میوزک کے ماسٹرز جن میں "بے تھوون"، باخ واگنر، "چے کاسکی" اور دوسرے شامل ہیں۔ ان کی ترتیب شدہ موسیقی کو ساز و آہنگ میں شامل کیا گیا ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ "ہم صرف اور صرف کوریا کے ماسٹرز کا ترتیب دیا ہوا میوزک بجاتے ہیں اور وہ بھی ان ماسٹرز کا جو آزاد کوریا کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ جو موسیقار انقلاب سے پہلے کے زمانہ کی مغربی تہذیب اور سامراج کی ثقافت کی نمائندگی کرتے ہیں ان کو کوریا کے عوام نے رد کر دیا ہے"
اگرچہ کچھ لوگ اس سے اتفاق نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ انسانی تاریخ میں عظیم فنکار اور موسیقار تمام دنیا میں یکساں طور پر محبت اور انسانی خدمت اور مشترک احساسات کے علمبردار ہیں۔ ان کی دلیل ہے کہ مغربی ممالک اور خاص طور پر جرمنی اور روس کے قدیم زمانہ کے عظیم موسیقاروں نے فن کی زندہ روایات کو جنم دیا ہے۔ حتیٰ کہ بعض مبصرین کی رائے میں کوریا کا جدید میوزک اور آرکسٹرا بھی قدیم زمانہ کے موسیقاروں اور فنکاروں سے متاثر ہے۔ لیکن میرے نزدیک کوریا کے عوام کا قومی جذبۂ خودداری اور خود اعتمادی کی یہ قابلِ رشک مثال ہے۔ مسٹر لی نے بتایا کہ کوریا کی حکومت دوست ممالک کے ساتھ ثقافتی اور ادبی نوعیت کے مختلف وفود کا تبادلہ کرتی رہتی ہے یہ وفود ایک دوسرے کے فن سے استفادہ کرتے ہیں۔ جس کی ایک مثال ہماری اپنی ضیافت میں پاکستان کے

میوزک اور مقبول نغموں اور گانوں کو گا کر سنانے کی ہے۔ مسٹر لی نے یہ بھی کہا کہ کوریا کی ثقافت کی مقبول ترین قسم "انقلابی اوپرا" ہے۔ جس کی تفصیلات آگے آئیں گی۔ ڈرامہ اور تھیٹر بھی انقلابی نقطۂ نظر کا حامل ہوتا ہے اور انتہائی مقبول ہے البتہ بیلے ڈانس بالکل مقبول نہیں ہے اور نہ کوریا کے فنکار اس کی نمائش کرتے ہیں۔

جب ضیافت کا اختتام ہوا اور تمام مہمان اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر رہائش گاہوں کی طرف چلے گئے تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ابھی تک شہر کی بڑی بڑی عمارتیں روشنیوں سے جگمگا رہی تھیں اور دن ہی کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے جب ہم واپس آرہے تھے۔ تو سڑکوں پہ اس وقت بھی ہزاروں کی تعداد میں کام کاج ختم کرنے کے بعد کوریائی عوام بس اڈوں پہ انتظار کر رہے تھے یا پیدل اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے۔ جب ہم واپس اپنے کمروں کی طرف جا رہے تھے۔ تو ایک اور روح پرور منظر دیکھنے میں آیا اس کے بعد بھی جتنے دن ہم کوریا میں رہے یہ منظر دیکھنے میں آتا رہا کہ اتنی رات گئے بھی ہزاروں کی تعداد میں بچے اور بچیاں منظم شکل میں پریڈ کرتے ہوتے اپنے گھروں کو جاتے ہیں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ یہ بچے سکول کی شام کی کلاس سے پڑھ کر واپس آرہے ہوں گے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بچے ڈرامہ سپورٹس، دوسری تفریحی یا جز وقتی فنی تربیت سے فارغ ہو کر قطار اندر قطار روزانہ اسی طرح اپنے گھروں کو واپس جاتے ہیں۔ ان نونہالوں کے اس عزم، حوصلۂ بے پناہ لگن اور تنظیم کو دیکھ کر کوریائی عوام کی عظمت کا شدید احساس اجاگر ہوتا ہے۔ ہم گھومتے پھرتے کافی تھک چکے تھے جلدی سے اپنے مہمان خانوں میں پہنچے اور آرام کی نیند سو گئے

صنعتی نمائش

۲۲ مئی ۱۹۷۶ء

ہم صبح تیار ہونے کے بعد ۹ بجے کے قریب ناشتے کے لیے کھانے کے کمرے میں گئے ہم تمام دوستوں نے مل جل کر ناشتہ کیا۔ ناشتے میں بھنی ہوئی مچھلی، گائے کے گوشت کے تلے ہوئے پیس شامل تھے۔ اکثر دوستوں کے طلب کرنے پر انڈے کا آملیٹ، مکھن، ٹوسٹ اور جام بھی مہیا کیا گیا۔ کوریا میں تیار شدہ کوکا کولا ذرا مختلف تھا۔ مگر یہ اپنی طرز کا نہایت لذیذ مشروب تھا۔ سیب، ناشپاتی اور انناس کا جوس ناشتے میں دیا گیا اس کے بعد چائے دی گئی۔ ہم دس بجے کے قریب ناشتہ سے فارغ ہوئے۔ تو ذہنی طور پر صنعتی نمائش دیکھنے کی تیاری کرنے لگے۔ یہ نمائش کوریا کی ورکرز پارٹی کی ۳۰ ویں سالگرہ پر منعقد کی گئی۔ نمائش کا وقت بارہ بجے تھا۔ ابھی دو گھنٹے باقی تھے ہم نے سوچا کہ وقت کی قدر کرتے ہوئے انہیں ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن جب ہم نے اپنے علم میں اضافہ کے لیے شہر کے مختلف حصوں کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو پتہ چلا کہ گاڑیاں کسی اور جگہ مصروف ہیں اور فوری طور پر کوئی تسلی بخش انتظام نہیں ہو سکتا۔ ہم نے گاڑیوں کے بغیر ہی مہمان خانہ کے اردگرد کی خوبصورت پہاڑیوں کے دل آویز مناظر دیکھنے اور دریا کے ساحل پر چہل قدمی کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلہ کی تائید مسٹر حنیف نارد، محمد بخش مجاہد، امان اللہ خٹک، غلام رضا اور شیر محمد نے بھی کی۔ ہم تمام دوست مارچ کرتے ہوئے گھنے درختوں سے ڈھکی اور پھلوں سے سجی ہوئی سرسبز و شاداب پہاڑیوں پر پہنچ گئے۔ ہر طرف پھیلا ہوا سبزہ اور کھلے ہوئے رنگ رنگ کے پھول روح میں تازگی پیدا کر رہے تھے۔ دریا میں بہت تھوڑا پانی بہہ رہا تھا۔ ہم چبوترے پر کھڑے ہو کر پہاڑیوں کے درمیان واقع



کوریا کی چودھویں سالگرہ کے موقع پر منعقدہ صنعتی نمائش کے ہال میں وزیراعظم اور وفد کے دوسرے اراکین کھڑے ہیں۔

عمارتوں کا نظارہ کرتے رہے۔ میں ان پُرکشش مناظر میں گم سا ہو گیا تھا کہ کچھ دوستوں نے چپو سے چلانے والی چھوٹی کشتی پہ دریا کی سیر کرنے کی سکیم بنا ڈالی۔ پھر میری رائے طلب کی۔ میں نے انہیں جواب دیا کہ ہم واقفیت بھی نہیں رکھتے اور تیرنا بھی نہیں جانتے کہیں داخل دفتر نہ ہو جائیں۔ میرے کہنے پر دوستوں نے یہ ضد تو چھوڑ دی البتہ تصویریں کھینچنے میں مصروف ہو گئے۔

ہم میں سب سے زیادہ قیمتی کیمرہ محمد بخش مجاہد کے پاس تھا۔ انہوں نے اپنی اور دوسرے دوستوں کی بے شمار تصویریں الٹے سیدھے زاویوں سے لیں۔ اسی دوران ہمارا ترجمان پہاڑیاں چیرتا ہوا ہم تک آپہنچا اور صنعتی نمائش پہ جانے کے لیے تیار ہونے کو کہا۔ ہم جلدی جلدی مہمان خانوں میں آئے، تیار ہوئے اور نمائش دیکھنے چل پڑے۔ بھٹو صاحب کے ساتھ ہم اس لیے نہ جا سکے کہ انہیں صدر اور مادام کم اِل سُنگ کی اقامت گاہ پہ جانا تھا۔ اس سے قبل دس بجے صدر اور مادام کم اِل سُنگ وزیرِ اعظم کی اقامت گاہ پر خیر سگالی کے لیے آئے تھے۔ بارہ بجے کے قریب ہم صنعتی نمائش دیکھنے گئے تو یہاں پہ ہزاروں کی تعداد میں مزدوروں، کسانوں اور خواتین نے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پھول ہلا ہلا کر ہمارا استقبال کیا۔ یہ نمائش ہمارے مہمان خانہ سے آٹھ میل دور شہر کے دوسرے کونے میں منعقد ہو رہی تھی۔ ہمارے گائیڈ نے ہمیں چارٹ، نقشوں اور اشارات سے کوریا کی ترقی کی تاریخ کے بارے میں تفصیلات بتائیں، جن کے مطابق کوریا ۵ مارچ ۱۹۴۶ء کو آزاد ہوا۔ یہاں کی ورکرز پارٹی نے کم اِل سُنگ کی قیادت میں آزادی کی جہد آزما اور کٹھن جدوجہد کی منزلیں طے کیں، ابتدائی طور پہ یہ پارٹی انڈر گراؤنڈ کام کرتی رہی لیکن ۱۹۳۶ء میں اس کی تنظیم اور لائن مرتب کی گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کوریا، جاپان کی نوآبادی تھا۔ کم اِل سُنگ اور ان کے انقلابی ساتھیوں نے ۲۰ سال تک آزادی

کی جنگ لڑی جس میں مزدوروں، کسانوں اور دوسرے انقلابی طبقوں نے بے پناہ مالی اور جانی قربانیاں دیں۔ آخر کار انقلابی حریت پسندوں کا خون رنگ لایا اور غلامی اور جبر وستم کے نظام کی تاریکیاں چیرتا ہوا آزادی کا ضو پاش سورج طلوع ہوا۔

آزادی کے پہلے ہی روز دُور رس زرعی اصلاحات کی گئیں۔ جن کے تحت جو جاگیر دار جاپانی سامراج کے ایجنٹ تھے۔ ان کی تمام زمینیں ضبط کر لی گئیں۔ جبکہ محبِ وطن زمینداروں اور جاگیرداروں سے پانچ ہیکٹر یعنی ساڑھے بارہ ایکڑ سے اُوپر کی زمینیں قومی ملکیّت میں لے لی گئیں۔ یعنی ساڑھے بارہ ایکڑ ان کے پاس رہنے دی گئی اور حاصل شدہ باقی اراضی کو مزارعین میں تقسیم کر دیا گیا۔ ۱۰ اگست ۱۹۴۶ء کو صنعتی اصلاحات نافذ کی گئیں، جن کے تحت جاپانی سامراج کا سارا سرمایہ ضبط کر لیا گیا۔ جو کوریا کے سرمایہ دار جاپان کے پٹھّو تھے' ان کی صنعتیں بھی بلا معاوضہ قومی ملکیت میں لے لی گئیں مگر محبِ وطن سرمایہ داروں کے کارخانوں کو نہیں قومیایا گیا۔ بعد میں ان سرمایہ داروں کی ذہنی تربیت کی گئی' اور ان کو اِس بات کا احساس دلایا گیا کہ اجتماعی ملکیت کا نظام' ملک اور عوام کے فائدے میں ہے۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ بعد باقی ماندہ سرمایہ داروں نے کسی مزاحمت کے بغیر رضاکارانہ طور پر اپنی صنعتیں قوم کے حوالے کر دیں اس طرح جن چھوٹے مالکوں کو پانچ ہیکٹر تک زمین رکھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ ان کی بھی سائنسی اصولوں کے تحت تربیت کی گئی۔ انہیں سمجھایا گیا کہ اجتماعی کھیتی باڑی کا نظام ان کے مفاد میں ہے۔ بالآخر کار ان چھوٹے مالکان نے بھی اپنی زمینیں حکومت کو دے دیں اور کوریا میں اجتماعی کھیتی باڑی کا نظام رائج کر دیا گیا۔ پہلے مرحلے میں جو ۱۹۴۶ء تک تھا، زراعت نے ایک سو سے دو سو فیصد اور صنعت نے ایک سو سے تین سو فیصد تک ترقی کی۔ زمین اور صنعت کے علاوہ ۱۹۴۶ء میں ٹرانسپورٹ کو بھی مکمل طور پر قومی ملکیّت میں لے لیا گیا۔ ۱۹۴۹ء کے بعد زرعی

ترقی و استحکام کے لئے پانچ پانچ سالہ منصوبے تیار کئے گئے۔ پہلے پانچ سالہ منصوبہ میں صنعت اور زراعت کو مضبوط سوشلسٹ بنیادوں پر استوار کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں صنعت نے ۳۴۸ فیصد اور زراعت نے ۲۱۴ فیصد ترقی کی۔ ہمارے گائیڈ نے نہایت احترام سے بتایا کہ صنعتی اور زرعی شعبہ میں حاصل کی گئی تمامتر کامیابیاں صدر کم اِل سُنگ کی دانشمندانہ قیادت کی مرہونِ منّت ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ۱۹۴۶ء سے اب تک کامریڈ کم اِل سُنگ نے دو ہزار آٹھ سو چھیانوے مقامات پر بذاتِ خود صنعت اور زراعت کے پیداواری یونٹوں کا معائنہ کیا اور موقع پر مناسب ہدایات دیں۔ اس عرصہ میں ۹ ہزار تیس اجتماعات سے خطاب کیا۔

ہمارے گائیڈ نے صنعتی نمائش کے اس عظیم ہال میں بے شمار شعبوں سے متعلق رکھی گئی چیزوں کی تفصیلات بتانی شروع کیں۔ سب سے پہلے ہم نے مشینری کا شعبہ دیکھا۔ اس شعبے میں بڑی بڑی خودکار بورنگ مشینیں، ٹریکٹرز، الیکٹرک موٹرز شیل بنانے اور چاول کی پنیری لگانے کی جدید ترین مشینوں کے علاوہ ڈھیر ساری زراعت سے متعلق دوسری مشینیں موجود تھیں۔ گائیڈ نے بتایا کہ انقلاب سے پہلے ایسی کوئی مشین کوریا میں تیار نہیں ہوتی تھی۔ ان سب مشینوں میں چاول کی پنیری کاشت کرنے کی مشینیں نہایت کارآمد، جدید اور سودمند تھیں۔ بعد میں کھیتوں میں جاکر ہم نے ان مشینوں کی اعلیٰ کارکردگی دیکھی۔ اس کے علاوہ جدید چمڑے کی صنعت کی مشین، گیئر بنانے، سلائی کرنے کی اور سُوئی بنانے کی مشینیں بھی ہم نے دیکھیں۔ گائیڈ نے بتایا کہ ان میں سوئی بنانے کی مشین بہت اہم ہے۔

ہال میں ریڈیو، ٹیلی ویژن، الیکٹرونکس اور دوسرے مواصلات کے نظام کی پیچیدہ مشینیں بھی موجود تھیں جن کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہوئے ہم سمندری جہازوں کے انجن بنانے کے شعبہ میں آگئے۔ جہاں ہم نے ڈیزل سے چلنے والے

دو ہزار ہارس پاور سے پچیس سو ہارس پاور تک کے سمندری جہازوں کے انجن، ہارڈویئر موٹرز، فرج، اور ایر کنڈیشنرز دیکھے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں کوئلے کی کان کنی کی جدید ترین دیو ہیکل مشینیں دکھائی گئیں۔ کان کنی کی مشین کے بارے میں گائیڈ نے بتایا کہ اس سے کوئلہ کی کانکنی کے علاوہ پہاڑوں کو کھود کر زمین دوز فوجی اڈے قائم کرنے میں مدد لی جاتی ہے۔ یہاں ہمیں بجلی، گیس اور کوئلہ سے اینٹیں بنانے والی بھٹی کے نمونے دکھائے گئے۔ کوریا میں تمام جدید عمارتیں پتھر کی طرز کی سنہرے رنگ کی اینٹوں سے بنی ہوئی ہیں جو ان جدید بھٹیوں میں تیار کی جاتی ہیں اس کے ساتھ فولاد کو پریس کرنے کی مشینیں دکھائی گئی ہیں! ان میں سے ہر ایک مشین ۶ ہزار سے ۶ لاکھ ۵۰ ہزار ٹن تک فولاد کو پریس کرنے کی استعداد رکھتی ہے۔ یہ مشین بلاشبہ جدید اور بھاری صنعت کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی۔ کیمیاوی کھاد بنانے والی فیکٹریاں جو گیس کوئلے اور ہوا سے چلتی ہیں دکھائی گئیں۔ گتہ اور کاغذ سازی کی صنعت بھی دکھائی گئی۔ کوریا میں کاغذ اکثر سرکنڈے سے بنایا جاتا ہے۔ یہاں ہمیں مصنوعی کاٹن اور اون سے تیار کردہ کپڑا، کمبل اور دوسری چیزیں دکھائی گئیں، یہ چیزیں ایک پتھر سے کیمیاوی طور پر ریشہ پیدا کر کے تیار کی جاتی ہیں۔

ہمارے لئے یہ مصنوعات دلچسپی اور حیرت کا باعث تھیں کیوں کہ اب تک ہم نے بارش برسانے کا تو سنا تھا۔ پتھر سے کپڑا تیار کرنے کا نہیں سنا تھا۔ کوریا میں کپاس پیدا نہیں ہوتی۔ حکومت نے عوام کی ضرورت پوری کرنے کے لیے پتھر سے کپاس کا ریشہ ایجاد کر لیا جو یقیناً محیر العقول کارنامہ ہے۔ ہمارے گائیڈ نے استفسار پر بتایا کہ ایسے عظیم اور ناقابلِ یقین کارنامے اس لیے سرانجام دیئے جا سکے کہ کوریا میں "جوچے" اصول یعنی خود اعتمادی، خود انحصاری اور ملکی وسائل پر بھروسہ کو اجتماعی ترقی کی بنیاد بنا دیا گیا ہے۔

ہم ابھی سوچ رہے تھے کہ بعض ملک کپڑے سینے

والی سوئی تک تیار نہیں کر سکتے اور یہاں پتھر سے کپاس بنا لی گئی۔ کہ کچھ دوست ٹیکسٹائل انڈسٹری کے شعبوں میں گھس گئے۔ ہم بھی سوچ کی دنیا سے مشاہدہ کی روشنی میں آگئے۔ ہمیں بتایا گیا کہ کوریا میں ۱۵۹ مقامات پر ۳۵۰ ٹیکسٹائل کے کارخانے ہیں ان میں زیادہ تر کارخانے مصنوعی سوت اور اون کے ریشے سے چلائے جاتے ہیں گھومتے گھامتے ہم نے جوتے بنانے کی صنعت کے کارخانے بھی دیکھے اور گگمہ ز، چینی کے برتن، پلاسٹک کے برتن، گھڑیاں، پنکھے موسیقی کے آلات، بائیسکل، لکڑی اور بجلی کا سامان، ٹافیاں، بسکٹ اور دوسری سوئٹیں اشیا، تیار کرنے والی مشینیں بھی دیکھیں۔ صنعتی نمائش میں شراب اور سیب کا جوس تیار کرنے کی مشینیں بھی تھیں جنہیں بعض حضرات نے بہت دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔ ڈبوں میں مچھلی بند کرنے، مختلف قسم کے اچار بنانے، کاغذ اور پلاسٹک کے مصنوعی پھول تیار کرنے کی مشینیں بھی ہماری توجہ کا مرکز تھیں۔ میں پھولوں کو زندگی سمجھتا ہوں اور ان کا شیدائی ہوں یہی وجہ ہے کہ مجھے مصنوعی پھول بنانے والی مشین بہت پسند آئی اور پھر کوریا میں اصلی اور مصنوعی پھول اتنے زیادہ تیار ہوتے ہیں کہ اگر اسے پھولوں کا دیس کہہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ قوم پھولوں سے جتنا پیار کرتی ہے مجنوں نے لیلیٰ سے بھی نہ کیا ہوگا۔

پچھلے صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے کوریا میں دیہاتوں اور شہروں میں پندرہ سال پیشتر بجلی پہنچا دی گئی ہے۔ بجلی کے اس ہمہ گیر نظام کی بدولت کوریا زراعت کے شعبہ میں استعمال ہونے والی تمام ہلکی اور بھاری مشینوں، ٹریکٹرز، اوزار اور پرزہ جات میں نہ صرف خود کفیل ہے بلکہ آرڈر پر دوسرے ملکوں کو بھی یہ مشینیں مہیا کی جا سکتی ہیں۔ یہاں خوراک کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ چاول، گندم، مکئی کے وافر ذخائر موجود رہتے ہیں۔ پھلوں میں سیب ناشپاتی اور تربوز کی اتنی بہتات ہے کہ غیر ممالک کو بھیجے جاتے ہیں۔

کوریا میں گائے، بھینس، بکری، مرغ، بطخ، مچھلی، سانپ نما مچھلی اور سوروں کے بڑے بڑے فارم موجود ہیں جن سے خوراک کی ضروریات پوری کی جاتی ہیں۔

تعلیمی نظام

ڈیڑھ سال تک کی عمر کے بچے نرسری سکول بھیج دیئے جاتے ہیں جو پانچ سال کی عمر تک یہاں تربیت حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بعد کینڈر گارٹن میں داخل کر لیے جاتے ہیں، اور انہیں دس سال کی لازمی اور مفت تعلیم دی جاتی ہے ایک اندازے کے مطابق کوریا میں پچاس فیصد سے زائد آبادی طالب علموں پر مشتمل ہے اور تقریباً ڈیڑھ کروڑ کی آبادی میں سے ۵۶ لاکھ بچے اور بچیاں اسکول کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ۳۰ لاکھ طالب علم اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ۱۰ لاکھ افراد جن میں ڈاکٹرز، انجینیرز، سائنس دان اور دوسرے افراد شامل ہیں، فنی تربیت حاصل کرتے ہیں تعلیم مفت ہے یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۹ء تک ہی ملک کے تمام باشندے لکھنے پڑھنے کے قابل ہو گئے تھے۔ اور کوئی جاہل نہیں تھا۔ ۱۹۷۶ء میں ملک کی تمام آبادی کم سے کم مڈل تک تعلیم حاصل کر چکی ہے۔ یعنی آٹھ سال کی تعلیم لے چکی ہے۔ اب کوشش کی جا رہی ہے کہ تمام آبادی گیارہ سال کی تعلیم حاصل کر سکے۔ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نظامِ تعلیم انقلابی بنیادوں پر استوار کیا گیا ہے۔ اس میں نظریاتی اور عملی تعلیم کے پہلوؤں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے عوامی اداروں اور ورکرز پارٹی کے یونٹوں کی سفارشات ضروری ہیں۔ تعلیم مفت ہے اور کتابیں بھی مفت مہیا کی جاتی ہیں کوئی فیس نہیں لی جاتی۔

روزگار

کوریا میں روزگار کے بے پناہ مواقع حاصل ہیں ہر آدمی اسکول سے فارغ ہونے کے بعد ملازمت حاصل کر سکتا ہے۔ چونکہ آزادی کی جدوجہد اور ۵۲ء کی جنگ میں مردوں کی بہت بڑی تعداد ماری گئی تھی اس لیے افرادی قوت کی کمی ہے۔ جس کو پورا کرنے کے لیے ہر مرد اور عورت کو روزگار مہیا کیا جاتا ہے۔ لیکن ۱۶ سال

سے کم عمر کے افراد نوکری نہیں کر سکتے۔ مردوں کے لیے ریٹائر منٹ کی عمر ساٹھ سال اور عورتوں کے لیے ۵۵ سال ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس سے قبل ریٹائر نہیں ہو سکتے۔ وہ جب چاہیں معقول وجوہ کی بنا پر ریٹائر ہو سکتے ہیں۔ ریٹائر منٹ کے بعد ان کو باقاعدہ پنشن دی جاتی ہے چونکہ کوریا میں عام لوگوں کی عمر بہت طویل ہے اس لیے پنشن کی عمر کے بعد اگر کوئی کام کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ البتہ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی وقت میں وہ نوکری کریں اور پنشن بھی لیں۔ اِن دونوں میں سے انہیں ایک کام کرنے کی اجازت ہے۔ یہاں مردوں اور عورتوں کی تنخواہیں برابر ہیں' اور ملازمت کی شرائط بھی ایک جیسی ہیں۔ ملازمت کے دوران سال میں مقررہ تاریخ تک کام کرنے والے اصحاب چھٹی پر جا سکتے ہیں۔ ملک بھر کے تفریحی مقامات پر مزدوروں کے ٹھہرنے اور آرام کرنے کے لیے ریسٹ ہاؤس بنائے گئے ہیں۔ جنکا کوئی کرایہ نہیں لیا جاتا اور غذا بھی مفت مہیا کی جاتی ہے۔ ان سالانہ رخصتوں کے علاوہ عورتوں کو زچگی کی خصوصی چھٹیاں بھی دی جاتی ہیں۔

مکانات کوریا میں مکانات کا کوئی مسئلہ نہیں ہے میرے لیے یہ بہت حیران کن بات ہے کیونکہ جاگیر دار اور سرمایہ دار ممالک میں رہائش کا مسئلہ عذاب بن چکا ہے اور غریب طبقہ سر چھپانے کو ترستا ہے۔ سوشلسٹ انقلاب کے بعد سے کوریا میں ہر خاندان کو مکانات مفت فراہم کئے جاتے ہیں۔ ان سے معمولی کرایہ تک نہیں لیا جاتا۔ عوام کو مفت تعلیم دینے' مفت مکانات فراہم کرنے کے علاوہ دی جانے والی چھٹیوں' اور مزدوروں' کسانوں کو جو بے شمار دوسری مراعات دی جاتی ہیں ایک اندازے کے مطابق تقریباً سات سے ۹ مہینے کی تنخواہ ان مراعات پر خرچ ہو جاتی ہے جب کہ حکومت محنت کار کی تنخواہ کا ۱/۲ حصہ کاٹتی ہے۔ یہ ۱/۲ حصہ بھی مکانات اور دوسری سہولتوں کے لیے مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ یہ

تمام تفصیلات نمائش کے ہال میں گھومتے پھرتے ہوئے ہمارے گائیڈ نے بتائیں۔ ہم تقریباً دو گھنٹے کے بعد جب نمائشی ہال سے باہر آنے لگے تو جاتے جاتے ہمیں مچھلی کے نمائشی تالاب دکھائے گئے اور بتایا گیا کہ کوریا کے دریاؤں اور سمندروں میں سات سو قسم کی مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔ جن میں سے چند ایک اقسام اعلیٰ ترین نسل کی ہیں جن کو ڈبوں میں بند کر کے یا منجمد کر کے دوسرے ممالک کو برآمد کیا جاتا ہے۔ مچھلی کے تالابوں میں جھانکتے ہوئے ہم باہر آئے تو ایک طرف ریل گاڑی کے پچیس سو ہارس پاور کے ڈیزل انجن پر ہماری نگاہیں مرکوز ہو گئیں۔ اس کے علاوہ یہاں کاریں، بسیں، گاڑیوں کے ڈبے، اسلحہ، دس ٹن، سو ٹن، دو سو ٹن وزن اٹھانے والے بھاری بھرکم ٹرک اور دوسرا فوجی نوعیت کا تیار کردہ سامان بھی ہمیں دکھایا گیا۔ اس وقت اچانک میری نگاہ گھڑی پر پڑی تو دن کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔ اور نمائش ہال میں پھرتے پھرتے ہم سب کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ لہذا جلدی جلدی مہمان خانہ میں کھانا کھانے کے لیے گئے۔ کھانے کی میز پر ڈاکٹر خالق، مسٹر کٹپر، سرحد کے مسٹر رزاق خان اور دوسرے دوستوں نے کوریا کے عوام کی عظیم انقلابی ایجادات اور سماجی تبدیلیوں کی زبردست تعریف کی اور پاکستان کے حالات کا ان سے موازنہ کیا۔ بیگم زاہدہ سلطان نے خواتین کے عظیم کارناموں پر تبصرہ کرتے ہوئے پاکستان کی خواتین کی پسماندگی اور بدحالی پر افسوس کا اظہار کیا۔ ہمارے درمیان موجود ملک مظفر حسین خان ایم این اے کالاباغ حیرت انگیز مصنوعات اور ایجادات کو دیکھ کر نہایت خاموشی سے کچھ سوچ رہے تھے۔ ہمارے مسلسل استفسار کے باوجود انہوں نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ غالباً وہ پاکستان میں ڈوبتے ہوئے جاگیرداری نظام کے عبرتناک نتائج کے بارے میں کچھ سوچ رہے ہونگے۔ سب دوستوں میں مسٹر عبدالوحید کٹپر زندہ دلی اور دیانت داری سے حالات پر تبصرہ کر رہے تھے۔ محمد بخش مجاہد اپنے

کیمرے کی ریل ختم ہونے اور بلوچستان کے سرداروں کے مظالم کا ذکر کرنے میں مصروف تھے۔ حنیف نارو بہاول پور کے ظالم جاگیرداروں کے جبر واستبداد کی داستانیں بڑے دکھ سے سنا رہے تھے۔ اور بیگم زاہدہ سلطانہ کو ترغیب دے رہے تھے کہ آپ بھی پاکستان جا کر اس بات کا پرچار کریں کہ ہمارے مسائل کا حل سوشلسٹ نظامِ معیشت میں ہے۔

جمناسٹک شو کھانا کھانے کے بعد ہم نے تھوڑی دیر اپنے کمروں میں آرام کیا اور ۳ ۱/۲ بجے پیانگ یانگ کے سٹیڈیم میں جمناسٹک شو دیکھنے چل پڑے۔ شو چار بجے شروع ہونا تھا لیکن ہماری گاڑیوں کا قافلہ پونے چار بجے سٹیڈیم پہنچ گیا۔ ہمیں استقبالیہ کمرے میں بٹھایا گیا کیونکہ ابھی تک وزیرِ اعظم پاکستان اور صدر کوریا تشریف نہیں لائے تھے۔ اس لیے استقبالیہ کے کمرے میں حسبِ معمول ہماری لذیز سیبوں اور ناشپاتیوں سے تواضع کی گئی۔ ہماری میز پر ایک خوبصورت ڈبے میں ٹافیاں، بسکٹ اور چاکلیٹ بھی پڑے تھے۔ جو ہم نے بڑی رغبت سے کھائے۔ کوریا کے چاکلیٹ نہایت عمدہ اور لذیز ہیں یوں لگتا تھا کہ یہاں چاکلیٹ کی صنعت کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ چاکلیٹ کھانے سے دانت خراب ہو جاتے ہیں۔ لیکن کوریا میں کسی ایک فرد کے دانت خراب دکھائی نہیں دیئے۔ قسم قسم کی نعمتیں کھلانے کے بعد سبز چائے پلائی گئی اور ہمیں استقبالیہ کمرے سے سٹیڈیم میں مخصوص نشستوں پر لا کر بٹھا دیا گیا۔ میری نشست کے بالکل پیچھے اونچی جگہ پر وزیرِ اعظم پاکستان صدر کوریا، پاکستان کے وفد کے سینئر اراکین اور کوریا کے وزراء، ممبران سنٹرل کمیٹی اور دوسرے اعلیٰ احکام کی سیٹیں تھیں۔ میری نشست کے دائیں بائیں پاکستان کے وفد کے دوسرے ارکان بیٹھے تھے۔ قرب وجوار میں دوسرے اعلیٰ احکام اور پارٹی کے سینئر ارکان تشریف رکھتے تھے۔ وزیرِ اعظم پاکستان اور صدر کوریا کی نشستوں کے بالکل ساتھ ساتھ مخصوص جگہ پر رکھا ہوا آرکسٹرا سٹیڈیم کی کھلی فضا میں دل کو لبھا دینے والے

انداز میں مدھر دھنیں بکھیر رہا تھا۔ کوریا کا یہ سٹیڈیم لاہور کے سٹیڈیم سے ملتا جلتا ہے جس کی تمام سیٹیں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ حاضرین میں سے اکثریت عوام کی تھی مگر فوج کے نوجوان طالب علم اور کوریا ورکرز پارٹی کے کارکنان بھی بھاری تعداد میں موجود تھے۔ بلا مبالغہ سٹیڈیم میں لاکھوں افراد جمع تھے۔ ہماری نشستوں کے بالکل سامنے والی سٹیڈیم کی پوری نشستیں یادگار اور پُرکشش منظر پیش کر رہی تھیں۔ ان نشستوں پر ہزاروں کی تعداد میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بیٹھے ہوئے تھے۔ جن کی گردنوں پر ہلکے گتّے کی سینکڑوں رنگوں اور مختلف سائز کی تختیاں کچھ اس طرح لٹکی ہوئی تھیں کہ ہزار کوشش کے باوجود ان لڑکوں اور لڑکیوں کے سر ہی نظر آ رہے تھے۔ سٹیڈیم کی ان لمبی چوڑی دیوار نما سیڑھیوں پر قطار اندر قطار کھڑے لڑکے لڑکیاں الٹے سیدھے زاویوں سے مختلف مناظر جلّے اور تصاویر بنا رہے تھے اور آرکسٹرا کی مدھر دھنیں کیف و سرور پیدا کر رہی تھیں اور لڑکے لڑکیوں کا یہ فنّی مظاہرہ رنگینیاں بکھیر رہا تھا۔ وہ رنگین تختیوں کو اس طرح الٹتے کہ ان کے چہرے چھپ جاتے اور اس کی جگہ پاکستان یا کوریا کا نقشہ بن جاتا۔ پاک کوریا زندہ باد کے نعرے لکھے جاتے یا ذوالفقار علی بھٹو زندہ باد اور صدر کم اِل سُنگ کے فوٹو اور بے شمار دلکش مناظر بن جاتے۔ فن کا یہ مظاہرہ اتنا حیرت انگیز، دلچسپ اور مسحور کُن تھا کہ وفد کے تمام اراکین ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہے تھے، ہر طرف رنگ لہراتے محسوس ہو رہے تھے۔ اور ان سے مختلف زاویوں سے بننے والی تصاویر اور نعروں کی فضا رنگین بن رہی تھی۔

یہ مظاہرہ جمناسٹک شو کا پہلا حصّہ تھا۔ اب ہماری نگاہیں سٹیڈیم کے درمیان زمین پر بیٹھے ہوئے ان دو اڑھائی ہزار لڑکے اور لڑکیوں پر پڑیں جنکے ہاتھوں میں خوبصورت جھنڈیاں اور پنکھا نُما چھوٹی چھتریاں پکڑی ہوئی تھیں۔



پیانگ یانگ کے سٹیڈیم میں جمناسٹک شو کے موقع پر لی گئی تصویر، صدر کم ال سنگ اور وزیراعظم بھٹو کھڑے ہو کر تالیاں بجا رہے ہیں۔

انہیں دیکھ کر محسوس ہو رہا تھا کہ خوشنما پھولوں کے پودے نیلی ہواؤں میں بکھر گئے ہیں۔ اتنے میں وزیرِ اعظم اور صدر کِم اِل سُنگ اپنی اپنی نشستوں پر تشریف لے آئے۔ اور سٹیڈیم تالیوں اور نعروں سے گونج اُٹھا۔ اس موقع پر سٹیڈیم میں موجود ہزاروں نوجوان لڑکے لڑکیوں نے لاکھوں غبارے چھوڑے جس سے سٹیڈیم کی فضا اِن رنگ برنگے غباروں سے رنگین ہو گئی اور ہر طرف بارات کا سماں پیدا ہو گیا۔ دونوں راہنماؤں نے جذبات میں آ کر تالیاں بجائیں تو سارے سٹیڈیم میں تالیوں کی دھم کی گونج بھر گئی، کئی منٹ تک تالیاں بجتی رہیں اور جب دونوں راہنما اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو تمام افراد منظّم طریقے سے خاموش ہو گئے۔ دوسرے ہی لمحہ آرکسٹرا بجانے والے ماسٹر نے میوزک کی دُھن بجائی اور سٹیڈیم کے عین وسط میں بیٹھے ہوئے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں رنگ برنگے کپڑوں، جھنڈیوں اور رنگ دار چھتریوں کے ساتھ رقص کرتے ہوئے جمناسٹک کے کرتب دکھانے لگے۔ یہ منظر اتنا پیارا اور دلکش تھا کہ پاکستانی وفد کے تمام اراکین جھوم جھوم اُٹھے۔ فوٹو گرافران ڈھیر سارے مناظر کو تصویروں میں محفوظ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ جمناسٹک کا یہ پہلا منظر تعارفی تھا۔ اس کا مقصد کوریا کے عظیم راہنما کِم اِل سُنگ کو خراجِ عقیدت پیش کرنا تھا۔ طائفہ نے کامریڈ کِم اِل سُنگ کو سلامی پیش کی۔ اس شو کے دوران سٹیڈیم کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے ہزاروں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنے گلے میں لٹکی ہوئی تختیوں کی مدد سے موضوع کے مطابق مختلف رنگ برنگے مناظر بنا رہے تھے۔

سوا چار بجے شو کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ تعارفی سلامی کے بعد یہ طائفہ منظّم طریقہ پر پریڈ کرتا ہوا مخصوص دروازے سے باہر چلا گیا اور چند لمحات کے بعد آرکسٹرا کی نئی دُھن پر سامنے سے نوجوانوں کا دوسرا دستہ فوجی انداز میں مارچ کرتا ہوا بڑی تیزی سے سٹیڈیم میں داخل ہوا اور قطاروں میں پھیل گیا۔ شو کے پہلے ایکٹ میں ورکرز پارٹی کی عظیم انقلابی روایات

کا منظر پیش کیا گیا۔ پہلے ایکٹ کے پہلے سین میں یہ بتایا گیا کہ کس طرح پارٹی کی انقلابی لائن "جُوچے" اصول کے تابع مرتب کی گئی۔ ابتدا میں تو ہمیں حرکات و سکنات کے معنی سمجھنے میں کافی دقت ہوئی مگر فراہم کردہ انگریزی کے لٹریچر جس میں مختلف مناظر کی تشریح اور وضاحت کی گئی تھی اور گائیڈز کی راہنمائی سے ہماری مشکل آسان ہو گئی۔ جمناسٹک کے بارے میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس کے مناظر فزیکل ڈانس سے مشابہ تھے۔ مگر ان مناظر میں سرمایہ داری نظام کی عشق و محبت کی داستانوں کے برعکس انقلاب کی تاریخ اور فلسفہ پیش کیا جاتا ہے اور بہادر سپاہیوں کی طرح عملی جدوجہد کا انداز اس کی فنی بنیاد ہے۔ ہم اس کو فوجی پریڈ، جمناسٹک اور فزیکل ڈانس کا مرقع بھی کہہ سکتے ہیں۔ سٹیڈیم کے درمیان یہ مظاہرہ جاری تھا۔ اور ہماری نشستوں کے بالکل سامنے گتے کی تختیوں کی مدد سے اس طائفہ کے ڈانس کے زاویوں کے مناظر جو صنعت و زراعت اور فنی تعلیم، فوج، اسلحہ اور دوسرے شعبوں سے متعلق تھے۔ انکو تصویروں اور مختلف رنگوں میں دکھایا جا رہا تھا۔ "جُوچے اصول" کے بارے میں کوریا کی ورکرز پارٹی کی تفصیلات آگے بیان کی جائیں گی۔ پہلے ایکٹ کے دوسرے سین میں جاپانی سامراج کے خلاف عوام کی جدوجہد اور عظیم کامیابی کی تاریخ بیان کی گئی۔ یہ سین ایک تیسرے گروپ نے پیش کیا۔ اس طرح تمام اگلے ایکٹ اور سین ہر نئے گروپ نے پیش کیئے۔ دوسرے ایکٹ جس میں صرف ایک سین تھا۔ اسمیں عوامی جمہوری انقلاب کی کامیابی اور تکمیل کا اظہار کیا گیا۔ تیسرے ایکٹ کے واحد سین میں جنگِ آزادی میں ورکرز پارٹی کی کامیابیوں اور مادرِ وطن پر سے سامراج اور جبر و استبداد کے منحوس سایوں کے ہٹ جانے پر مسرت کا اظہار کیا گیا۔ چوتھے سین میں سوشلسٹ انقلاب کی تکمیل کی جدوجہد کو مرحلہ وار سین میں دکھایا گیا۔ پانچواں ایکٹ بہت طویل تھا۔ اس میں انقلاب کے تین پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا۔ سامراج کی شکست، عوامی جمہوری ریاست

کا قیام اور سوشلسٹ انقلاب کی ابتداء، اس کے علاوہ نظریاتی اور سوشلزم کے فلسفے کا قلعہ تعمیر کرنے اور تمام معاشرے کو "جوچے نظریہ" کے مطابق مکمل تبدیل کر دینے کے عزم کا اظہار کیا گیا۔ پانچویں ایکٹ کے پہلے سین میں نظریاتی انقلاب، معاشرے کو انقلابی اور غیر طبقاتی، پارٹی اور عوام کو ناقابلِ تسخیر بنانے کے عزم اور اتحاد کی کوششوں کا منظر دکھایا گیا۔ دوسرے سین میں پارٹی کی لائن کے مطابق آزاد قومی اقتصادیات کی مہیا کردہ ٹھوس بنیادوں اور کامیابیوں کو دہرایا گیا اور یہ بتایا گیا کہ قومی اقتصادیات کے لئے ایک طاقتور اور سوشلسٹ ملک کے وجود کا تصور لازمی ہے۔ اس سین میں ایسے سوشلسٹ صنعتی ملک کی بنیادیں چار اصولوں پر استوار کرنے پر زور دیا گیا۔ وہ اصول یہ ہیں :-

(۱) خود اعتمادی اور خود انحصاری پر مبنی بھاری صنعت کا قیام

(۲) جدید چھوٹی اور درمیانی صنعت کا قیام (دیہی اصول)

(۳) کامریڈ کم اِل سُنگ کے معروف فلسفہ کے خوش آئند نتائج کا حصول

(۴) چوتھے اصول میں سائنسی بنیادوں پر جدید مچھلی کی صنعت کے وجود اور فروغ کو اہم قرار دیا گیا۔

واضح رہے، یہ نہایت پیچیدہ اور معنی خیز نظریاتی اور فلسفیانہ مناظر ایک طرف سٹیڈیم کے درمیان گراؤنڈ میں موجود لڑکے لڑکیاں جمناسٹک اور کلاسیکل رقص کی شکل میں پیش کر رہے تھے۔ دوسری طرف اڑھائی تین ہزار لڑکے اور لڑکیاں رنگین تختیوں کے ذریعے انکی تحریر اور تصویر کشی کر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے تحریریں حرکات میں ڈھل رہی ہیں اور انقلابی نظریات کے عملی تجربوں کے رنگ مہک رہے ہیں۔ جمناسٹک شو کوریا میں انقلاب کی مکمل تاریخ کا عملی نمونہ تھا اور نہایت ولولہ انگیز تھا۔ ایکٹ نمبر ۵ کے تیسرے سین میں ثقافتی انقلاب کا منظر دکھانے کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا کہ تمام معاشرے کو علم و ادب سے روشن کر کے

دانشورانہ صلاحیتیں کس طرح پیدا کی گئی ہیں۔ اس سین کے مزید تین حصّے تھے۔ پہلے حصّے میں عام تعلیم اور علم و ادب سے بہرہ ور ہونے کے مساوی مواقع فراہم کرنے کا منظر۔ دوسرے حصّے میں "جوچے" فلسفے کے مطابق عوامی فنون کے فروغ کی تاریخ اور فلسفہ بیان کیا گیا۔ تیسرے حصّے میں "جوچے" فلسفہ کے مطابق فزیکل کلچر اور نوجوان نسل کی صحت و تنظیم اور خوبصورتی برقرار رکھنے کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کو حرکات و سکنات اور رقص سے واضح کیا گیا۔ مجموعی طور پر جمناسٹک شو اور اسکے تمام مناظر "جوچے" اصول کے مطابق فنونِ لطیفہ اور فزیکل کلچر کے عملی اظہار کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ فنّی مظاہرہ حقوق کی جنگ کو احاطہ کیے ہوئے تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سوشلسٹ معاشرہ کے قیام تک ان امور پر عبور حاصل کرنا معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ چوتھے سین میں ترقی یافتہ سوشلسٹ نظام اور عوام کی ہر سطح پر خوشحالی، ترقی اور معاشرے کے ہر فرد کی مکمّل ذہنی، فکری، اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور روحانی خواہشات کی تکمیل کی تصویرکشی کی گئی۔ پانچویں سین میں کوریا کے عظیم عوام کی تمام تر کامیابیوں اور کامرانیوں کے باوجود گرفتہ دل دِکھایا گیا۔ جس کی وجہ شمالی اور جنوبی کوریا کی عارضی دُوری بتائی گئی۔ سین میں دونوں حصّوں کے اتحاد کی خواہش کو اجاگر کیا گیا تھا۔ چھٹے ایکٹ میں عوامی طاقت اور قومی آزادی کے دفاع کا ولولہ انگیز مظاہرہ کیا گیا۔

ان تمام فکر انگیز تاریخی اور یادگار مناظر کو دو، دو، اڑھائی اڑھائی ہزار لڑکیوں اور لڑکوں نے مخصوص انداز میں دکھایا۔ ہمارا خیال تھا کہ مختلف فنکار بار بار کپڑے بدل کر آرہے ہیں، مگر ایسا نہیں تھا۔ جمناسٹک شو کے اختتامیہ ایکٹ کا منظر دیدنی تھا۔ شو کے آغاز سے اب تک جتنے فنکار اپنے فن کا مظاہرہ کرچکے تھے۔ وہ حد درجہ منظم طریقے پر فوجی مارچ کرتے ہوئے اپنے اپنے دروازوں سے جمناسٹک کے گراؤنڈ میں جمع ہو گئے۔ ان کی تعداد کم از کم تیس ہزار ہوگی، فنکاروں کا یہ جمِ غفیر آرکسٹرا کی فضاؤں میں تیرتی ہوئی دھنیں، تالیوں، نعروں اور پریڈ کی مِلی جلی آوازیں ایک سماعت افروز منظر پیدا کر رہی تھیں۔ ان

لمحات کو شو کی تقریب کا نقطۂ عروج کہا جا سکتا ہے۔ اب تمام فنکاروں نے مل کر کوریا کے عظیم لیڈر کم اِل سنگ کی طویل العمری اور صحت و وزیرِ اعظم بھٹو کی صحت اور طویل العمری کے لئے خوش آئند تمناؤں کا اظہار کیا۔

اُن کے پیچھے بیٹھے ہوئے لڑکے لڑکیوں نے تختیوں کو اٹھا کر حاضرین کے بالکل سامنے پاکستان اور کوریا کے جھنڈے بنائے۔ اس طرح دو گھنٹے کے بعد نہایت انقلابی، دلکش اور پُرکشش اور منفرد جمناسٹک شو کا اختتام ہُوا۔ اس وقت شام کے سوا چھ بجے تھے۔ ہمیں ساڑھے سات بجے پیانگ یانگ کے نیشنل سنٹر میں "انقلابی اوپرا" دیکھنے جانا تھا۔ اس لئے جلدی جلدی ہم اپنے مہمان خانہ میں چلے گئے۔ جاتے جاتے ہماری نگاہ کوریائی عوام پر پڑی جو لاکھوں کی تعداد میں سٹیڈیم سے باہر آرہے تھے۔ کسی غل غباڑے کے بغیر نہایت خاموشی اور سلیقہ سے اپنے اپنے گھروں کو جارہے تھے۔ گیسٹ ہاؤس میں چائے کا کپ پینے کے لئے ہم لاؤنج میں بیٹھ گئے اور شو پر حسبِ عادت تبصرہ شروع ہوگیا۔ ہمارے وفد کے رجعت پسند افراد کا خیال تھا کہ یہ غیر جمہوری ملک میں عوام کو زبردستی منظّم کرنے کا نتیجہ ہے جو اتنا ڈسپلن نظر آتا ہے۔ میرے نزدیک یہ دوست سادہ لوحی اور علمی ناواقفیت کا اظہار کر رہے تھے۔ کیوں کہ میں نے لندن، پیرس، روم، میونخ، ہمبرگ اور یورپ کے دوسرے بڑے بڑے شہروں میں فنون کے مظاہرے دیکھے ہیں، ان میں کوئی شو بھی کوریا کے عوام کے اس شو کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے ایسے شو تو اور ہی ترنگ لئے ہوتے ہیں۔ اِن میں ننگے ڈانس، تھرکتی چھاتیاں، جھومتے نیم برہنہ جسم، جنسی قسم کے زاویئے اور گول مول نرم و سپید رانوں کی نمائش ہوتی ہے مگر اس شو میں عوام کی جدوجہد اور تاریخ کو دہرایا گیا تھا اور وفد کے سنجیدہ اور ترقی پسند حضرات اس شو سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے اس شو کو سوشلسٹ معاشرے کی فکری، سماجی، ذہنی اور ثقافتی آزادی کا درس قرار دیا۔ جب ہم چائے کی چسکیاں لگا چکے

تو اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر انقلابی "اوپرا" دیکھنے کے لئے نیشنل تھیٹر کی جانب عازم سفر ہوئے۔

اوپرا

نیشنل تھیٹر ہماری رہائش گاہ سے چار میل کے فاصلے پر تھا۔ تھیٹر کے دروازے پر محکمہ ثقافت اور فن کے اعلیٰ عہدیداروں نے ہمارا استقبال کیا۔ اور ہمیں لاؤنج میں بٹھانے کے لئے لے گئے۔ حسب دستور ہماری میزوں پر لذیذ ناشپاتیاں، سیب، بسکٹ اور چاکلیٹ رکھے ہوئے تھے۔ اور دوسرے ہی لمحے ہمارے سامنے میز پر چائے کی پیالیاں بھی آگئیں۔ میرے ساتھ والی میز پر چین میں پاکستان کے ملٹری اتاشی بریگیڈیئر محمد شفیع بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔ چاکلیٹ پیش کیا اور اس کے بعد آدھی ناشپاتی کاٹ کر میرے سامنے رکھ دی "اوپرا" شروع ہونے سے پہلے بریگیڈیر صاحب نے اس کی بے حد تعریف کی چونکہ وہ بہ یک وقت کوریا اور چین کے ملٹری اتاشی تھے اور پیانگ یانگ میں آتے رہتے تھے۔ اس طرح انہیں "اوپرا" دیکھنے کے مواقع میسر آتے رہے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ چینی زبان اچھی طرح جانتے ہیں اور کوریا کی زبان بھی سیکھ رہے ہیں، ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ہمارے گائیڈ نے ہمیں تھیٹر ہال میں جانے کو کہا اتفاق سے ہال میں بریگیڈیئر صاحب کے ساتھ والی سیٹ مجھے ملی۔ چند لمحوں بعد ٹیلی ویژن کیمروں کی روشنیاں بائیں طرف کے دروازے پر پڑنے لگیں جناب وزیر اعظم بھٹو اور صدر کم ال سنگ ہال میں داخل ہو رہے تھے دونوں راہنماؤں کا نعروں اور تالیوں سے زبردست استقبال کیا گیا۔ دونوں راہنما اپنی اپنی سیٹوں کی جانب بڑھے اور کافی دیر تک عوام کو ہاتھ ہلا ہلا کر ان کے استقبال کا جواب دیتے رہے۔

تھیٹر کا ہال گول تھا اس میں پانچ ہزار کے قریب نشستیں تھیں

درمیان میں اونچی نشستوں پر وزیراعظم بھٹو اور بیگم بھٹو، صدر، مادام کم ال سنگ تشریف فرما تھیں۔ ان کی پچھلی نشستوں پہ وفد کے سینئر اراکین، سفارت خانوں کے سربراہ، اعلیٰ حکام اور ورکرز پارٹی کے راہنما بیٹھے تھے۔ دائیں بائیں، سامنے اور پیچھے اوپر گیلریوں میں عوام کے طبقوں میں سے سپاہی، طالب علم، خواتین اور دوسرے افراد بیٹھے تھے۔ راہنماؤں کے بالکل سامنے ہی ذرا نیچے کی طرف قومی آرکسٹرا بج رہا تھا۔ اس کے بالکل سامنے بہت بڑا خوبصورت سٹیج لگا ہوا تھا۔ "اوپرا" شروع ہونے سے پہلے پاکستان اور کوریا کے ترانے بجائے گئے۔ اس کے بعد اوپیرا کا آغاز ہوا۔ اگرچہ اوپرا کوریا کی زبان میں تھا۔ مگر ہماری نشستوں کے بائیں طرف اور دائیں کونے میں بجلی کے بورڈ تھے۔ جن پہ علی الترتیب انگریزی اور کوریا کی زبان میں الفاظ بنتے رہتے تھے۔ اور ان کی مدد سے ہم "اوپرا" کے سینز کو مکمل طور پر سمجھ سکتے تھے۔ یہ الفاظ اتنی تیزی سے بدل رہے تھے کہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے فلم کی ابتدائی کاسٹ ریل چل رہی ہو۔ اس جدّت سے ہم خاصے محظوظ ہوئے اور راہنمائی حاصل کرتے رہے۔ ہم نے انقلابی "اوپرا" کا نام تو سنا ہوا تھا۔ مگر ابھی تک اسے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اس لیے تجسّس بھی کافی زیادہ تھا۔ جب "اوپرا" شروع ہوا تو ہم نے اسکا بغور جائزہ لیا۔ "اوپرا" اسٹیج ڈرامہ کی ایک قسم ہے فرق یہ ہے کہ مختصر سی کہانی مکالموں کی بجائے شعروں میں ترنم اور میوزک کے ساتھ بیان کی جاتی ہے، یعنی ڈرامہ کی وہ شکل جس میں میوزک اور گانا بھی اہم جزو ہوتا ہے۔ اس میں ڈانس بھی ہوتا ہے۔ مغربی ممالک میں "اوپرا" تھیئٹر کی مخصوص اور مقبول ترین پیشکش ہے۔ خاص طور پر اونچے طبقے کے لوگ "اوپرا" دیکھنا فخر خیال کرتے ہیں۔ یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں مستقل "اوپرا ہال" موجود ہیں۔ مگر سب سے مشہور "اوپرا" آسٹریا کے دارالخلافہ ویانا میں پیش کیا جاتا ہے۔ ویانا کے سالانہ موسیقی کے میلہ میں لوگ دور

دراز کے ممالک سے پورے تزک و احتشام اور تقدس کے ساتھ "اوپرا" دیکھنے آتے ہیں۔ اور اس کو مذہبی تہوار کی طرح سمجھتے ہیں۔ اس طرح لندن اور پیرس میں بھی بہت بڑے اوپرا کے میوزیکل شو ہوتے ہیں۔ ڈرامہ کی یہ شکل کافی پرانی ہے۔ تاہم روس کے انقلاب کے بعد سوشلسٹ ممالک کے ڈرامہ، اوپرا اور تھیٹر کے پرانے انداز میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مغرب میں ڈرامہ اور فلم کی طرح اوپرا میں بھی جاگیرداری، سامراجی اور سرمایہ داری نظام کی عشق و محبت کی دقیانوسی داستانیں بیان کی جاتی ہیں۔ اور فضول قسم کے دقیانوسی مزاحیہ منظر پیش کئے جاتے ہیں لیکن سوشلسٹ ممالک میں استحصال کے خلاف عوام کی جدوجہد اور محنت کشوں کی عظیم کامیابیاں "اوپرا" کا خاص موضوع ہوتی ہیں۔ خاص طور پر چین میں انقلاب کے بعد عوامی ادب اور ثقافت کے نئے رخ متعین ہوئے تو انقلابی "اوپرا" کو کھیتوں اور فیکٹریوں میں لے جایا گیا۔ جہاں اسے مزدوروں اور کسانوں میں زبردست مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

پیانگ یانگ میں جو "اوپرا" دیکھا اور جس کے دیکھنے کی ہمیں بڑی خواہش تھی۔ اس کی کہانی کا نام "کم گانگ سن کا گیت" تھا۔ "کم گانگ سن" ایک گاؤں کا نام ہے یوں اس کا عنوان ہوا "ایک گاؤں کا گیت" یہ ایک ایسے مصیبت زدہ خاندان کی کہانی تھی جو جاپانی سامراج کے تسلط کے زمانے میں ظلم و تشدد کا نشانہ بنا اور بے سروسامانی کی حالت میں اس کے افراد ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ اور ۲۰ سال کے بعد جب کامریڈ کم ال سنگ کی قیادت میں سوشلسٹ انقلاب برپا ہوا تو جدائی کی تاریک راتیں ملاپ کا سورج طلوع ہونے سے روشن ہوگئیں اور ان کے مصائب کی زنجیریں بھی کٹ گئیں۔ کہانی کا مضمون کچھ یوں ہے کہ ایک مختصر سا خاندان جو میاں بیوی اور ان کی ننھی بیٹی پر مشتمل تھا، "کم گانگ سن" گاؤں کے جنوب میں رہتا تھا۔ ہر طرف جاپانی سامراجیوں کے استحصال کا دور دورہ تھا مسٹر سو اک من اس کی بیوی میانگ ہیو

اور ننھی سُون ایک پہاڑ کے دامن میں جُوں تُوں دن گزار رہے تھے کہ ہواک من پر الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے ایک وڈیرے کے ایسے قطعۂ اراضی پر جھونپڑی بنائی ہے جس پر وہ بنگلہ تعمیر کرنا چاہتا تھا۔ جاپانی سامراج کی پولیس کے گماشتے اُسے گرفتار کر کے لے جاتے ہیں اور اِس طرح ہواک کو اپنی بیوی اور ننھی بیٹی سے جُدا کر دیا جاتا ہے۔

وہ سالہا سال کوریا کے شمالی علاقوں میں قید و بند کی صعوبتیں جھیلتا رہتا ہے۔ اِدھر اسکی بیوی اور معصوم بچّی بھری دنیا میں دربدر ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں اور ہواک مِن کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں مگر اسکا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ اس خاندان کی شبِ غم اس وقت ڈھل جاتی ہے۔ جب ۲۰ سال کے بعد سوشلزم کا سورج طلوع ہوتا ہے۔

——— ملک میں جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے۔ وہ سرزمین جہاں محنت کش عوام کا استحصال کیا جاتا تھا۔ کامریڈ کم اِل سُنگ کی عظیم قیادت میں سوشلزم کی جنت بن جاتی ہے۔ اور عوام اپنی سرزمین اور ملک کے حقیقی مالک بن جاتے ہیں۔ اور نئے معاشرے میں خوشحالی کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔ ہواک مِن کی بیوی سیبوں کے امدادِ باہمی کے ایک فارم کی لیڈر بن جاتی ہے۔ اس کی بچّی بھی فارم پر کام کرنے لگتی ہے۔ وہ بیحد حسّاس اور جفاکش ہوتی ہے۔ اُسے نغمہ نگاری اور ڈانس کے فن سے بھی لگاؤ ہوتا ہے۔ سُون بہت جلد فن کی بلندیوں پر پہنچ جاتی ہے اور کُم گانگ سُن کے علاقے میں بہت مشہور ہو جاتی ہے۔ اب ہواک مِن کی سنیئے۔

وہ جس آزاد علاقے میں رہ رہا ہوتا ہے وہاں اس کی کوریا کی عوامی انقلابی فوج کے کمانڈر سے مُلاقات ہوتی ہے۔ کمانڈر اسے انقلابی گیتوں کی ایک کتاب پیش کرتا ہے۔ ہواک مِن جو پہلے ہی موسیقی اور نغمہ نگاری کا ذوق رکھتا تھا۔ اس

کتاب سے متاثر ہو کر عوام اور ملک کے لئے گیت لکھنے لگتا ہے۔ اور ریاضِ فن کی بدولت جلد عوامی موسیقار اور شاعر کا مرتبہ حاصل کر لیتا ہے۔ اب وہ اپنی بیوی اور بچی کی جدائی کی ۲۰ سال کی طویل مسافت طے کرتے ہوئے کُم گانگ سُن میں آجاتا ہے۔ جہاں سوشلزم کی بدولت جنّت کا روپ دھار لینے والی سرزمین پر بصد فخر و انبساط اپنے فن میں مہارت حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اور اپنے عظیم شاہکار "کُم گانگ سُن کا گیت" کی تکمیل کرتا ہے۔ اور اس گیت کو پیانگ یانگ کے سالانہ آرٹ کے میلے میں خود کمپوز کر کے عوام کو سنانے کے لئے جاتا ہے۔ جس ڈرامہ میں یہ نغمہ نگار اور موسیقار کی حیثیت سے حصّہ لیتا ہے۔ اتفاق سے اِس ڈرامہ کی ہیروئن اس کی اپنی بیٹی "سُون" ہوتی ہے۔ ریہرسل کے دوران سون مگنولیا کا ڈانس کرتی ہے۔ جسکا موضوع ہوتا ہے "سواک مِن کی بیٹی بھی اب جوان ہو کر اتنی ہی خوبصورت ہو گئی ہو گی جتنا کوریا کا مشہور پھول مگنولیا ہے۔" ڈرامہ اسٹیج پر سُون کو علم ہو جاتا ہے کہ ڈرامے کی موسیقی اور گیتوں کا کمپوزر اس کا باپ ہے تو وہ فرطِ جذبات سے بے ہوش ہو جاتی ہے، اور سواک مِن اُسے گلے لگا لیتا ہے۔ اسکے بعد وہ گاؤں جاتے ہیں اور میانگ ہیو بھی مِل جاتی ہے۔ اس طرح ۲۰ سال کے بچھڑے ہوؤں کا ملاپ ہو جاتا ہے۔ اس "اوپرا" میں سوشلسٹ سسٹم میں اس کے لیڈر کے احترام، محنت کش عوام کی حقیقی حاکمیت، باپ بیٹی اور میاں بیوی کے فطری جذبات و احساسات اور ریاست میں عوام کی ذہنی آسودگی اور خوشحالی کو نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا۔ سٹیج پر اس کہانی پر مشتمل سات ایکٹ کا اوپرا دکھایا گیا۔ آغاز میں اوپرا کا ہیرو سواک مِن جو کہ کمپوزر ہے، کُم گانگ سُن گاؤں میں آتا ہے۔ اس گاؤں کی قدیم روایت کے مطابق آسمان سے پریاں اترتی ہیں۔ کمپوزر سواک مِن اپنے خیالات کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے، اور سوچتا ہے کہ وہ کس طرح اپنی محبوب بیوی سے ۲۰ سال کے لئے بچھڑ گیا۔ اس کے

بعد وہ اپنی بیٹی اور بیوی کی یاد میں یہ گانا گاتا ہے۔ "کُم گانگ سُن کی پہاڑیو! سُن لو کہ تمہارے ساتھ کس قدر عظیم روایات وابستہ ہیں۔ جن میں ایک یہ ہے کہ ایک ننھی لڑکی اپنے پیارے باپ کی تلاش میں دربدر پھر رہی ہے۔ اے کُم گانگ سُن! کیا یہ کہانی تیری عظیم روایات کا حصّہ بھی ہے؟ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ "سُن! اے میری پیاری لڑکی، میری ننھی بیٹی، میں تمہیں نہیں بھول سکتا۔ وہ لمحہ، وہ تلخ گھڑی جب مجھے تم سے علیحدہ کر دیا گیا اور تو مجھے جاتا ہوا دیکھ کر رو رہی تھی، پکار رہی تھی۔ میرے پیچھے تیری وہ پکار اب بھی اِن پہاڑیوں میں گونج رہی ہے۔" پھر وہ کہتا ہے۔ "اس معصوم لڑکی کی داستان کا ہیرو آج کُم گانگ سُن پہاڑی کا گیت لکھنے آیا ہے۔" جب سٹیج پر یہ گانا گایا جاتا ہے تو کُم گانگ سُن کی خوبصورت پہاڑیوں کے دامن میں گاؤں کی دوشیزائیں سوشلسٹ نظام کی خوشحالی میں کھیل کود رہی ہوتی ہیں اور گیت گا رہی ہوتی ہیں۔

پہلا ایکٹ

پہلا ایکٹ شروع ہوتا ہے اور کُم گانگ سُن گاؤں کی لڑکیاں ڈانس کرتی ہیں اور گیت گاتی ہیں اور بیش قیمت جڑی بوٹیوں کی تلاش میں جاتی ہیں۔ کمپوزر سواک من جو اپنی بچی اور بیوی سے بچھڑا ہوا ہے۔ سُنتا ہے کہ ان لڑکیوں میں سے ایک کا نام اس کی بیٹی سُون سے ملتا جلتا ہے۔ اس پر وہ اس لڑکی کی ماں، جو امدادِ باہمی کے فارم کی لیڈر ہے، اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔

دوسرا ایکٹ: اس میں سُون اور اس کی ماں دیہات میں اپنے جھونپڑے نما مکان میں بیٹھی ہیں۔ میانگ ہیو ماضی کے تصورات میں کھو جاتی ہے اور اس کی آنکھوں کے آگے وہ سارا نقشہ پھر جاتا ہے جب ۲۰ سال قبل جاپان کے سامراج کے گماشتے اس کے خاوند کو ایک وڈیرے کے

پلاٹ پر جھونپڑی تعمیر کرنے کے جھوٹے الزام میں گرفتار کرکے لے جاتے ہیں اور پھر وہ کبھی واپس نہیں آتا۔ وہ ماضی کی راکھ کرید رہی ہوتی ہے کہ اسے امدادِ باہمی کے فارم پر سٹڈی سرکل کی میٹنگ میں جانے کی یاد آجاتی ہے۔ وہ تصورات کی دنیا سے نکل کر میٹنگ میں چلی جاتی ہے کہ سواک مِن آتا ہے۔ سُون اس کو اپنی ماں کی جدوجہد کی تمام کہانی سناتی ہے۔ جسے وہ بڑے تجسس سے سنتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ سُون اس کی بیٹی ہے۔

تیسرا ایکٹ: یہ ایکٹ سیب کے باغات کے منظر سے شروع ہوتا ہے۔ سُون، سِواک مِن کو اس باغ میں لے جاتی ہے تاکہ اسے اپنی ماں سے ملا سکے۔ لیکن ان کے وہاں پہنچنے سے قبل ہی میانگ ہیو چلی جاتی ہے۔ وہاں پر گاؤں کی لڑکیاں گیت گا اور رقص کر رہی ہوتی ہیں اور عظیم لیڈر کِم اِل سُنگ کو خراجِ عقیدت پیش کر رہی ہوتی ہیں۔ ان مناظر سے سِواک مِن حد درجہ متاثر ہوتا ہے اور مزید گانے لکھتا ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ "کبھی اس پہاڑی کے دامن میں غربت اور افلاس اور آنسو بہانے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا لیکن آج یہ خطہ جنّت نظیر بن گیا ہے۔" اس کے بعد مِن ملک کے دوسرے صوبوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے چلا جاتا ہے۔ اس طرح میانگ ہیو سے اس کی ملاقات نہیں ہوتی۔

چوتھا ایکٹ: سُون اپنے گھر میں زندگی کے پُر شباب پُر کیف، فنکارانہ شہرت کے عروج، کوریا کے محنت کش عوام کی خوشحالی اور ترقی سے سرشار ماحول میں خوش خوش بیٹھی ہے کہ گاؤں کے دوسرے افراد اس کو ملنے آتے ہیں۔ کیوں کہ آج اسے صوبے کے سالانہ میوزک شو میں حصہ لینے کے لیے جانا ہوتا ہے۔ اسی روز سون کی ماں اپنی بیٹی کے منگیتر چنگ سُو کو ایک بنسری دیتی ہے۔ جسے کسی زمانے میں اس کا خاوند بجایا کرتا تھا۔ وہ اسے نصیحت کرتی ہے کہ اس بنسری کو اپنی جان سے بھی زیادہ

عزیز رکھے اور اس کی ہر ممکن حفاظت کرے ۔ ساتھ ہی میانگ ہیو جواں سال جنگ سو کو اپنی پارٹی اور لیڈر کی مکمل وفاداری کا درس دیتی ہے جس کی انتھک کوششوں سے ان کو خوشیاں اور کامیابیاں نصیب ہوئیں ۔

پانچواں ایکٹ : دوسرے صوبے کے شہر جو کہ خوبصورت سمندر کے ساحل پر واقع تھا، میں فنکاروں کا دستہ ریہرسل کرتا ہوا دکھایا گیا تھا۔ اس ریہرسل میں کمپوزر سواک مِن کوریا کے مقبول ڈانس مگنتو لیا کی بھی پریکٹس کرتا ہے اس ایکٹ میں سُون اور آرٹ سرکل کے دوسرے ممبران جو کہ کُم گانگ سُن گاؤں سے تعلق رکھتے تھے سواک مِن سے اس کی درد بھری کہانی سنتے ہیں کہ کس طرح اس کو جاپانی سامراج کے گماشتے گرفتار کر کے لے گئے اور وہ اپنے بال بچوں سے بچھڑ گیا پھر ۲۰ سال کے بعد گاؤں میں واپس آیا اور کُم گانگ سُن کی پہاڑیوں کے خوبصورت مناظر کے گیت لکھتے لکھتے وہ مشہور و معروف کمپوزر بن گیا ۔ اپنی داستان سناتے ہوئے سواک مِن اچانک اپنے تصورات میں کھو جاتا ہے اور سامنے مناظر بکھر جاتے ہیں ۔ دکھایا جاتا ہے کہ جب وہ اپنی جدوجہد کے دوران ایک مقام پر چھپا ہوتا ہے تو جاپانی سامراج کی پولیس کے گماشتے اس کو گھسیٹ کر لے جاتے ہیں اور اس کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ جاپانی فوج کے گیت گائے جب وہ انکار کر دیتا ہے تو اس کو زبردست تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے جاپانی سامراج سے لڑنے والی کوریا کی انقلابی فوج کے سپاہیوں کو اس کا پتہ چلتا ہے اور وہ سواک مِن کو آزاد کروانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ۔ یہ سپاہی سواک مِن کو عوامی انقلابی فوج کے ایک سپاہی کے انقلابی گیتوں کا مجموعہ پیش کرتے ہیں ۔ وہ اس کتاب سے متاثر ہو کر انقلاب کا راستہ اختیار کر لیتا ہے ۔ سواک مِن جب یہ کہانی سنا رہا ہوتا ہے تو جواں فنکارہ سُون کو فوراً یہ خیال آتا ہے کہ اس کے باپ کو بھی میوزک اور گیتوں سے گہرا شغف تھا یہ یاد آتے ہی اس کی محبت جوش مارتی ہے اور وہ اپنے باپ کی یاد میں آنسو بہاتے

ہوئے سمندر کے ساحل کی طرف دوڑ جاتی ہے، سُون کے اس عجیب وغریب رویہ پر سواک بہت متعجب ہوتا ہے اور اس پر حیرت کا اظہار کرتا ہے۔

چھٹا ایکٹ : کِم گانگ سُن گاؤں کے فنکار انقلابی حکومت کے دارالخلافہ پیانگ یانگ میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے آتے ہیں اور ایک چبوترے پر کھڑے ہو کر گانا گاتے ہیں۔ سون ایک ایسا گانا گاتی ہے جو کسی زمانہ میں کم گانگ سن گاؤں میں سِواک مِن نے کمپوز کیا تھا۔ پاس ہی کھڑا ہوا نوجوان چُنگ شُو جو سُون کا منگیتر ہے سُن کو گانے کا پس منظر بتاتا ہے اور اس کو بنسری بھی دکھاتا ہے۔ جو اسے سُون کی ماں نے دی تھی۔ سَواک پہچان لیتا ہے کہ جس بیٹی کی تلاش میں اس نے ۲۰ سال تک حالات کے اندھے غاروں میں انتظار کی شمعیں جلائیں وہ سون ہے چونکہ ابھی ڈرامہ سٹیج کیا جا رہا تھا۔ اس لئے سِواک چنگ شُو سے التماس کرتا ہے کہ وہ شو کے اختتام تک سون کو اس بات کا پتہ نہ چلنے دے کہ وہ اس کا باپ ہے۔

ساتواں ایکٹ : پیانگ یانگ کے تھیٹر میں کِم گانگ سُن کے آرٹ سرکل کے نوجوان فنکار اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس کے اختتام پر سِواک مِن سون کو شدتِ جذبات میں آکر گلے لگا لیتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ اس کی بیٹی ہے جس کو وہ ۲۰ سال سے تلاش کر رہا ہے۔ اختتامیہ میں سواک مِن سمیت تمام فنکار سالانہ میلے سے واپس اپنے گاؤں کِم گانگ میں داخل ہوتے ہیں۔ گاؤں کے دروازے پر سِواک مِن اپنی بیوی میانگ ہیو سے آکر ملتا ہے اور گانا گاتا ہے کہ کس طرح میانگ ہیو نے بے تابی سے اس کی واپسی کا مدتوں انتظار کیا ہے۔ اس عرصہ میں کن مشکلات کے ساتھ اس کی بیوی نے اپنی بیٹی کی پرورش کی ہے۔ اس کی بیوی جواب میں گاتی ہے کہ "میں نے اتنے سال اس خوشی کے لمحے کے لیے انتظار کیا ہے اور اس عرصہ میں میں نے اپنی بیٹی کی پرورش اپنی پارٹی کی محبت اور خلوص کے سہارے کی ہے۔ پھر وہ

کہتی ہے کہ "جن دنوں ہم ساتھ رہتے تھے۔ ہمارا کوئی ملک نہ تھا یہاں تک کہ دور دراز ویران اور بیابان پہاڑیوں پر بھی ایک جھونپڑی ہمارے رہنے کے لیے نہیں تھی۔ اب لیڈر کی بے پناہ محبت شفقت اور تحفظ میں طویل عرصہ کے بعد ہمارے خاندان کا پُر مسرت فضاؤں میں سنگم ہو گیا ہے"۔ اس کے بعد اوپرا کے تمام فنکار سٹیج پر آتے ہیں اور اپنے عظیم لیڈر کم اِل سُنگ کی طویل العمری اور صحت کے گیت گاتے ہیں۔ یوں شو کا اختتام ہوتا ہے۔ اوپرا کا آخری منظر نہایت دل آویز اور پُر کشش تھا۔ وزیرِ اعظم بھٹو اور صدر کم اِل سُنگ اپنی نشستوں سے اُٹھ کر سٹیج پر چڑھ گئے اور فنکاروں کے درمیان کھڑے ہو کر تالیاں بجا بجا کر ان کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ اور وزیرِ اعظم و بیگم بھٹو کی طرف سے سٹیج پہ ایک بہت بڑی ٹوکری جس میں فنکاروں کے لیے گراں قدر تحفے تھے لائی گئی یہ ٹوکری دو خوبصورت لڑکیاں اٹھا کر لائیں جو کوریا میں پاکستان کے سفیر کی صاحبزادیاں تھیں۔ شو کا اختتام ہوا اور ہم سب اس عظیم انقلابی پیشکش کو اپنے ذہنوں میں سمیٹتے ہوئے کاروں میں بیٹھ کر مہمان خانہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ رات کے تقریباً ساڑھے دس بج چکے تھے رات کا کھانا مہمان خانہ کے ہال میں کھایا۔ ہمارے وفد کے اکثر اراکین کھانے کے وقت اوپرا کی خوبصورت پیشکش کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ وہ حضرات جنہوں نے دوسرے ممالک میں ایسے شو دیکھے ہیں ان کی رائے تھی کہ یہ شو مشہور زمانہ "دیانا اوپرا" شو سے کسی صورت کم نہیں، بلکہ انقلابی نقطۂ نظر سے اپنی نوعیت کی منفرد پیشکش ہے۔ چونکہ یہ اوپرا اتنا متاثر کن اور انقلابی تھا کہ رات کے کھانے کا ماحول جو اکثر غیر سنجیدہ ہو جاتا تھا۔ آج خلافِ معمول سنجیدہ تھا اور کھانے کی میز پہ اوپرا سے متعلق فکر انگیز تبصرے ہو رہے تھے۔ ہمارے سخت اصرار پہ ماحول کو ہلکا پھلکا بنانے کے لیے کٹپر صاحب نے سکھوں کے زوردار لطیفے سنائے اور محمد بخش مجاہد صاحب نے اپنے

ہانگ کانگ کے زمانے کے قیام کے رومان انگیز ایک دو واقعات سنائے جس سے ہال میں چند ایک قہقہے گونجے۔ اس طرح ہم دوست اپنے دورے کا مصروف ترین دن گزارنے کے بعد اپنے اپنے کمروں میں تھکے ماندے لیٹ گئے۔ اور نیند کے مزے لینے لگے۔

کمِ ال سُنگ کا آبائی گاؤں

۲۳ مئی ۱۹۷۶ء

صبح ہم آٹھ بجے کے قریب اٹھے اور نہا دھو کر ناشتہ کیا۔ اس روز ہمیں زرعی فارم دیکھنے جانا تھا۔ ساڑھے دس بجے ہوں گے کہ ہمارا قافلہ روانہ ہوا آج کے وفد میں وزیر اعظم بھٹو اور مسٹر عزیز احمد کے علاوہ وفد کے سیاسی اراکین، اخباری نمائندے اور دوسرے تمام اہم ممبران شامل تھے۔ شیخ رشید صاحب ہمارے وفد کی قیادت کر رہے تھے۔ ہماری گاڑیاں تمام شہر اور ایک شاہراہ سے گزرتی ہوئی دیہات کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ راستے میں شہر کی بلند بانگ عمارتیں اور کئی منزلہ فلیٹس کے علاوہ شہر کے باہر چھوٹے چھوٹے مکان، ڈھلوانی جھونپڑیوں کی شکل میں دکھائی دے رہے تھے۔ جو انقلاب سے پہلے کے تھے۔ اب کافی صاف ستھرے اور جدید سہولتوں سے آراستہ تھے۔ ہر مکان میں بجلی اور پانی کے نکاس کا انتظام اور غسل خانے وغیرہ صاف نظر آرہے تھے۔ اگرچہ ان مکانوں کی چھوٹی کھڑکیاں اور دروازے پرانی طرز کے تھے۔ مگر ان پر

خوبصورت پردے لٹکتے دکھائی دے رہے تھے۔ انکی جھونپڑی نما شکل وصورت اصل میں پرانی طرز کی بدولت تھی۔ ان مکانوں میں مزدور اور کسان رہتے ہیں۔ جو اپنے کام والے کپڑے پہن کر نزدیک ہی کھیتوں میں کام کر رہے تھے یا فیکٹریوں سے آجا رہے تھے۔ ان مکانات کے اردگرد صاف ستھرے پھول جیسے بچے اور بچیاں کھیلتے کودتے اور تعلیمی مراکز سے باہر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان چھوٹے علاقوں کے آس پاس کام کیساتھ ساتھ تعلیم، صحت اور دوسری سہولتوں کے مراکز بھی موجود ہیں ایک خاص بات جو دیکھنے میں آئی وہ یہ تھی کہ سڑکوں پر نجی گاڑیاں تو ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سرکاری گاڑیاں بھی بہت کم نظر آرہی تھیں۔ صرف وہ گاڑیاں، جو ضروری اشیاء کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں کھڑی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کوریا اور دوسرے سوشلسٹ ملکوں میں عوام کی رہائش ان علاقوں میں رکھی جاتی ہے جہاں ان کا کام کاج ہوتا ہے۔ اس سے قوم کو کروڑوں اربوں روپے ٹرانسپورٹ اور دوسرے اخراجات کی بچت ہوتی ہے اور آنے جانے میں جو وقت ضائع ہوتا ہے وہ بھی بچ جاتا ہے۔ میں نے اپنے گائیڈ سے پوچھا کہ کیا بھاری اشیاء کو ملک کے کسی دوسرے حصے میں منتقل کرنے کے لیے ٹرک اور بھاری گاڑیاں استعمال نہیں کی جاتیں کیونکہ سڑک پر کوئی گاڑی وغیرہ نظر نہیں آرہی اس نے بتایا کہ ایسی گاڑیوں کے لیے مخصوص ٹریکس ہیں اور مخصوص اوقات میں ان کی نقل وحمل ہوتی ہے۔ زیادہ تر یہ گاڑیاں رات کو ضروری سامان منتقل کرنے کے لیے چلتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ٹریفک کا کوئی مسئلہ نظر نہیں آرہا تھا۔ ہمارا قافلہ آہستہ آہستہ بڑی شاہراہوں کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ دونوں طرف دھان کے کھیت تھے۔ جن میں چھوٹی چھوٹی زرعی مشینیں پنیری لگا رہی تھیں۔ بعض کسان ہاتھوں سے پنیری لگا رہے تھے۔ ٹریکٹر بھی کھیتوں میں

گھوم رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہماری گاڑیاں دریا کے ساتھ واقع شاہراہ پر دوڑنے لگیں اور پھر ایک دم ہم سرسبز و شاداب چھوٹی سی پہاڑی کی طرف مڑ گئے۔ یہ پہاڑی نما گھنے اور پھل دار درختوں، گا بانیچپ کامریڈ کم اِل سُنگ کے آبائی گاؤں کا ایک حصّہ تھا۔ انقلاب کے بعد اس کو خوبصورت طریقے سے آراستہ کیا گیا تھا۔ ان گھنے درختوں کے درمیان میں ایک جھونپڑی نما پرانا سا گھر واقع ہے یہ جھونپڑی نما گھر سرکنڈے، لکڑی اور پتھر سے بنا ہوا ہے۔ اس کا ڈیزائن اور شکل وصورت ملتان اور بہاولپور کے دیہات میں کسانوں کے گھروں کی جو نسا ہل نہیں ان سے ملتا جلتا تھا۔ یہاں پر وفد کے تمام اراکین کو اتار دیا گیا تاکہ ان کو کم اِل سُنگ کے آبائی گھر کے بارے میں بتایا جا سکے یہاں کم اِل سُنگ کے دادا اور دادی ۱۹۶۲ء تک رہتے رہے اور کھیتی باڑی کرتے رہے۔ گائیڈ نے بتایا کہ یہ جھونپڑی معمولی مرمت کے علاوہ بالکل اصل شکل میں محفوظ ہے کامریڈ کم اِل سُنگ کے والد صاحب اور والدہ محترمہ انقلابی جدوجہد کے دوران مارے گئے تھے۔ ان کے دادا کا بھائی بھی انقلابی منزل میں مارا گیا۔ ان کے دادا ایک بڑے زمیندار کی زمین پر کاشت کرتے تھے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ جنگ آزادی میں انقلابیوں کی امداد بھی کرتے رہے۔ بے شمار انقلابی یہاں سے گزرتے اور رات کو ٹھہرتے۔ اس گھر سے کھانا اور دوسری زندگی کی ضروریات کی چیزیں ملتی رہتیں اور انقلابیوں کو یہاں سے چیزیں بھیجی بھی جاتی تھیں۔ گویا یہ جھونپڑی ایک انقلابی پناہ گاہ اور مرکز بھی تھا۔

ان کے دادا کی انقلاب دوستی کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہوتا ہے کہ بچپن کے زمانہ میں جب جاپانی سامراج سے تنگ آ کر کامریڈ کم اِل سُنگ چین کے صوبہ منچوریا میں چلے گئے اور تیرہ چودہ سال کی عمر میں اپنے گاؤں واپس آئے تو ان کے دادا نے کہا اگر تمہیں کوریا میں انقلاب لانا ہے تو اس کی سرزمین کو جاننا اور پہچاننا



ہوگا چنانچہ اس کے بعد کامریڈ منچوریا واپس نہ گئے اور چودہ پندرہ برس کی عمر میں ملک کی آزادی کے لیے فوج میں بھرتی ہو گئے۔ اور بندوق اٹھالی۔ آخر کار بیس سال کی جدوجہد کے بعد ملک کو آزادی نصیب ہوئی۔ گائیڈ نے ہمیں بتایا کہ انقلاب کے بعد کم اِل سُنگ اپنے اس گاؤں میں آئے ان کے دادا نے اصرار کیا کہ "اب تم سربراہ مملکت ہو، تمہارے شایانِ شان ہمارے پاس رہائش نہیں ہے۔ لہٰذا تم یا تو کسی ریسٹ ہاؤس میں چلے جاؤ یا قصرِ صدارت میں رہا کرو"۔ اس پر کامریڈ نے کہا کہ وہ یہ رات اپنی آبائی جھونپڑی میں گزاریں گے۔

چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اپنی جھونپڑی میں چٹائی پر سوئے۔ انقلاب کے بعد صدر کم اِل سُنگ کے دادا اور دادی کو ترغیب دی گئی کہ چونکہ ان کا پوتا صدرِ مملکت بن گیا ہے۔ لہٰذا وہ کھیتی باڑی چھوڑ دیں انہوں نے جواب دیا کہ میرے بیٹے کا پیشہ حکومتی عہدہ ہوگا لیکن میرا پیشہ کھیتی باڑی ہے چنانچہ کم اِل سُنگ کی دادی اور دادا نہایت صحت مند رہے اور کھیتی باڑی کرتے رہے اب اتنا فرق پڑ گیا کہ وہ انقلاب سے پہلے بڑے جاگیردار کی زمین پر مزارع ہوا کرتے تھے۔ مگر انقلاب کے بعد اجتماعی کھیتی باڑی کے تحت قوم کی خدمت کرتے رہے۔ اس جھونپڑی میں پانچ چھ کمرے خاصے بڑے تھے، لمبے کمرے میں میز، چٹائیاں اور ایک لکھنے پڑھنے کا چھوٹا سا ڈیسک رکھا تھا جس پر زمین پر بیٹھ کر لکھا جا سکتا تھا لکھائی کے لیے دوات قلم اور دوسری اشیا بھی رکھی ہوئی تھیں کچھ چھوٹی بڑی لکڑی کی استعمال کی چیزیں بھی موجود تھیں۔ غالباً یہ بیٹھنے اٹھنے اور لکھنے کا کمرہ تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ یہاں رہنے والے بستر استعمال نہیں کرتے تھے اور چٹائی پر سوتے تھے۔ ساتھ والے کمرے میں تقریباً اسی قسم کا سامان تھا۔ یہ دونوں کمرے لکھنے پڑھنے، اُٹھنے بیٹھنے اور سونے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ ان دونوں کمروں کے ساتھ بڑا کمرہ جو کافی بڑا تھا۔ کچن اور ڈرائنگ روم کا کام دیتا تھا۔ اس میں بھی نیچے بیٹھنے کی چند ایک سٹول کی طرح کی چیزوں کے علاوہ

بیشمار چھوٹے بڑے تانبے اور لوہے کے برتن اور باورچی خانے کی ضروریات کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ چیزیں کم و بیش اصلی شکل میں محفوظ کی گئی ہیں۔ ان تین کمروں کے آمنے سامنے دو اور کمرے تھے۔ جن میں ایک کافی بڑا تھا اور دوسرا ذرا چھوٹا تھا۔ بڑے کمرے میں کسانوں کی روزمرہ کی استعمال کی چیزیں اور سامان پڑا تھا جن میں ایک ہل بھی تھا جو پاکستان کے پرانے ہل سے ملتا جلتا تھا۔ اور قدیم زمانے کے زرعی آلات رکھے تھے۔ اسی کمرے میں کپڑا بنانے کی دستی کھڈی جو کہ ہمارے جلاہوں کی کھڈی سے ملتی جلتی ہے، رکھی ہوئی تھی۔ جوتی گانٹھنے کے اوزار، سوئیاں بنانے کی مشین اور دیہی زندگی کی ضروری اشیاء پڑی ہوئی تھیں۔ ساتھ کے چھوٹے کمرے میں بڑے بڑے لوہے اور مٹی کے مٹکے پڑے تھے۔ جو غالباً زرعی اجناس کو سٹور کرنے یا پانی جمع کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ ان دونوں کمروں کے درمیان ذرا پیچھے ہٹ کر ایک جھونپڑی نما (کھرلی) تھی جس پر گائے باندھی جاتی تھی۔ یہ ناند اتنی بڑی تھی کہ اس پہ ایک سے زیادہ جانور باندھے جا سکتے تھے۔ اس سارے گھر کی چھتیں بہت موٹے سرکنڈے کے چھپر سے بنی ہوئی تھیں، دیواریں مٹی اور پتھر کی بنی ہوئی تھیں مگر کافی نیچی تھیں کمروں کی چوڑائی بھی بہت کم تھی۔ کھڑکیاں اور روشن دان بالکل نہیں تھے۔ لکڑی کی چند چیزیں اور چٹائیوں کے علاوہ چارپائیاں یا دوسرا کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ وفد کے اراکین مکان کی تفصیلات اور صدر کم اِل سُنگ کے انقلابی خاندان کے کارہائے نمایاں سن کر انتہائی حیرت زدہ تھے یہ سارا منظر دیکھنے کے بعد وفد کے تمام اراکین جھونپڑی کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ تاکہ ایک گروپ فوٹو لیا جا سکے گروپ فوٹو لیا گیا۔ پھر ہم اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر اپنی اگلی منزل فیکٹری کی جانب روانہ ہو گئے۔

ٹریکٹر فیکٹری : ٹریکٹر فیکٹری کِم اِل سُنگ کے آبائی گاؤں سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلے پہ واقع تھی حسبِ معمول ہمارا قافلہ ان راستوں سے گزر

رہا تھا۔ جہاں سڑک کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے دیہات واقع تھے۔ جن کے مکانات نہایت صاف ستھرے تھے اور کسان کھیتی باڑی کرنے میں مصروف نظر آرہے تھے۔ جگہ جگہ راستے میں ننھے بچے اور بچیاں خوبصورت لباس پہنے اپنے گلے میں بستے لٹکائے ہوئے سکول سے واپس آتے دیکھ کر یک گونہ خوشی کا احساس ہوتا تھا۔ ان بچوں کا مخصوص یونیفارم تھا جو بالکل پیانگ یانگ شہر کے بچوں جیسا تھا۔ بعض جگہوں پر چھوٹے بچے کھیتوں میں معمولی نوعیت کا کام کرتے نظر آرہے تھے۔ کچھ بچے پھلوں اور پھولوں کے پودوں کو ہاتھ میں بالٹیاں اٹھائے پانی دے رہے تھے۔ اور کچھ چھوٹے بچے دستی اوزاروں سے ان پودوں کی گوڈی کر رہے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ بچے اجتماعی فارم کے ممبران کے بچے ہیں اور وہ فارغ اوقات میں فضول کھیل کود کی بجائے اجتماعی فارم کی پیداوار کو بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔ تقریباً آدھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہماری گاڑیاں ایک چھوٹے سے قصبے کی طرف مڑیں اور پھر ایک بہت بڑی فیکٹری کے دروازے پر آکر رک گئیں۔ یہاں سے وفد کے تمام اراکین، شیخ محمد رشید کی قیادت میں فیکٹری کی انقلابی کمیٹی کے چیئرمین کے ہمراہ فیکٹری کے اندر مختلف شعبوں کو دیکھنے کے لیے داخل ہوئے ہمارے اندر داخل ہوتے ہی فیکٹری کے تمام کارکنوں نے نہایت گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ کارکنوں میں نوجوان لڑکیاں بھی شامل تھیں جو نہایت خود اعتمادی سے کام کرنے والا لباس پہنے ہوئے اپنی اپنی مشینوں پر مصروفِ کار تھیں۔ انقلابی کمیٹی کے چیئرمین نے یکے بعد دیگرے فیکٹری کے تمام شعبوں کا تعارف کرایا اور پرزہ جات تیار کرنے کا عملی مظاہرہ کر کے دکھایا۔ یہ فیکٹری ہزاروں مربع فٹ کے رقبے میں ہے اور بہت بڑی مشینیں، ٹریکٹر کے مختلف پرزہ جات اور اجزاء کی تیاری کے مختلف مراحل یہاں طے کیے جاتے ہیں۔ آخری منزل جس میں ٹریکٹر کے پرزے آپس میں جوڑ کر

ایک مکمل ٹریکٹر بنا دیا جاتا ہے' کا طریق کار بھی ہمیں سمجھایا گیا۔ آخر میں ہمیں فیکٹری کے اس کمرے میں لے جایا گیا۔ جہاں پر ٹیلی ویژن کے ذریعے فیکٹری کے تمام شعبوں کا معائنہ کیا جا سکتا تھا اس کے دوسرے دروازے سے ہمیں تیار شدہ ہزاروں ٹریکٹر دکھائے گئے۔

یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد وفد کے تمام اراکین کو چیئرمین انقلابی کمیٹی کے دفتر میں بلایا گیا۔ یہاں پر ہمیں ایک بہت بڑے لاؤنج میں بٹھا دیا گیا۔ حسب دستور ہماری میزوں پر ناشپاتیاں اور سبز چائے رکھی ہوئی تھی۔ چائے وائے سے فارغ ہوئے تو ترجمان کی وساطت سے چیئرمین انقلابی کمیٹی نے ہمیں فیکٹری کے تاریخی پس منظر اور فنی پہلوؤں سے روشناس کرایا۔ انہوں نے بتایا کہ انقلاب سے پہلے یہ فیکٹری صرف معمولی قسم کے زرعی آلات کا کارخانہ تھا۔ انقلاب کے بعد انقلابی راہنما کامریڈ ماؤ زے تنگ نے اپنے انجنیئرز سے کہا کہ ہمارا ملک زرعی ہے اور زرعی مشینری کی تیاری کے بغیر ہماری ترقی ناممکن ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ زرعی ملک کی حیثیت سے ہم دوسرے ممالک سے ٹریکٹر برآمد کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے ماہرین کو ہدایت کی کہ وہ اپنی تمام تر فنی استعداد اور صلاحیتیں ٹریکٹر اور دوسری زرعی مشینری کو تیار کرنے کے لیے وقف کر دیں۔ چنانچہ صرف ایک ٹریکٹر غیر ممالک سے منگوایا گیا۔ ماہرین نے اس کے پرزہ جات کو اکھیڑ کر اپنے ٹریکٹر کے ڈیزائن کی تیاری شروع کی۔ اس تیاری کے لیے قومی جذبے، خدمت اور کامریڈ ماؤ زے تنگ کی ہدایات پر عمل کرنے کے ساتھ فرض شناسی کو بنیاد بنایا گیا اور "جوچے اصول" کے مطابق خود اعتمادی، خود انحصاری اور خود کفالت کے پہلوؤں کو مد نظر رکھا گیا۔ چنانچہ ۳۵ دن میں پہلے ٹریکٹر کا ڈیزائن تیار ہو گیا اور ۱۹ نومبر ۱۹۵۸ء کو ٹریکٹر مکمل کر لیا گیا۔ ابتدا میں ٹریکٹر کا ایکسل تیار نہ ہو سکا۔ کیونکہ اس کی تیاری کی مشین موجود نہیں تھی۔ چنانچہ ایکسل کی بجائے خاص قسم



کوریا کی جنگی موٹروں کی فیکٹری میں شیخ رشید اور وفد کے دوسرے اراکین فیکٹری کے اندرونی حصے کو دیکھ رہے ہیں

کے رستے اور لٹھ استعمال کیے گئے۔ بعد میں مشین تیار کر لی گئی اور اس سے ایکسل تیار کر لیا گیا۔ ٹریکٹر کی تیاری کے تمام مراحل کی تکمیل تک کم اِل سنگ کئی مرتبہ فیکٹری میں تشریف لائے۔ کارکنوں اور ماہرین کو موقع پہ ہدایات دیں۔ ماہرین نے اتنی عرق ریزی کی کہ ۱۹۷۱ء میں سالانہ تین ہزار ٹریکٹر تیار کیے جانے لگے۔ اس کے بعد صدر کم اِل سنگ نے مسلسل ٹریکٹر تیار کرنے اور خود کفالت حاصل کرنے پہ زور دیا اور خود بھی کئی دفعہ موقعہ پہ ہدایات دینے کے لیے فیکٹری تشریف لائے آج یہ فیکٹری سالانہ ۳۰ ہزار ٹریکٹر تیار کر رہی ہے جو نہ صرف کوریا کی ضروریات کے لیے کافی ہیں بلکہ اگر کوریا چاہے تو یہ ٹریکٹر برآمد بھی کر سکتا ہے اس فیکٹری کو مزید وسعت دینے کی گنجائش کے پیشِ نظر اندازہ لگایا گیا ہے کہ جب فیکٹری کی توسیع ہو گی تو اس موجودہ تعداد سے کہیں زیادہ ٹریکٹر تیار ہونے لگیں گے۔ ٹریکٹر کے علاوہ اس فیکٹری میں زراعت کے دوسرے بے شمار چھوٹے چھوٹے آلات اور مشینیں بھی تیار ہوتی ہیں۔

اس فیکٹری کیساتھ ہی بسیں اور ٹرک تیار کرنے کی فیکٹری بھی موجود ہے۔ اِن دونوں فیکٹریوں کے مزدور کافی تنخواہیں لیتے ہیں۔ ان کا رہن سہن بھی معیاری ہے۔ یہ فیکٹری ہر لحاظ سے جامع یونٹ ہے کیونکہ یہاں پہ ٹریکٹر سازی کے تمام پرزہ جات بناتے جا رہے ہیں۔ فیکٹری کے مزدور مرد اور عورتیں تقریباً ایک جیسا لباس پہنے ہوئے تھیں۔ کارکنوں کے علاوہ ماہرین، انجنئرز اور دوسرے فیکٹری کو چلانے والے انقلابی کمیٹی کے اراکین نے بھی تقریباً ایک جیسا لباس پہنا ہوا تھا۔ فیکٹری کی انتظامیہ اور مزدوروں کے نمائندوں میں صرف اتنا فرق تھا کہ مشینوں پہ کام کرنے والے مزدور لمبا کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ہم جس دفتر میں بیٹھے تھے وہ چیئرمین انقلابی کمیٹی کا کمرۂ استقبالیہ تھا۔ اس کے پاس ہی اسی بلڈنگ میں اور بھی بے شمار انتظامی دفتر تھے جو نہایت سادہ تھے ان میں معمولی حیثیت کے قالین اور نہایت صاف ستھرے صوفے پڑے تھے صوفوں

پر اُجلا سفید پتھر سے تیار کردہ کپڑا چڑھا ہوا تھا اور جو پردے لٹک رہے ہے



ثقافتی شو میں ایک مغنیہ عوامی ثقافتی ہال میں سرمنی و عرق اللہ رکھے گا رہی ہے ؛

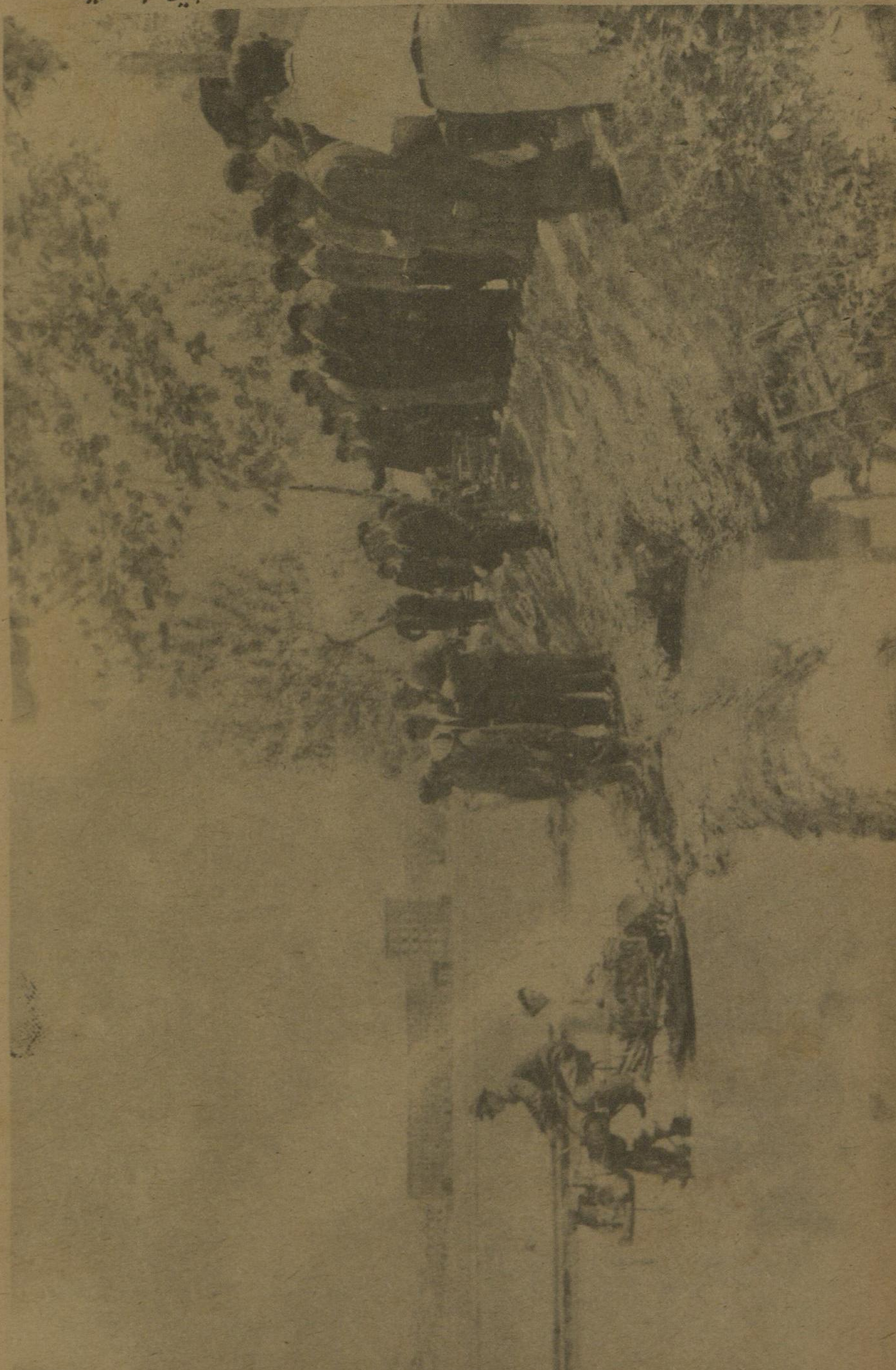
تھے وہ نہایت سادہ تھے۔ دفتروں پر کوئی حفاظتی عملہ یا افسر شاہی کی طرح کا ماحول دیکھنے میں نہیں آیا۔ کارکن اور منتظمین ایک خاندان کے افراد کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ چیئرمین انقلابی کمیٹی جب فیکٹری کا تعارف کرا چکے تو ہمارے وفد کے لیڈر شیخ محمد رشید نے تعریفی کلمات میں فیکٹری کے کارکنوں کے عزم و استقلال اور اعلیٰ کارکردگی کو خراج عقیدت پیش کیا انہوں نے کامریڈ کم ال سُنگ کی قیادت میں عظیم کوریائی عوام کی مزید خوشحالی اور ترقی کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

اجتماعی کھیتی باڑی

یہاں سے ہم فارغ ہوئے تو اجتماعی کھیتی باڑی کا فارم دیکھنے چل پڑے۔ یہ فارم فیکٹری کی پچھلی جانب پیانگ یانگ کی طرف چند ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ ہماری گاڑیوں کا قافلہ شاہراہ سے چھوٹی سی پکی سڑک کی طرف مڑ گیا اور اس جگہ پر رکا جہاں چاول کے کھیتوں میں پنیری لگانے والی مشینیں کام کر رہی تھیں۔ ہم سب اپنی گاڑیوں سے اتر کر کھیت کے کنارے کھڑے ہو گئے۔ یہاں پر ایک خاتون نے جو اجتماعی کھیتی باڑی فارم کی منیجر تھیں، ہمارا استقبال کیا۔ شیخ رشید نے اپنی پتلون اوپر ٹانگ لی اور کھیت میں جا کر پنیری لگانے والی مشین کو دیکھنے کے لیے آگے بڑھے۔ انہوں نے مشین کو خود چلانے کی کوشش کی تو وہ خراب ہو گئی۔ اس مشین پر ایک مرد ڈرائیور اور خاتون شیخ صاحب کی امداد کر رہی تھی۔ یہ مشین کھیت کے درمیان پانی میں پھنس گئی۔ شیخ صاحب نے پنجابی میں کارکنوں کے حوصلے کی داد دی اور انگریزی زبان میں ترجمان کو دوسری مشین، جو دور کام کر رہی تھی، قریب لانے کے لیے کہا۔ یہ کھینچ کر سڑک کے اوپر لائی گئی۔ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ہم نے صنعتی مشین کو دیکھا تھا۔ مشین کا ایک اگلی طرف بہت بڑا پہیہ ہے جس کے اوپر لوہے کے چوڑے اور دو انچ لمبے پھالے سے لگے ہوئے ہیں یہ پھالے ربڑ کے ٹائر کا کام دیتے ہیں۔ اس کے عین اوپر چار ہارس پاور کی موٹر لگی ہوئی ہے۔ پچھلی

طرف ایک لمبی سی پھٹی ہے جس پر ٹریکٹر کے ہلوں کی طرح تھوڑی سی جگہ ہے۔ جس کے منہ میں ایک مرد یا عورت پنیری کی چھوٹی چھوٹی گٹھریاں رکھ دیتے ہیں۔ مشین کے چلنے سے ایک لیور خود بخود پنیری کو کھینچ کر زمین میں لگاتا جاتا ہے۔ شیخ صاحب نے بغور مطالعہ کیا اور خود بھی مشین چلانے کی ناکام کوشش کی۔

جب ہم اس جگہ کھڑے مشین سے متعلق معلومات حاصل کر رہے تھے تو مسٹر نسیم احمد سیکریٹری وزارتِ اطلاعات پیچھے کھڑے اپنے سٹینو کو کچھ لکھوا رہے تھے۔ میں نے موقع پاتے ہی ان سے کہا "اپنی وزارتِ ابلاغِ عامہ کے شعبوں اور صحافی دوستوں سے کہیں کہ اجتماعی کھیتی باڑی میں جو کچھ دیکھا ہے اسے لکھیں، اور اس کے تمام دلچسپ اور معلوماتی پہلوؤں کو اجاگر کریں تاکہ پاکستان کے عوام بھی مستفید ہو سکیں۔ یہ حضرات صرف لیڈروں کی تقریریں چھاپنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔" تو انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا کہ تحریر و ادب کا مسلّمہ پہلو جس میں چھوٹی چھوٹی تفصیلات دلچسپی کا موضوع بنائی جاتی ہیں، ہمارے ادب میں اہمیت کھو چکی ہیں۔ ہم محوِ گفتگو تھے کہ شیخ صاحب اور وفد کے دوسرے باشعور اراکین، کوآپریٹو فارم کی خاتون منیجر اور پاس کھڑے دوسرے کارکنوں سے فارم کی تفصیلات کے بارے میں پوچھنے لگے۔ ہمارے وفد کے سفید پوش اراکین کھیت کی مٹی، گرد اور گدلے پانی سے بچنے کے لئے اپنی جوتیوں اور کپڑوں کو جھاڑ رہے تھے اور پکی سڑک پر محفوظ کونوں کی تلاش میں تھے یا اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے اونگھ رہے تھے۔ ہمارے سوالات کے جوابات دیتے ہوئے فیکٹری منیجر نے بتلایا کہ یہ فارم ۱۲ ہزار ہیکٹر کا ہے اس پر ۶۵ ٹریکٹر ۱۸ ٹن وزنی، ۴۴ ٹریکٹر ۶۵ ٹن وزنی اور چار ہارس پاور کی ۲۰ چاول کی پنیری لگانے والی مشینیں کام کرتی ہیں۔ ایک مشین دن میں تین ہیکٹر تک پنیری لگاتی ہے۔ واضح رہے ایک ہیکٹر اڑھائی ایکڑ کے برابر ہوتا ہے۔ اس طرح دس دن میں ۶۰۰ سو ہیکٹر کی کاشت مکمل ہو جاتی ہے۔ شیخ رشید نے اس مشین میں گہری دلچسپی لی اور پاکستان کے وزیرِ زراعت کی حیثیت سے


انہوں نے چند مشینیں پاکستان میں بھی منگوائی ہیں۔ خیال ہے کہ پاکستانی انجینئروں کی امداد سے ایسی مشینیں تیار کروائی جائیں گی جس سے پاکستان میں چاول کی کاشت میں انقلابی تبدیلیاں لائی جا سکیں گی ایک اندازے کے مطابق اس فارم میں ایک سو ہیکٹر یعنی اڑھائی سو ایکڑ پر آٹھ ٹریکٹر کام کر رہے تھے۔ چھ سو ہیکٹر چاول کے علاوہ ۱۸۰ ہیکٹر باغات کے ہیں۔ ۵۶ ہیکٹر پر مکئی کی کاشت کی گئی تھی باقی اراضی پر گندم کاشت کی جاتی ہے۔ چاول کی پیداوار ۱۰ ٹن فی ہیکٹر ہے۔ بعض جگہوں پر ۱۶ ٹن تک ہے یعنی سوا سو اور پونے دو سو من فی ایکڑ چاول کی پیداوار اجتماعی کھیتی باڑی کے فارم سے کی جاتی ہے ایک سوال کے جواب میں فارم منیجر نے بتایا کہ "کھیتوں کے اندر سے مخصوص جھاڑیوں اور گھاس پھوس کے اتلاف کے لیے علیحدہ مشینیں موجود ہیں اس فارم پر ایک سو پچاس انجینئرز اور اسٹنٹ انجینئرز کام کرتے ہیں۔ ۶۰۰ گھرانے یعنی تقریباً تین ہزار افراد اس فارم کے ممبر ہیں ان افراد کی آمدنی کافی معقول ہے۔ ایک اندازے کے مطابق آٹھ ہزار سے ۱۰ ہزار روپے سالانہ فی کس آمدن ہے اس آمدن کے علاوہ تعلیم، صحت، مکانات، چھٹیاں اور دوسری تمام بنیادی سہولتیں حکومت کے ذمہ ہیں اضافی آمدنی سے مکانات، سڑکیں، چھوٹی زرعی آلات کی ورکشاپیں اور دوسری سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ "اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد جو پیداوار بچ جاتی ہے اسے نقد داموں مرکزی حکومت کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا ہے"۔ ہمارے دوستوں نے فارم کی منیجر سے بیشمار سوالات پوچھے۔ سوالات کا دور ختم ہوا تو شیخ صاحب مزید فنی سوالات کی تیاریاں کرنے لگے کہ ہمارے ساتھ جو وزیر زراعت کو دیا موجود تھے انہوں نے ترجمان کے ذریعے شیخ صاحب سے کہا کہ تفصیلات پیانگ یانگ میں موجود ماہرین سے بھی حاصل کی جا سکتی ہیں اور پھر وقت زیادہ ہو گیا ہے اور ہم دوپہر کے کھانے سے لیٹ ہو رہے ہیں۔ وزیر زراعت موصوف کافی جاذب شخصیت

اور ذہین نظر آرہے تھے۔ بہر حال ان کے اس جواب کے ساتھ ہی ہمارا اجتماعی فارم کا یہ دورہ مکمل ہوا اور اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر واپس اپنے مہمان خانہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ دو بجے کے قریب کھانا کھایا اور اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

انتظامی و اقتصادی امور کے کالج کا دورہ

شام پانچ بجے ہم کالج دیکھنے کے لئے چل پڑے اور چھ بجے کے قریب ہمارا قافلہ کالج میں پہنچ گیا۔ اس قافلہ میں بھی شیخ رشید، مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ اور وفد کے تمام دوسرے سینئر اراکین شامل تھے۔ کالج کے دروازے پر چیئرمین نے ہمارا استقبال کیا۔ اور استقبالیہ میں بٹھا دیا۔ سب سے پہلے چیئرمین نے کالج کے مختلف شعبہ جات کا تعارف کرایا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ قانون، اقتصادیات اور انتظامی امور پر تربیت دینے کے لئے قائم ہے۔ اس کی انتظامیہ براہِ راست پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے ماتحت ہے۔ ایک لحاظ سے اسے پارٹی سکول بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہاں پر عام طالب علموں کے علاوہ ملک کے دور دراز علاقوں کے مختلف شعبہ جات کے رہنماؤں کو سال میں مقررہ مدت کے لئے آنا پڑتا ہے۔ ان طالب علموں میں فیکٹریوں اور کھیتوں کے مینجر، انتظامی امور کے سربراہ، پارٹی کے اعلیٰ عہدیدار جن میں وزرا بھی شامل ہیں، تربیت حاصل کرنے آتے ہیں۔ یہاں انتظامی امور پر جدید اور تازہ ترین تحقیقات پڑھائی جاتی ہیں۔ خاص طور پر فنی، سائنسی، ثقافتی، نظریاتی اور انقلابی تحقیقات کے علاوہ زراعت، دیہی عوام کی امداد اور ترقی اور مرکزی حکومت کی زراعت اور دیہی عوام پر خصوصی توجہ کے راہنما اصولوں پر زور دیا جاتا ہے۔ کالج کے مختلف شعبہ جات نہایت صاف ستھرے اور خوبصورت کمروں پر مشتمل ہیں۔ یہاں پارٹی کے فلسفہ اور کامریڈ کم ال سنگ کے افکار و نظریات کی تعلیم اور ان کو عملی جامہ پہنانے کی تدابیر پر عمل درآمد کی تربیت دی جاتی ہے۔ تعارف کے بعد کالج کی انتظامیہ نے وفد کے اراکین کو مختلف سوالات پوچھنے کی دعوت دی۔ شیخ صاحب نے زراعت



کے محکمہ اور پارٹی کارکنوں کی تربیت سے متعلق کئی ایک سوالات پوچھے عبدالحفیظ پیرزادہ نے بھی متعدد سوالات کئے جن میں ایک سوال یہ تھا" اگر دیہات میں صنعتی اور فنی انقلابی تبدیلیوں سے دیہات کی بیشتر آبادی خاص طور پر خواتین کے بے روزگار ہونے کے امکانات پیدا ہو جائیں تو اس صورت میں کیا تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں"۔ کالج کے سربراہ نے جواب دیا کہ "فنی انقلابی تبدیلیوں کے باعث بچ رہنے والی افرادی قوت کو دیہی اور شہری چھوٹی صنعت میں کھپایا جا سکتا ہے"۔ میں نے بھی کئی سوالات کئے جن میں ایک اہم سوال یہ تھا کہ "کیا کوریا دوسرے ممالک خاص طور پر سوشلسٹ ممالک سے فنی اور تکنیکی استفادہ اور تجربات حاصل کرتا ہے"۔ کالج کے سربراہ نے بتایا کہ "وہ غیر ملکی تجربات اور خیالات پر بالکل بھروسہ نہیں کرتے۔ سوائے اس کے کہ دوست ممالک سے تعلیمی، ادبی، ثقافتی اور تکنیکی وفود کے تبادلے کئے جاتے ہیں"۔


یہاں سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگ اپنے مہمان خانے میں واپس آئے۔ اور کھانا کھایا۔ رات کے ۸ بجے تھے، کھانا کھا چکے تو معلوم ہوا کہ اوپر کے کمرے میں کوریا کے عظیم عوام کی صنعتی، زرعی اور ملکی ترقی کے بارے میں ایک فلم شو دکھایا جائے گا۔ ہم ½ ۹ بجے کے قریب شو دیکھنے گئے اس میں دکھائی گئی بیشتر چیزیں ہم ایک روز قبل صنعتی شو میں دیکھ چکے تھے۔ مگر اس کے باوجود بے شمار صنعتی دلچسپی کے امور کی باتیں دکھائی گئیں فلم دیکھنے کے بعد کوریا کے عوام کی عظیم انقلابی جدوجہد اور کامیابیوں سے تمام دوست بہت متاثر ہوئے۔ ۱۱ بجے فلم ختم ہوئی اور ہم اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

۷۶-۵-۲۴ ہمارے وفد نے پروگرام کے مطابق اس روز کوریا کے دوسرے بڑے شہر ہم ہانگ جو صنعتی مرکز بھی ہے دیکھنے جانا تھا۔ مگر رات کو مجھے اطلاع ملی کہ اس دفد میں وزراء، ایم این اے، ایم پی اے اور پریس کے افراد ہی وزیر اعظم کے ساتھ جائیں گے وفد کے باقی اراکین پیانگ یانگ میں ہی رہیں گے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم ہانگ میں

جن اہم صنعتی مراکز میں وفد کے اراکین کو جانا تھا۔ وہاں کی حفاظتی تدابیر کا تقاضا تھا کہ محدود اور مخصوص ممبر ہی جائیں۔ بہرصورت میں وہاں نہ جا سکا۔ مگر میرے ساتھ رہنے والے دوست محمد حنیف نار و ایم پی اے وہاں گئے ان سے بے شمار تفصیلات معلوم ہوئیں۔ ان کے مطابق ہم ہانگ میں وزیرِ اعظم پاکستان کا پیانگ یانگ سے بھی زیادہ استقبال ہوا۔ بہت بڑا صنعتی شہر ہونے کی وجہ سے لاکھوں کی تعداد میں مزدور سڑکوں پر استقبال کرنے کے لئے آئے تھے۔ اس کے بعد مہمانوں نے بھاری صنعت کی فیکٹری کا معائنہ کیا۔ اس فیکٹری میں صرف سیاسی وفد کے اراکین کو جانے کی اجازت تھی۔ اخباری نمائندے بھی اندر نہ جا سکے۔ یہاں ٹینک اور سمندری جہاز تک تیار کئے جاتے ہیں اور تین ہزار ٹن فولاد کو بیک وقت پریس کرنے والی پریس مشین موجود ہے۔ چھ ہزار ٹن پریس کرنے والی مشین بھی کوریا نے ایجاد کر لی ہے لیکن یہ کسی اور شہر میں موجود ہے۔ چونکہ کسی ملک کی صنعتی ترقی کا اندازہ لگانے کے لئے فولاد کو پریس کرنے کی مشین بھی ایک پیمانہ ہے۔ اس لحاظ سے کوریا بہت اہم صنعتی ملک بن چکا ہے۔ اس فیکٹری کو دیکھنے کے بعد باہر آکر وزیرِ اعظم پاکستان نے اپنے وفد کے اراکین سے غیر رسمی طور پر کوریا کے سماجی اور معاشی نظام کے بارے میں رائے پوچھی۔ جب انہوں نے ایک رجعتی روزنامے کے ایڈیٹر سے پوچھا کہ کیا اب بھی آپ کی رائے ہے کہ "سوشلسٹ نظام کے بغیر ترقی ہو سکتی ہے" تو جدی پشتی اس رجعت پسند صحافی نے نہایت ڈھٹائی سے کہا کہ "میں اس سے اتفاق نہیں کرتا" بعد میں کسی نے ان سے پوچھا کہ "کیا اب بھی آپ پاکستان میں سوشلسٹ معیشت کے نظام کی مخالفت کریں گے" تو انہوں نے کہا "انشاء اللہ ضرور کریں گے"۔ ہمیں ان پر اور انکے سامراجی جاگیردار اور سرمایہ دار آقاؤں کی حالتِ زار پر ترس آیا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ وزیرِ اعظم کے وفد کے ساتھ شامل ہونے کا دعوت نامہ قبول کرنا ان کی مفاد پرستی ہے، اسلام دوستی یا منافقت۔ ہمارے جو ساتھی ہم ہانگ گئے تھے وہ رات کی گاڑی سے سفر کر کے صبح چھ بجے کے قریب پیانگ یانگ پہنچے چونکہ

فاصلہ ۲۰۰ میل کے قریب تھا۔ ساری رات ٹرین کا سفر کرنا پڑا۔ وزیر اعظم بھٹو اور صدر کم اِل سنگ اُسی گاڑی کے ذریعے پیانگ ہانگ آئے۔ اگرچہ یہ چھ بجے کے قریب پیانگ یانگ کے قریب پہنچ گئی تھی مگر مہمانوں کے آرام میں خلل نہ ڈالنے کی غرض سے آٹھ بجے تک ان کو سونے دیا گیا اور نہ جگایا گیا۔ گاڑی شہر سے دُور کھڑی رہی اور جب وفد کے اراکین کی آنکھ کھلی تو گاڑی سوا آٹھ بجے کے قریب پیانگ یانگ کے مرکزی ریلوے اسٹیشن پہنچی وہاں سے مہمان اپنی اپنی اقامت گاہوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

وفد کے باقی ماندہ اراکین جو ہم ہانگ نہیں گئے تھے گیارہ بجے پیانگ یانگ کے قریب زمین دوز ریل گاڑی کے نظام کو دیکھنے گئے۔ اس وفد کی قیادت بیگم سعدیہ حفیظ پیرزادہ کر رہی تھیں۔ ہم جب انڈر گراؤنڈ پہنچے تو بیگم صاحبہ وہاں پہلے ہی موجود تھیں۔ چونکہ وفد کے دوسرے اراکین کچھ جھجک سی محسوس کر رہے تھے اس لئے میں نے آگے بڑھ کر بیگم صاحبہ کو اپنا تعارف کرایا اور دورے کے دوران ضروری تعاون اور خدمات پیش کیں۔ زمین دوز ریل گاڑی کے اندر کے ریلوے اسٹیشنز کے بارے میں ہمیں گائیڈ نے تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ اگرچہ ابھی ریلوے کا زمین دوز نظام نامکمل ہے تاہم گیارہ اسٹیشن مکمل ہو چکے ہیں۔ موجودہ نظام ۱۹۷۳ء میں مکمل ہو گیا تھا۔ یہ زمین دوز ریلوے کافی صاف ستھری اور خوبصورت تھی۔ ہر اسٹیشن پر بڑی بڑی تصویریں بنی ہوئی تھیں جن کے ذریعے کوریا کی تاریخ اور مزدوروں، کسانوں کی جدوجہد کی تفصیلات بیان کی گئی تھیں۔ صدر کم اِل سُنگ کی تصویریں اور اقوال جگہ جگہ لکھے ہوئے تھے، شمالی اور جنوبی کوریا کے اتحاد اور بھائی چارے کے بارے میں کئی جگہ نعرے پڑھنے میں آئے۔ ہمارے وفد کے ایک ساتھی نے صاف شفّاف زمین دوز ریلوے اسٹیشن کے اندر سگریٹ پینا چاہا تو گارڈ بھاگا بھاگا آیا اور التماس کی کہ "جناب تھوڑی دیر صبر کر لیں اور جب زمین دوز ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلیں تو سگریٹ پی لیں" اس پر ہمارے دوست کو شرمندگی سے



وزیرِ اعظم بھٹو اور صدر کِم اِل سنگ کوریا میں انقلابی "اوپرا" دیکھ رہے ہیں۔

سگریٹ بجھانا پڑا۔ زمین دوز ریلوے اسٹیشن سے آنے جانے کے راستے نہایت کشادہ اور صاف تھے۔ دیواروں پر کوئی خراشں، گندگی، یا بیہودہ شعر، نعرے یا تحریریں نہیں لکھی ہوئی تھیں۔ ہم نے دوسرے ممالک میں بھی زمین دوز ریلیں دیکھی ہیں، جو ان ممالک کے بڑے شہروں میں کثیر آبادی کی ضروریات کے تقاضے پورے کرتی ہیں، مگر کوریا کے عوام کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ زمین دوز ریلوے لائن قومی جاہ و جلال کے علاوہ دفاعی نقطۂ نظر کی بھی حامل ہے۔ یہ ریلوے جو کئی فٹ زمین کے نیچے ہے، جنگ کے زمانے میں بم کے دھماکوں اور اس کے مضر اثرات سے بالکل محفوظ ہے۔ حتیٰ کہ یہاں ایٹم بم کے دھماکوں سے بھی کافی تحفظ مل سکتا ہے۔ کوریا کے عظیم عوام نے ریلوے کے علاوہ بھی بے شمار پہاڑیوں کی تہہ میں اور کھلی زمین پر دفاعی نقطۂ نگاہ سے زمین دوز فیکٹریاں، کارخانے فوجی سامان کے اسٹور اور ہوائی اڈے تعمیر کئے ہیں، جو بلاشبہ یہاں کے محنت کش عوام اور سوشلسٹ معیشت کی کامیابی کی جیتی جاگتی مثالیں ہیں۔

اس تاریخی قومی منصوبہ کو دیکھ کر جب ہم فارغ ہوئے تو اکثر دوست بے تاب تھے کہ اب کوئی خرید و فروخت ہونی چاہیئے۔ چنانچہ ہمیں انٹرنیشنل شاپ پر لیجایا گیا۔ یہ تین منزلہ عمارت بیرونی ممالک سے آئے ہوئے مہمانوں اور پیانگ یانگ میں رہنے والے غیر ملکی شہریوں کی خرید و فروخت کے لئے مخصوص ہے۔ اس سنٹر میں سیلز مین تمام لڑکیاں ہیں۔ کوریا کے عوام کی ضروریاتِ زندگی اپنی فیکٹریوں، فارموں، محلوں اور دوسری کام کرنے کی جگہوں پر مخصوص دکانوں پر فروخت ہوتی ہیں اور ان کی قیمتیں بھی بہت کم ہوتی ہیں۔

محنت کاروں کو بے شمار اشیار خریدنے کے لئے کوپن یا خصوصی پرمٹ اپنے محکمہ یا ادارے کی طرف سے دیئے جاتے ہیں نقد قیمت پر اشیار خریدنے کی انہیں کھلی اجازت ہے۔ البتہ ان کے خرید و فروخت کے تقاضے بہت مختلف ہیں غیر ملکی مہمانوں کے لئے دو بڑی دوکانیں ایک "انٹرنیشنل شاپ" اور دوسری "ڈالر شاپ" مخصوص ہیں۔

ہم کوئی بارہ بجے کے قریب انٹرنیشنل شاپ میں پہنچے یہاں غیر ملکی سفارت خانوں کے عملہ کے افراد ان کی بیویاں اور بچے بھاری تعداد میں خرید و فروخت کر رہے تھے۔ ہم اوپر کی منزل میں چلے گئے۔ یہاں کپڑا، کراکری، شیشے اور چمڑے کا سامان، ریکارڈ، آبی رنگوں کی تصویریں، پن، گھڑیاں اور دوسری بیش قیمت چیزیں فروخت ہو رہی تھیں۔ اس کے علاوہ حنوط شدہ مرغابیاں اور دوسرے پرندے بھی بک رہے تھے۔ ہمارے وفد کے اراکین نے مرغابیاں بہت پسند کیں خاص طور پر رئیس خاندانوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے اپنے ڈرائنگ روم سجانے کے لئے فخریہ طور پر ایک ایک جوڑا خریدا اور نہایت پر تکلف طریقے سے ان کو پیک کیا۔ کوریا سے چین اور چین سے پاکستان اور پھر اپنے گھروں کے ڈرائنگ روموں تک بڑی احتیاط سے لائے ہونگے۔ وفد کے کارکن دوستوں کے پاس ہانگ کانگ کے بعد چونکہ زرِ مبادلہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔ اس لئے انہوں نے تحفے کے طور پر چھوٹی چیزیں خریدیں، جن کی قیمتیں انتہائی کم تھیں ————

میں نے اپنی پیاری بیٹی نخبہ کی فرمائش کے مطابق کوریا کی معروف طرز کی ایک گڑیا بھی خریدی جو ساڑھے سات روپے میں ملی۔ اپنے لئے میں نے تین روپے کا بال پن اور "اوپرا" کا ایک ریکارڈ خریدا۔ آدابِ خریداری سے ناواقف ہونے کے باعث اچھی چیزوں کی سلیکشن ہمارے لئے ایک مسئلہ بن گئی۔ کوریا میں پاکستانی سفیر کی اہلیہ بیگم انور سعید نے رائے دی کہ کوریا کی سلک بہت سستی اور اچھی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ میں نے جھٹ سلک کا ۶ میٹر کپڑا خرید لیا جو آٹھ روپے فی میٹر (میٹر گز سے ذرا بڑا ہوتا ہے) کے حساب سے دستیاب ہوا۔ بیگم انور سعید کی تجویز پر میں نے تھوڑا سا ایک جالی نما کپڑا خریدا جو پاکستانی خواتین قمیضوں اور ساڑھیوں کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ یہ دس روپے فی میٹر کے حساب سے ملا۔ میرے ساتھ جو زیادہ رقوم والے حضرات تھے انہوں نے سلک اور جالی نما کپڑا اور چھوٹو میٹر خریدا یہاں تک کہ ایک دوست نے جالی نما کپڑا ایک سو میٹر خرید ڈالا۔ حنیف نارو

صاحب نے خرید و فروخت کا دائرہ وسیع ہوتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے سوٹ کیس خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا لیکن وہ اتنا مہنگا تھا کہ خریدنے کی ہمت نہ پڑی اور انہوں نے سوٹ کیس چین میں جا کر خریدا۔ اس شاپنگ سنٹر میں سب سے مہنگی چیز حنوط شدہ مرغابیاں تھیں۔ اکثر غریب دوستوں نے معمولی قسم کے چینی کے پھولدان اور دوسری شیشے کی زیبائش کی چیزیں خریدنے پر اکتفا کیا۔ بہرحال ہم ڈیڑھ گھنٹہ کی خرید و فروخت کے بعد اپنے اپنے مہمان خانوں میں دوپہر کا کھانا کھانے واپس آئے۔ دوپہر کے کھانے پر ہمارے وفد کے ایک رکن جو خدا جانے کیسے وفد میں شامل ہوئے تھے مجھ سے سوشلسٹ معیشت کے نظام کے بارے میں تفصیلات پوچھنے لگے۔ انہوں نے بڑی سادگی سے اعتراف کیا کہ وہ سوشلزم کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ یہ کہ انہیں سوشلسٹ نظام سے سخت نفرت ہے اور ساتھ ہی انہوں نے اعتراف کیا کہ کوریا سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ ان کے اصرار پر میں نے انہیں سوشلسٹ نظام کی چند ابتدائی باتیں بتائیں اور دو گھنٹے تک انہیں لیکچر پلاتا رہا لیکن وہ خاصے چکنے گھڑے ثابت ہوئے باقی ماندہ دنوں میں اور پاکستان واپسی کے بعد ان کے زبان و عمل سے پتہ چلا کہ ان کی سادگی بدستور قائم ہے۔ کھانے کے بعد ہم نے تھوڑی دیر آرام کیا اور چار بجے کے قریب تیار ہو کر لاؤنج میں آ گئے کیونکہ پانچ بجے ہمیں بچوں کا نرسری سکول دیکھنے کے لئے جانا تھا۔

نرسری سکول

۵ بجے کے قریب ہمارا قافلہ نرسری کے دروازے پر پہنچا۔ یہاں پر سکول کی منتظم چیف میٹرن نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں اندر داخل ہونے سے پہلے جوتیاں اتارنے کو کہا گیا جوتے اتار دیئے گئے تو ہمیں ربر کے مخصوص سلیپر پہنا دیئے گئے۔ اس کے بعد وفد کے اراکین کو پاس والے کمرے میں لیجا کر بڑے بڑے سفید کوٹ جو ڈاکٹر حضرات ہسپتالوں میں پہنتے ہیں، پہنا دیئے گئے۔ چیف میٹرن نے ہماری پریشانی کو بھانپتے ہوئے بتایا کہ سلیپر اور کوٹ بچوں کو جراثیم

سے بچانے کے لئے پہنائے گئے ہیں۔ اب ہمیں لاؤنج کمرہ میں لے جایا گیا، یہاں حسب دستور سیبوں، ناشپاتیوں اور سبز چائے سے ہماری تواضع کی گئی۔ چائے سے فارغ ہوئے تو چیف میٹرن نے ہمارے وفد کے اراکین سے پوچھا کہ "آپ کا لیڈر کون ہے" ہم سب ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے کیونکہ ہم لیڈر کی تیاری کے بغیر آگئے تھے، پھر صبح کے دورے پر تو بیگم پیرزادہ وفد کے لیڈر کے فرائض سرانجام دے رہی تھیں مگر شام کو وہ تشریف نہیں لاسکیں۔ دوستوں کے اصرار کرنے پر مجھے لیڈر چن لیا گیا اور مجھے وفد کے لیڈر کے فرائض سرانجام دینا پڑے۔ چیف میٹرن نے میری طرف مخاطب ہو کر نرسری سکول اور کوریا میں نرسری نظام تعلیم کے بارے میں تفصیلات بتانا شروع کیں انہوں نے بتایا کہ "انقلاب کے بعد کامریڈ کم اِل سُنگ نے ہدایت کی کہ قبائلی نظام کے رہن سہن کے طریقوں سے نجات دلانے کے لئے عورتوں کو آزاد کرنے کی ضرورت ہے۔ اس قبائلی اور جاگیرداری نظام کی سب سے بڑی بندش عورتوں کے لئے گھروں میں رہ کر بچوں کی پرورش اور گھریلو کاموں میں جُتے رہنا ہے جس سے وہ قومی اور سماجی ترقی میں اپنا کردار ادا نہیں کرسکتیں۔ عورتوں کو اس غلامی سے نجات دلانے کے لئے کوریا میں جگہ جگہ بچوں کی نرسریاں قائم کی گئیں تاکہ بچوں کی مائیں اپنا وقت قوم اور ملک کے لئے پیداوار بڑھانے میں صرف کرسکیں۔ یہ نرسریاں ہر شہر اور دیہات میں موجود ہیں چونکہ بچوں کی تربیت نرسری سکولوں سے ہوتی ہے لہذا مرد اور عورتوں کو برابر کے مواقع میسر ہیں کہ وہ قوم کی خدمت کرسکیں"۔ انہوں نے کوریا کے انقلاب کے بعد کی ایک ضرب المثل سنائی جس کا مفہوم یہ تھا کہ "ملک میں مرد اور عورتوں کے درمیان کوئی عدم مساوات نہیں ہے اور بچے سرزمین کے شہنشاہ ہیں"۔ جس نرسری میں ہم گئے تھے اس کا بارہ ہزار اسکوائر میٹر رقبہ یعنی چالیس ہزار مربع فٹ کے برابر ہے۔ یہ نرسری مطالعہ گاہوں، سونے کے کمروں، غسل خانوں، کھیل کے میدانوں جو گرمیوں اور سردیوں کے علیحدہ علیحدہ تھے اور دوسری بے شمار سہولتوں سے آراستہ تھی۔ کامریڈ کم اِل سُنگ کے حکم کے مطابق بچوں کی صحت اور دیکھ بھال کے لئے سو بستروں کا ہسپتال نرسری کے ساتھ

ہی بنا ہوا ہے۔ مگر مزے دار بات یہ ہے کہ ہسپتال بالکل خالی ہے، کیونکہ بچے صحت مند اور توانا ہیں اور وہ خوش و خرم ماحول میں بغیر کسی تکلیف کے پرورش پا رہے ہیں۔ چیف میٹرن نے بتایا کہ جنوبی کوریا میں عورتیں ظلم اور استحصال کا شکار ہیں اس لئے شمالی کوریا کی خواتین ان کے لئے فکر مند ہیں اور وہ قوم کی پیداوار بڑھا رہی ہیں۔ تاکہ وقت آنے پر ان خواتین اور بچوں کی امداد کی جا سکے چیف میٹرن نے کہا کہ یہاں کے بچوں کو بتایا گیا ہے کہ آج پاکستانی مہمان آ رہے ہیں جو ہماری آزادی کی جدوجہد اور شمالی اور جنوبی کوریا کے اتحاد کے لئے ہمارے ساتھی ہیں۔ اس لئے بچے بہت خوش ہیں اور استقبال کے لئے بے تابی سے انتظار کر رہے ہیں۔ میٹرن نے ہمارے سوالات کے جواب دیتے ہوئے بتایا کہ یہ ہفتہ وار نرسری ہے یہاں ڈیڑھ سال سے پانچ سال تک کے بچے آتے ہیں ہر سوموار کی صبح کو والدین بچوں کو یہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ اور ہفتہ کی دوپہر کو اپنے ساتھ گھروں کو لے جاتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ یومیہ نرسری بھی ہوتی ہے جہاں والدین صبح بچے چھوڑ کر جاتے ہیں اور دوپہر کو کام کرنے کے بعد لے جاتے ہیں۔

ہر فیکٹری، محلہ، کھیت اور علاقہ کے قریب نرسری سکول واقع ہیں ہمارے استفسار پر میٹرن نے بتایا کہ شروع شروع میں بچے والدین کے پاس جانا پسند کرتے ہیں مگر بعد میں بچوں کے ماحول سے مانوس ہو جاتے ہیں، یہاں گھر سے زیادہ سہولتیں ہونے کے باعث اکثر بچے یہاں رہنا پسند کرتے ہیں۔ اس نرسری سکول میں ۱۲۰ بچے تھے، جو ڈیڑھ سال سے ۵ سال کی عمر کے تھے۔ خوراک، کپڑا، دوائیں، کتابیں اور دوسری چیزیں مفت فراہم کی جاتی ہیں۔ عام طور پر ڈیڑھ سال کے بچے بولنا سیکھ جاتے ہیں۔ اس کے بعد انہیں چلنا پھرنا سکھایا جاتا ہے۔ میٹرن نے بتایا کہ تین سال تک ہم بچوں کو صدر کم ال سنگ کے بچپن اور زندگی کے بارے میں سمجھاتے ہیں پھر انہیں اجتماعی ترقی اور جدوجہد کا درس دیا جاتا ہے۔ اس تربیت کے بعد انہیں آہستہ آہستہ پڑھنا لکھنا سکھایا جاتا ہے۔ پانچ سال کی

عمر کے بعد کنڈر گارٹن سکول میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہائی سکول اور کالج کی تعلیم کے لئے صلاحیت کے مطابق ان کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ نرسری سکول کے بچوں کا نصاب سارے ملک میں یکساں ہے جس نرسری کا ہم معائنہ کر رہے تھے وہ ستمبر ۱۹۶۹ء میں مکمل ہوئی تھی۔ اس کی پانچ منزلیں اور دو بلاک ہیں ہر منزل پر تقریباً سو بچے تھے اور سینکڑوں کی تعداد میں چھوٹے بڑے کمرے جس میں مطالعہ گاہیں، سونے کے کمرے، غسلخانے، کھانے کے کمرے، کھیلنے کے بڑے بڑے ہال اور دوسری تمام ضروریات کے کمرے تھے۔ ان کا فرش خوبصورت لکڑی سے بنایا گیا تھا۔ نرسری میں کوئی پلاسٹک کے سلیپروں کے علاوہ دوسرے جوتے پہن کر نہیں جا سکتا اس لئے یہاں کوئی گندگی نہیں تھی مختصر تعارف کروانے کے بعد چیف میٹرن نے وفد کو مختلف کمرے دکھائے۔ پہلے ہمیں پاس کے چھوٹے سے کمرے میں لے جایا گیا جس میں دو سال کی عمر کے تقریباً ۱۲ بچے، بچیاں چھوٹی سی کرسیوں پر بیٹھی تھیں ہمارے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئیں اور تالیاں بجانے لگیں۔ یہ کمرہ صدر کم اِل سُنگ اور ان کے آبائی گاؤں کی جھونپڑی کی تصویروں اور کوریا کی خصوصی نوعیت کی تحریروں سے آراستہ تھا۔ یہاں موجود خاتون ٹیچر نے بچوں سے سوال کیا "کیا تم میں سے کوئی صدر کم اِل سُنگ کی زندگی کے بارے میں جانتا ہے"۔ ایک ننھی بچی نے کھڑے ہو کر جواب دیا "میں جانتی ہوں" اور کمرے میں نقشے اور تصویروں کی طرف اشارہ کر کے چند فقرے کہے۔ ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ٹیچر نے بچوں سے دوسرا سوال کر دیا "کوریا کی آزادی کی جد وجہد کے بارے میں کوئی جانتا ہے"۔ ایک بچی نے کھڑے ہو کر کہا "میں جانتی ہوں" اس نے پیاری زبان میں چند جملے ادا کئے اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ اب ہمیں دوسرے کمرے میں جہاں تین سال کے بچے موجود تھے، لے جایا گیا یہ بچے ایک ایک کر کے ہمارے وفد کے اراکین کو لپک کر ملے پھر ترتیب میں کھڑے ہو کر ہمیں اپنے قومی گیت سنائے۔ اگلے کمرے میں بچوں نے پیانو پر ڈانس کر کے دکھایا جو نہایت دلکش تھا۔ ان بچوں کی عمر

بمشکل تین چار سال ہوگی، اس کے ساتھ والے کمرے میں پانچ سال کی عمر کے بچوں نے ہمیں سائیکلوں کی دوڑ دکھائی۔ دوڑ میں حصہ لینے والی لڑکیوں نے لڑکوں کو ہرادیا اور سبقت لے گئیں۔

ننھے منوں کی دوڑ کا یہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اب ہمیں پانچویں منزل پر بڑے ہال کمروں میں لے جایا گیا۔ اس جگہ ایک چھوٹا سا نہانے کا تالاب تھا۔ جس میں بچے ڈبکیاں لگا رہے تھے اور خوشی سے پانی کے اندر ہی رقص کر رہے تھے تالاب میں نہانے والے ننھے بچوں میں ایک کالے رنگ کا بچہ تھا جو کورینا میں افریقی سفارتخانے کے عملے کے کسی فرد کا لڑکا تھا۔ نہانے کے تالاب کے ساتھ ایک بہت ہی لمبے ہال میں بچوں کے کھیلنے کے جھولے، قلابازیوں کا سامان، چھلانگ لگانے کی سیڑھیاں، ایک چھوٹے سے کھلونے کی طرح کی ریل گاڑی، بندوق، پستول اور ہوائی جہاز کے کھلونوں کی طرح کے ہتھیار اور بے پناہ گارڈن نرسری کی سہولتیں موجود تھیں، یہاں نونہال بے پناہ مسرت سے کھیل کود رہے تھے، اس ہال میں سب سے کم عمر کی بچی ایک سال دس ماہ کی تھی جو زمین سے ڈیڑھ فٹ اوپر ایک بانس کے ڈنڈے پر چلنا اور کودنا سیکھ رہی تھی، دوسرے بچے کھلونا ریل گاڑی میں بیٹھے گاڑی چلا رہے تھے۔ یہ ننھی بچی بانس پر بغیر سہارے کے چلتی تھی اور فٹ ڈیڑھ فٹ چل کر جمپ لگا کر نیچے کود جاتی تھی، یہ ٹریننگ خود اعتمادی اور خود انحصاری کے سلسلہ کی ایک کڑی کہی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد ہمیں بچوں کے کھانے کے کمرے دکھائے گئے جہاں کھانے کی چھوٹی چھوٹی میزیں اور کرسیاں موجود تھیں۔ وفد کے اراکین کو بتایا گیا کہ بچے نہایت خوش اسلوبی سے ان میزوں پر کھانا کھاتے ہیں۔ اب اراکین کو وہ کمرہ دکھایا گیا جہاں بچے کاغذ کے کھلونے بنانا سیکھتے ہیں۔ اسکے ساتھ والے کمرے میں دو بچیوں نے پیانو پر ڈانس کر کے دکھایا اور قومی گیت گا کر سنائے۔ یہاں سے ہوتے ہوئے ہم آخری منزل کے بہت بڑے ہال میں گئے، یہاں ۵۰ کے قریب ۵ سال کی بچیاں بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں موسیقی کا ایک آلہ جسے اکارڈین کہتے ہیں، تھا۔ ہمارے داخل ہوتے ہی ان بچیوں نے تالیوں

سے ہمیں خوش آمدید کہا اور اپنے ماسٹر کے اشاروں کی رہنمائی سے ساز پر پاکستان اور کوریا کے ترانے بجا کر سنائے اس کے بعد ننھی بچیوں نے پاکستان کا نغمہ "سوہنی دھرتی" گا کر سنایا۔ اور آخر میں پاکستان کے وزیرِ اعظم کو انگریزی زبان میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ ان ننھی منی بچیوں نے جب پاکستانی نغمے گائے تو فرطِ انبساط سے ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور ہم سوچنے لگے کہ ہمارے ملک کی بالغ آبادی کے افراد بھی اپنے ملک کا ترانہ اور قومی گیت مکمل طور پر نہیں جانتے۔ جب کہ ہزاروں میل دور ایک دوست ملک کی ننھی بچیاں ہمارے لئے اتنے شدید جذبات کا اظہار ہماری زبان میں کر رہی ہیں جو زبردست اپنائیت کی دلیل ہے۔ نرسری کے تمام شعبے دیکھ کر جب ہم نیچے اتر رہے تھے تو راستے میں جگہ جگہ کمروں سے جھانک کر بچے ہمیں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ ان کے جوش و خروش اور پاکستانیوں سے محبت کا یہ عالم تھا کہ دو ننھے بچے حجامت بنوا رہے تھے لیکن جب انہوں نے ہمیں گزرتے ہوئے دیکھا تو اسی حالت میں باہر نکل آئے اور ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہنے لگے ہم نے باہر جانے کے لئے اپنے سفید اوورکوٹ اتار دیئے اور دروازہ پر سلیپر اتار کر اپنی جوتیاں پہن لیں جب ہم باہر نکلے تو یہاں بھی سینکڑوں بچوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ہمارا قافلہ روانہ ہوا تو بے شمار ننھے منے ہاتھ دور تک الوداع کہتے رہے اور ہاتھوں کو فضا میں لہراتے رہے میٹرن نے الوداعی جملے ادا کرتے ہوئے اراکینِ وفد کا شکریہ ادا کیا۔ جواباً میں نے ان کے خوبصورت نرسری سکول، قومی جذبے اور لگن کی تعریف کرتے ہوئے خواہش ظاہر کی کہ کاش میں اپنی ننھی بچی کو ان کے سکول بھیج سکتا۔ میٹرن نے جواب دیا کہ اگر میں اپنی ننھی بچی کو ان کے سکول بھیج دوں تو اس کی بھی کوریا کے بچوں کی طرح تربیت کی جائے گی۔ ہم شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں بیٹھے دو دوسرے دوستوں نے نرسری نظام پر تبصرہ کرتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا کہ نرسری میں موجود بچے اتنے صحت مند اور خوش ہیں کہ یہاں کے تین سال کے بچے ہمارے سات آٹھ سال کے

بچوں کی طرح نظر آتے ہیں اور دو سال کے بچے ہمارے پانچ سال کے بچوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ ساتھی نرسری سکول کے نظام سے کم واقفیت رکھتے تھے وہ غیر سنجیدہ گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ مغربی ممالک میں بھی اڑھائی سال کی عمر کے بچے نرسری سکول میں جاتے ہیں مگر چونکہ وہاں تعلیم مفت نہیں اور فیس بہت زیادہ ہے۔ اس لئے صرف کھاتے پیتے طبقوں کے بچے ہی نرسری میں جا سکتے ہیں۔ سرمایہ داری نظام میں نرسری کی تعلیم بالکل فضول ہوتی ہے اور یہاں پر تھوڑے بہت کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے کے آداب کے علاوہ قومی جذبے، عوام کی خدمت، عوامی، فنی یا نظریاتی تربیت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی مگر سوشلسٹ نظام میں نرسری کی تعلیم مستقبل کی ملکی ترقی کے لئے بہت اہمیت رکھتی ہے ہمارے ملک میں سوشلسٹ نظام کے خلاف بے جا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے، کہ سوشلسٹ ملکوں میں بچوں کو جانوروں کی طرح پالا جاتا ہے حالانکہ صورتِ حال بالکل اس کے برعکس ہے سوشلسٹ ملک میں بچوں کو قوم کے بچے اور مستقبل کا معمار سمجھا جاتا ہے۔ ان کی شروع سے ہی زبردست تربیت کی جاتی ہے، جبکہ سرمایہ داری نظام میں ۸۰ فی صد عوام کے بچوں کی تعلیم و تربیت، صحت کے لئے کوئی سہولت نہیں ہوتی اور مستقبل کا یہ قیمتی سرمایہ قوم کی پیداوار میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا صرف چند کھاتے پیتے گھرانوں کے بچوں کی طرف توجہ دی جاتی ہے۔ اور پھر صرف بڑے شہروں میں نرسری سکول اور اعلیٰ تعلیمی ادارے ہوتے ہیں جو پہلے ہی موجود طبقاتی نظام میں مزید طبقات کا اضافہ کرتے ہیں۔ ہم ایسی باتیں کرتے اور سوچتے کوئی ساڑھے چھ بجے کے قریب اپنے کمروں میں واپس آئے۔ تھوڑا سا آرام کرنے کے بعد ۷ بجے تیار ہو گئے کیونکہ ۸ بجے سرکس شو دیکھنے کے لئے جانا تھا۔

سرکس شو

شام ساڑھے سات بجے کے قریب ہم سرکس شو دیکھنے کے لئے روانہ ہوئے بیگم حفیظ پیرزادہ نے وفد کی قیادت کی۔ سرکس

شو ایک جدید محل نما بہت بڑے ہال میں منعقد ہوا یہ ہال تین منزلہ ہے۔ مگر سرکس کے لئے گنبد نما بہت بڑے ہال کو چنا گیا تھا جس میں کوئی بیس ہزار کے قریب نشستیں تھیں۔ یہ ہال بھی عوامی ثقافتی ہال، عوامی تھیٹر، سٹیڈیم اور عظیم جمنیزیم ہال (جس میں اگلے روز وزیرِاعظم پاکستان نے ریلی سے خطاب کیا) جیسی قومی عمارتوں میں ایک تھا۔ جو انقلاب کے بعد تیار ہوئیں۔ اور جن پر کوریا کے عوام بجا طور فخر کر سکتے ہیں۔ ہمارے ہال میں پہنچنے کے بعد پاکستان اور کوریا کے قومی ترانوں کے ساتھ سرکس شو شروع ہوا۔ سرکس میں مردوں اور عورتوں نے اپنے کمالات دکھائے جو یقیناً کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ سرکس شو کا پہلا حصہ آٹھ ایکٹ پر مشتمل تھا اور دوسرے کے سات حصے تھے جن میں دنیا کے معروف کرتب دکھائے گئے۔ اس سرکس کی منفرد بات یہ تھی کہ اس میں فضول ناچ گانوں اور حرکتوں کی بجائے ہنرمندی، قومی ثقافت اور انقلابی نقطۂ نظر پیش کیا گیا جس سے حاضرین نے درسِ انقلاب حاصل کیا۔ سرکس شو دو گھنٹے جاری رہا اور ہم رات کے دس بجے کے قریب اپنے مہمان خانوں میں آ گئے۔ اور کھانا کھانے کے بعد نیند کی وادیوں میں پہنچ گئے۔

●

چلڈرن پیلس

۷۶ - ۵ - ۲۵ صبح ۹ بجے ناشتہ کرنے کے بعد ہم مہمان خانہ کے ارد گرد سیر کرنے کے لئے گئے، ایک مرتبہ پھر ہمیں خوبصورت پہاڑیوں کے دلکش مناظر دیکھنے کا موقع مل گیا، گیارہ بجے کے قریب چلڈرن پیلس دیکھنے جانا تھا۔ ابھی اس میں دو گھنٹے باقی تھے، ہم دریا کی سیر کو نکل پڑے اور گھومتے پھرتے پونے گیارہ بجے واپس آئے۔ گیارہ بجے کے قریب بچوں کا محل دیکھنے چل پڑے اس محل کے بارے میں میرا تصور تھا کہ قوم کے بچے پرانے زمانے کے محلات میں آرام طلبی کے لئے جاتے ہوں گے وہاں پہنچنے پر پتہ چلا کہ یہ محل بچوں کے لئے جز وقتی ہنر مندی کی تربیت حاصل کرنے کا مرکز ہے۔ ہمارے قافلہ میں وزیر اعظم پاکستان، بیگم نصرت بھٹو، صدر اور مادام کم ال سنگ بھی ساتھ تھے۔ سب سے پہلے محل سے باہر سڑکوں پر اور اونچی اونچی سیڑھیوں کے دونوں طرف خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے، گلے میں سرخ رومال ڈالے، ہاتھوں میں پھول لئے ہزاروں کی تعداد میں بچوں نے ہمارا استقبال کیا یہ پانچ سال سے دس بارہ سال تک کی بچیاں اور بچے سریلی طرز میں کوریا کی زبان میں کچھ اس طریقہ سے خوش آمدید کہہ رہے تھے کہ ہمیں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی موسیقی کا ساز بج رہا ہو یا ہم پرندوں کی سُریلی آوازیں سُن رہے ہوں۔ ہم اپنی گاڑیوں سے اترے تو یکدم چار پانچ سال کے بچے اور

بچیاں ایک ایک کر کے ہمارے گلوں میں لپک گئے اور ہاتھوں میں پکڑے ہوئے بوائے سکاوٹ سرخ رومال ہمارے گلوں میں باندھ دیئے۔ ہمارے وفد میں موجود دو ایک قدامت پسند دوستوں نے سُرخ رومال پہننے سے ہچکچاہٹ محسوس کی۔ میں نے انہیں ازراہِ مذاق کہا "کہ بھائی کم از کم چلڈرن پیلس کے معائنہ کے وقت تک تو آپ سُرخ رومال پہننا گوارا کر لیں"۔ اس پر انہوں نے منہ بسورتے ہوئے رومال پہن لئے۔ بچے اپنی کارروائی مکمل کر چکے تو ہم دروازے سے اندر داخل ہوئے میرے ساتھ اندر جاتے ہوئے ایک بڑے سرکاری افسر نے بچوں کے منظم اور مہذب استقبال کے بارے میں میری رائے پوچھی۔ میں نے ان سے کہا کہ "بچوں کا یہ استقبال سوشلسٹ معاشرے میں اجتماعی اصولوں کی بالادستی کا مظہر ہے" میں نے ان سے پُوچھا کہ "کیا وہ بچوں کی اس منظم اور تربیت یافتہ فورس کی کمان کرنا پسند کریں گے"۔ تو انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ اس عرصہ میں ہم بہت بڑی محل نما عمارت کے دروازے تک پہنچ گئے۔ سب سے پہلے ہمیں اس کمرے میں لے جایا گیا جہاں بارہ سال کے بچے فنی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ اس جگہ بچوں کو موٹر کار اور اس جیسی مشینری کے پرزہ جات بنانے" انجن اور چپیاں تیار کرنے' انجن اوور ہال کرنے' موٹر گاڑیاں چلانے اور ان کی مرمت کرنے کے طریقے اور دوسری بے شمار چیزیں بنانے کے ہنر سے بہرہ مند کیا جاتا ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ بچے اپنے سکولوں سے فارغ ہو کر باقی وقت میں ہفتہ میں دو ایک مرتبہ فنی تربیت حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں۔ یہ بچے اتنے ذہین ہوتے ہیں کہ سکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ مکمل شہری کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں سنبھال سکتے ہیں۔ انہیں نئے طریقے سے کوئی تربیت حاصل کرنی نہیں پڑتی۔ اس کے علاوہ "جُوچے" اصول کے مطابق یہ بچے بچپن سے ہی خود اعتمادی اور خود انحصاری کے سنہرے اصولوں سے واقف ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد ہم دوسرے کمرے میں گئے۔ یہاں پر دس بارہ سال کے بچے مواصلات جیسے اہم شعبہ میں جز وقتی تربیت حاصل کرنے کے لئے کام کر رہے تھے۔

گائیڈ نے ہمیں بتایا کہ صدر کِم اِل سُنگ کی ہدایت کے مطابق مواصلات کا نظام ملک کی شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ "جوچے" اصول کے مطابق ملک کے تمام بچوں اور افراد کو اس نظام کے بنیادی اصولوں سے واقفیت دلائی جاتی ہے تاکہ ہنگامی حالات میں یہ شہری ملکی خدمات سرانجام دے سکیں۔ اس جگہ کمرے میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی تربیت دی جاتی تھی گائیڈ نے بتایا کہ یہاں سے تربیت حاصل کرنے کے بعد بچے نجی زندگی میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے تمام فنی کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ ٹیلی ویژن کے ساتھ والے کمرے میں چھوٹی عمر کی لڑکیاں کوریا کی معروف طرز کی مصنوعی کپاس اور اُون کے ریشے سے تصویریں بنانے کی تربیت حاصل کر رہی تھیں۔ یہ فن نہایت پیچیدہ ہے مگر کوریا میں بچہ بچہ اس میں تربیت حاصل کرتا ہے۔ چوتھے کمرے میں بچوں کو پھول اگانے انہیں آراستہ کرنے کی تربیت دی جا رہی تھی اس سے ملحق کمرے میں آٹھ دس سال کے بچے ٹیبل ٹینس کی پریکٹس کر رہے تھے۔ ہمارے چند ساتھیوں نے بچوں کے ساتھ ٹیبل ٹینس کھیلا مگر بچے اتنے تیز تھے کہ وہ ان پر سبقت لے گئے۔ اب ہم اگلے کمرے میں گئے تو یہاں دیہات میں سبزیاں، پھل، گندم، چاول اور دوسری اجناس کاشت کرنے اور بہتر بیج تیار کرنے کے مضامین کی عملی تربیت دی جا رہی تھی۔ اس کورس کا یہ مقصد بھی ہے کہ شہر کے بچوں کو دیہات اور گاؤں کے عوام کی مشکلات سے عملی واقفیت دلائی جائے۔ اس سے اگلے کمرے میں دس بارہ سال کی لڑکیاں کشیدہ کاری کی تربیت حاصل کر رہی تھیں ساتھ والے کمرے میں موسیقی کے ساز "باس" پر موسیقی سکھانے اور راگ گانے کی تربیت دی جا رہی تھی یہ ساز کوریا میں زیادہ تعداد میں بنایا جاتا ہے اور نہایت مقبول ہے اور تقریباً تمام خواتین یہ ساز بجانا جانتی ہیں گویا یہ ان کی ثقافتی زندگی کا ایک جزو بن چکا ہے۔ اس کے بعد ہم بہت بڑے ہال کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں پانچ چھ سال سے دس سال کی بچیاں جمناسٹک ڈانس جو کہ ۲۲ مئی کو ہم نے دیکھا تھا سیکھ رہی تھیں۔ یہ بھی جزوقتی



کوریا: چلڈرن پیلس میں وزیرِ اعظم اور پارٹی کے دوسرے افراد بچوں کی جز وقتی تربیت کو دیکھ رہے ہیں

تربیت کا حصہ تھا۔ آخر میں ہمیں ایک اور میوزک کے کمرے میں لے جایا گیا جہاں بچے "ہاس" کی طرح اور مختلف دوسرے آلاتِ موسیقی پر پریکٹس کر رہے تھے۔ پیلس میں کمرے تو اور بھی بہت سے تھے جہاں بچے اور بچیاں مختلف امور کی تربیت حاصل کر رہی تھیں۔ مگر چونکہ ساڑھے بارہ بجے ہمیں آڈیٹوریم میں بچوں کا آرٹ شو دیکھنے جانا تھا اس لئے ہم جلدی سے فارغ ہو گئے اور آڈیٹوریم پہنچ گئے۔ ہمارے آنے کے تھوڑے عرصے بعد وزیرِ اعظم پاکستان، بیگم بھٹو اور صدر اور مادام کم اِل سُنگ بھی وہاں تشریف لے آئیں۔ یہاں میں یہ بتاتا چلوں کہ ہم نے جو چلڈرن پیلس دیکھا تھا وہ کوریا میں اپنی طرز کا منفرد ادارہ ہے۔ مگر کوریا کے دوسرے شہروں اور دیہات میں بھی اس طرز پر چھوٹے بڑے جز وقتی فنّی تربیت کے ادارے موجود ہیں جہاں پانچ سال سے ۱۲ سال کے بچے اور بچیاں تربیت حاصل کرتی ہیں۔

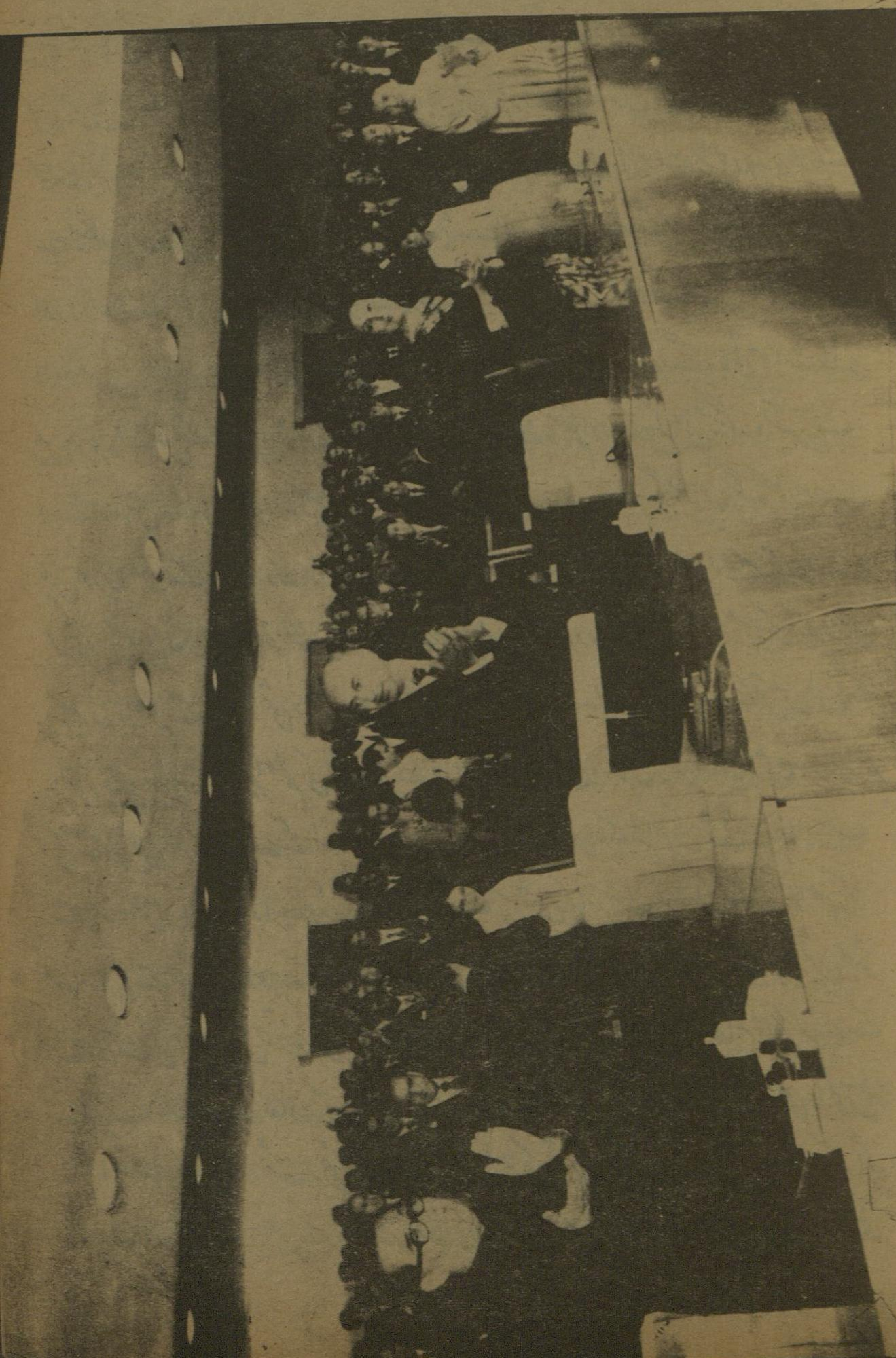
بچّوں کا آرٹ شو

وزیرِ اعظم پاکستان اور صدر کم اِل سُنگ جب اپنی اپنی سیٹوں پر پہنچے تو تقریباً ۵ ہزار بچوں اور ہزار ڈیڑھ ہزار دوسرے مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا آڈیٹوریم ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ دونوں لیڈر اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو ہال میں خاموشی چھا گئی۔ پردۂ سکرین اٹھایا گیا اور آرٹ شو کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلا ایکٹ پاکستان اور کوریا کے ترانے بجانے کے بعد "سوہنی دھرتی اللہ رکھے" کے مقبول نغمے سے شروع ہوا۔ یہ نغمہ پچاس سے زیادہ لڑکے اور لڑکیوں نے آرکسٹرا کی دھن پر گا کر سنایا۔ آپ حیران ہوں گے کہ اس ایکٹ میں آٹھ نو سال کے بچے نے آرکسٹرا کے کنڈکٹر کے فرائض نہایت پھرتی اور خوش اسلوبی سے سر انجام دیئے۔ اس پیشکش کے دوسرے حصے میں کوریا کا مقبول گانا گایا گیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ "سب بچے کامریڈ کم اِل سُنگ کی گود میں خوشی سے تربیت حاصل کر رہے ہیں"۔ اگلی پیشکش دیہات کے بچے اور بچیوں کے دیہی پیداوار میں اضافہ کی کارکردگی کے بارے میں تھی۔

اس میں گانے اور ڈانس کے ساتھ کھیتی باڑی کے حسن اور اس سے خوشیاں میسر آنے کا اظہار کیا گیا تھا۔ تیسری پیشکش میں نوجوان لڑکیاں اور لڑکے گانے اور رقص کے ساتھ شمالی اور جنوبی کوریا کو متحد کرنے والی ریل گاڑی کا منظر پیش کر رہے تھے۔ سب سے پہلی پیشکش کی طرح اس میں بھی ایک ننھی سی آٹھ نو سال کی بچی نے آرکسٹرا کے کنڈکٹر کے فرائض نہایت خود اعتمادی اور خوبصورتی سے سرانجام دیئے۔ چوتھی پیشکش میں رنگ برنگی پٹیوں کو ایک کھمبے کے اردگرد باندھ کر رقص اور گیت گائے گئے، یہ منظر کوریا میں موسمِ بہار میں فصلوں کے پک جانے اور دیہی عوام کی خوشحالی کا مظہر ہوتا ہے۔ اس پیشکش کے دوسرے حصے میں پاکستان کے مشہور فن کار امانت علی کا مقبول گانا "چاند میری زمیں پھول میرا وطن" گا کر سنایا گیا۔ پانچویں پیشکش میں انقلابی فوج کے جوانوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے مقبول نغمہ پیش کیا گیا۔ یہ انقلابی اوپرا "ان جنگلات سے کہدو" سے لیا گیا تھا۔ اس کے دوسرے حصہ میں ایک نغمہ پیش کیا گیا جس کا مفہوم تھا" نوجوان کامریڈو ہاگاؤ اور خوش رہو"۔ اس پیشکش میں ایک ننھی منی بچی نے آرکسٹرا کنڈکٹر کے فرائض ادا کئے۔ چھٹی پیشکش میں بچوں کی ایک خوبصورت پتنگ اڑانے کی داستان کو ڈانس اور گانے میں پیش کیا گیا داستان یوں تھی "شمالی اور جنوبی کوریا کو متحد کرنے کے لئے شمالی کوریا کے بچے پتنگ کے ذریعے جنوبی کوریا کے بچوں کو پیغام بھیجتے ہیں اور ان سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ بھی اپنے ملک میں جدوجہد کریں تاکہ شمالی اور جنوبی کوریا کی سرحد پر اقوامِ متحدہ کی پولیس پوسٹ کی رکاوٹوں کو عبور کیا جا سکے۔ یہ پتنگ اڑن کھٹولے کی طرح کا تھا اور شمالی کوریا کے بچے اس پر اڑ کر جنوبی کوریا کی سرحد تک پہنچتے ہیں کہ جنوبی اور شمالی کوریا کی سرحد پر اقوامِ متحدہ کی امن فوج ان کو روک لیتی ہے۔ سرحد کے پار دوسری طرف جنوبی کوریا کے بچے شمالی کوریا کے جھنڈے کو پہچان لیتے ہیں اور ان بچوں سے بات چیت کرنے کے لئے بے تاب ہو جاتے ہیں۔ آخر میں شمالی کوریا کے بچے جنوبی کوریا کے بچوں کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ "دنیا کے تمام بچے بھائی بھائی ہیں مگر ہم آپ سے مل نہیں سکتے کیونکہ

آپ اور ہمارے درمیان اقوامِ متحدہ کی امن فوج کی چوکی حائل ہے۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے تمہیں جدوجہد کرنی چاہیئے"۔ اس سے اگلی ساتویں پیشکش میں درجنوں کی تعداد میں بچے اور بچیوں نے خوبصورت پہاڑیوں پر چڑھنے اُترنے اور کیمپ لگانے کے دلکش مناظر ڈانس اور گانے میں پیش کئے۔ نویں پیشکش میں بہت سے بچوں اور بچیوں نے میوزک کے ساز "اکارڈین" کے ساتھ محبت بھرے گیت گائے۔ اس پیشکش کے دوسرے حصہ میں پچاس کے قریب لڑکیاں کورس میں "جیوے جیوے پاکستان" کا مقبول گانا گاتی ھیں جبکہ ایک ننھی مُنی بچی نہایت خوبصورتی سے آرکسٹرا کنڈکٹر کے فرائض انجام دیتی ہے۔ "اوپرا" کی چھٹی پیشکش میں بھی ایک لڑکی نے اسی طرح آرکسٹرا کنڈیکٹ کیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ایک اور بچی نے جل ترنگ ساز پر نہایت پھرتی اور خوبصورتی سے اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ آخری پیشکش میں تمام فن کار سٹیج پر سامنے آئے اور انہوں نے دنیا کے تمام بچوں کو دوستی کا پیغام دیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ "کاش ہمارا گیت، دوستی بھرا گیت دنیا کے دور دراز کونوں تک گونجتا ہوا سنائی دے"۔ اس کے بعد تمام فنکار بچوں نے پاکستان اور کوریا کے سربراہوں کو سلامی دی اور شو کا اختتام ہوا۔ وزیرِاعظم پاکستان اور صدر کِم اِل سُنگ اپنی نشستوں سے اٹھ کر باہر آگئے، ہم نے بھی اپنی اپنی کاروں کا رُخ کیا۔ بچوں کے فن کا یہ مظاہرہ دوسرے مظاہروں کی طرح نہایت عمدہ اور پُرکشش تھا۔ کوریا کے انقلابی عوام نے تو پہلے بھی اپنی ذہنی، فکری اور فنکارانہ صلاحیتوں سے ہمیں بے حد متاثر کیا تھا۔ مگر آج چلڈرن پیلس کی تربیت کے مناظر اور بچوں کے فن کے مظاہرے نے ہمیں گرویدہ بنالیا۔ ان تمام پیشکشوں میں حصہ لینے والے بچوں کی عمر ۵ سال سے ۱۱ گیارہ سال تک ہوگی اتنی چھوٹی عمر میں اتنی اعلیٰ فنکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کوریا کے عظیم عوام کی خود اعتمادی اور زندہ دلی کا ثبوت ہے۔ یہاں سے دو بجے کے قریب فارغ ہونے کے بعد ہم اپنے مہمان خانوں میں چلے گئے۔ جہاں کھانے کی میزوں پر ہمارے دوستوں نے بچوں کے فن کو سراہتے ہوئے اس کی بہت تعریف کی کھانا کھانے

کے بعد ہم نے تھوڑی دیر آرام کیا تاکہ جمنیزیم ہال میں عظیم عوامی اجتماع میں شرکت کے لئے تازہ دم ہو سکیں۔



چلڈرنز پیلس میں بچوں کے ثقافتی شو ؛ صدر کم ال سنگ ، مسٹر بھٹو ، بیگم بھٹو ، مادام کم ال سنگ ، تاج محمد لنگاہ نمایاں ہیں

جمنیزیم ہال

یہاں پانچ بجے وزیرِاعظم بھٹو نے "پیانگ یانگ" کے عوام کے عظیم اجتماع سے خطاب کرنا تھا۔ میں ہال میں پونے پانچ بجے کے قریب پہنچا۔ یہ ہال عوامی ثقافتی ہال کے پہلو میں واقع ہے اور ۱۹۷۵ء میں مکمل ہوا تھا۔ عوامی ثقافتی ہال جس میں ہم نے ضیافت کھائی تھی ۱۹۷۲ء میں تیار ہوا تھا۔ یہ دونوں ہال جدید کوریا کے محنت کش عوام کی عظمت اور ترقی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ جمنیزیم ہال بہت بڑی جدید عمارت ہے منتظمین مجھے پیچھے کے کمرے سے ایک بڑے لاؤنج میں لے گئے۔ یہاں کوریا کے وزراء اور دوسرے اعلیٰ حکام تشریف فرما تھے جن سے میرا تعارف کرایا گیا وفد کے باقی اراکین میں سے وزراء، ممبرانِ اسمبلی اور اعلیٰ حکام خصوصی دعوت ناموں پر اس لاؤنج میں لائے گئے۔ باقی حضرات ہال میں موجود مخصوص نشستوں پر بٹھا دیئے گئے۔ چند لمحوں بعد وزیرِاعظم اور صدر کم ال سنگ تشریف لائے اور ہال کے اندر بہت وسیع جگہ پر اپنی نشستوں کی جانب چلے گئے اس جگہ پچھلی صف میں وزیرِاعظم کے علاوہ وزراء اور دوسرے سینئر ارکان کی نشستیں تھیں اور دوسری رَو میں ممبرانِ اسمبلی اور اعلیٰ حکام تشریف فرما تھے میری نشست دوسری رو میں لاؤڈ سپیکر کے بالکل پیچھے وزیرِاعظم کے ساتھ تھی۔ جب وزیرِاعظم تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو میں ان کے بالکل پیچھے بیٹھا تھا۔ وزیرِاعظم کی تقریر سے پہلے "پیانگ یانگ" کی انقلابی کمیٹی کے چیئرمین نے وزیرِاعظم کی شان میں تعریفی کلمات کہے اور اس کے بعد انہوں نے کوریا کے عوام کی ترقی اور جد و جہد کے بارے میں بتایا اور اپنے لیڈر کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ انہوں نے پاکستانی عوام کو سامراج کے خلاف جد و جہد کرنے پر خراجِ تحسین پیش کیا۔ چیئرمین انقلابی کمیٹی نے چیئرمین بھٹو کے مؤقف کی حمایت کی کہ "تیسری دنیا کے ممالک نیا بین الاقوامی اقتصادی نظام قائم کرنے کے لئے ایک دوسرے سے تعاون کریں" انہوں نے مغربی ممالک کے ترقی پسند حلقوں کو بھی عالمی سطح پر نیا اقتصادی اور ثقافتی نظام قائم کرنے کی تلقین کی۔ انہوں نے کہا کہ "ایشیا اور تیسری دنیا میں زبردست انقلابی تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور تیسری دنیا کی قومیں اپنی

آزادی کے لئے جانوں کے نذرانے پیش کر رہی ہیں۔ ان واقعات سے کوریا کے عوام بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور سامراج کے جارحانہ عزائم کے خلاف وہ آخری دم تک مظلوم عوام کا بھرپور ساتھ دیں گے"۔ اس کے بعد وزیر اعظم بھٹو تقریر کرنے کے لئے مائیک پر آئے تو ہال میں موجود ۳۰ ہزار کے قریب عوام نے تالیاں بجا کر ان کا خیر مقدم کیا۔ بھٹو صاحب نے اپنی تقریر میں پہلے پانچ دنوں میں کوریا کے عوام کی جس عظیم ترقی کا مشاہدہ کیا تھا، اس کی تعریف کی اور کہا کہ کوریا کے عوام کے تجربات سے دوسری قومیں رہنمائی حاصل کر سکتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان اقوام عالم کی خود مختاری اور آزادی کے اصول کی بھرپور حمایت کرتا ہے۔ کوریا کے عوام کی سامراج دشمنی اور استحصال کے خاتمے کی جدوجہد کی تائید کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایشیا کے عوام نے تاریخ میں عظیم قربانیاں دی ہیں مگر کچھ عرصہ سے ایشیا کے عوام سامراجی اور نوآبادیاتی نظام کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں اور اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ایشیا کے عوام کو اتحاد کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔ اگرچہ بعض ممالک میں سامراج کا جنازہ نکل چکا ہے۔ لیکن ابھی اس کے اثرات سیاسی اور اقتصادی شکل میں موجود ہیں بھٹو صاحب نے کہا پاکستان کے عوام کو بھی کوریا کے عوام کی طرح تین دفعہ سامراج کے ایجنٹ ملک کے ساتھ جنگ لڑنا پڑی ہے ۱۹۷۱ء کی جنگ میں بین الاقوامی سازش کے تحت ہمارے ملک کے دو ٹکڑے کر دیئے گئے ہماری حکومت نے اس ٹوٹے پھوٹے اور تباہ حال پاکستان کی تعمیر نو کے کام کا آغاز کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ کوریا ایشیا کی ایک سوشلسٹ ریاست ہے جب کہ پاکستان ایشیا کی مسلم ریاست ہے۔ اگرچہ ظاہراً ہمارے دو مختلف سماجی نظام نظر آتے ہیں مگر اصلاً ہم بھی آپ کی طرح اسلام اور سوشلزم کے سنہری اصولوں کی بنیاد پر انصاف اور مساوات پر مبنی نظام قائم کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں اس لحاظ سے ہم دونوں کی منزل ایک ہے۔ انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے چاروں اصول اسلام ہمارا دین ہے،

سوشلزم ہماری معیشت ہے، جمہوریت ہماری سیاست ہے اور طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں، کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ۱۹۷۰ء میں انتخابات میں عوام نے پیپلز پارٹی کو حکومت کرنے کا اختیار دیا۔ ہم کسی ملک سے تضاد اور تصادم کی بجائے دوستی اور تعاون کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ دوسرے سوشلسٹ ممالک سے اسلامی طرزِ زندگی برقرار رکھتے ہوئے تجربات حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اس اصول کی بنیاد پر ہم نے استحصالی سرمایہ داری نظام کو مسترد کر دیا ہے اور سائنٹیفک سوشلزم کو اپنایا ہے۔ وزیر اعظم بھٹو نے کہا کہ تیسری دنیا کے ممالک کو نیا اقتصادی نظام قائم کرنے کے لئے کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ پیرس اور نیروبی کی کانفرنسیں فیل ہو چکی ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے شمالی کوریا اور جنوبی کوریا کے عوام کے اتحاد کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ اس سلسلہ میں اگر میری خدمات کی ضرورت ہو تو نہ صرف امریکہ بلکہ جاپان کے ساتھ بھی بات چیت کرنے کے لئے تیار ہوں۔ انہوں نے شمالی اور جنوبی کوریا کی سرحدوں پر سے اقوامِ متحدہ کی نگران امن فوج کی واپسی کے مطالبے کی بھی حمایت کی بھٹو صاحب نے کہا کہ ایک وقت تھا کہ کوریا کے ہمسایہ ملک عوامی جمہوریہ چین اور امریکہ کے تعلقات خراب تھے جب کہ پاکستان کو دونوں ملکوں سے بہتر تعلقات کی سعادت حاصل تھی۔ انہوں نے کہا کہ ۱۹۶۴ء میں جب صدر جانسن کو میں نے وزیرِ خارجہ پاکستان کی حیثیت سے کہا کہ چین اور امریکہ کے درمیان سیاسی مذاکرات کا آغاز ہونا چاہیئے۔ تو صدر نے کہا کہ آپ کسی ڈاکٹر سے علاج کرائیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے ۱۹۶۴ء سے آج تک کسی ڈاکٹر سے علاج نہیں کرایا جب کہ ۱۹۷۱ء میں امریکہ کے ڈاکٹر ہنری کیسنگر پاکستان کی سرزمین سے چین میں سیاسی مذاکرات کے لئے روانہ ہوئے۔ اگر ہم چین اور امریکہ کے باہمی مذاکرات میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں تو کوریا اور امریکہ، کوریا اور جاپان کے درمیان بھی بات چیت کا راستہ ہموار کر سکتے ہیں۔

آخر میں انہوں نے کوریا کے عظیم عوام کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ جس والہانہ انداز میں آپ نے



ہم ہانگ کی بھاری مشینری کے کارخانے میں وزیر اعظم بھٹو اور صدر کم اِل سنگ

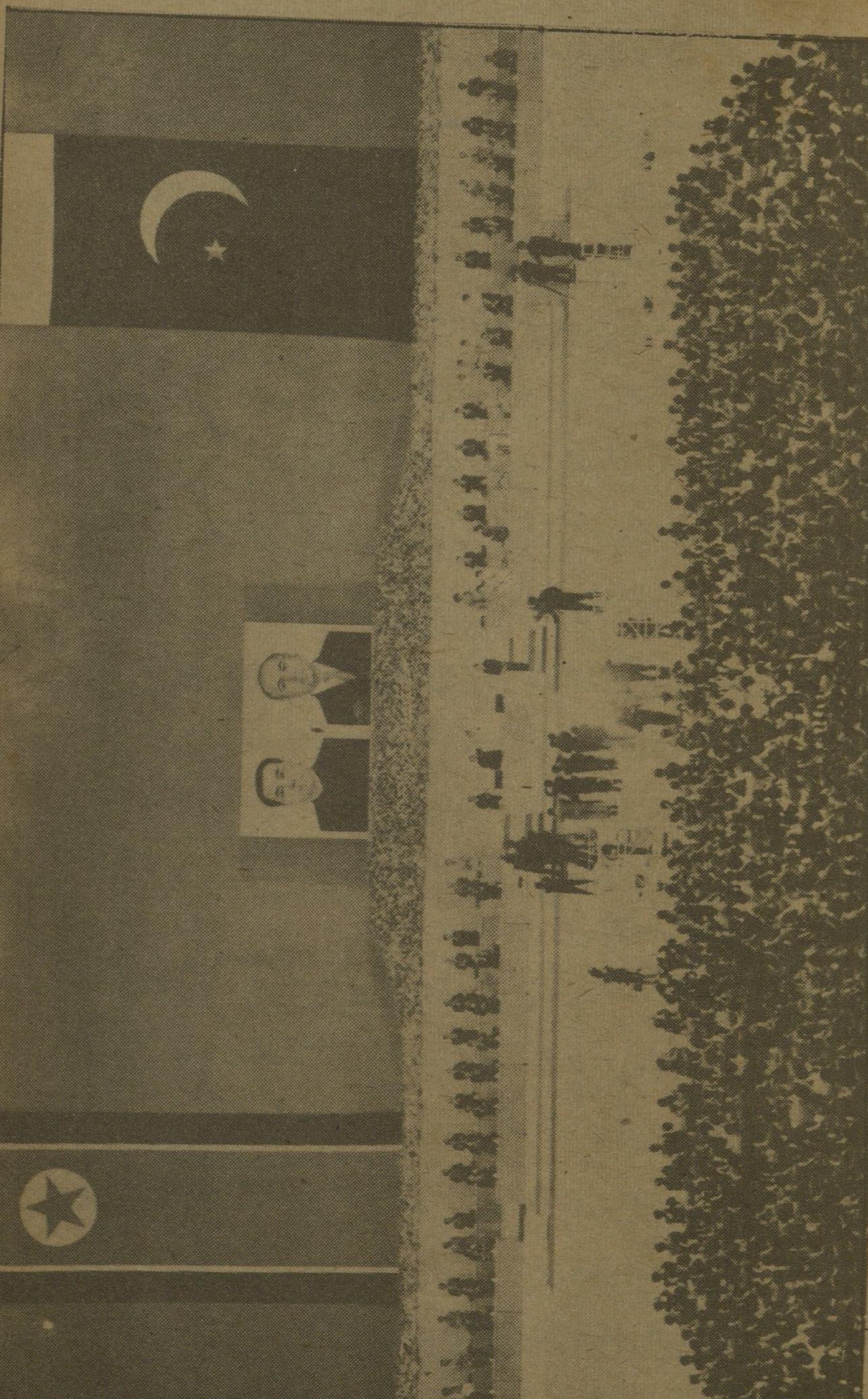
ہماری مہمان نوازی کی ہے ہم اس کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ تقریباً سوا چھ بجے کے قریب تقریب کا اختتام ہوا۔ اور خصوصی مہمان بڑے دروازوں سے اپنی کاروں کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہال سے باہر نکلتے ہوئے صدر اور مادام کِم اِل سُنگ نے ہمارے ساتھ ہاتھ ملایا اور ہم اپنی کاروں میں اپنے مہمان خانوں میں آ گئے۔

آٹھ بجے کے قریب ہم دوبارہ وزیرِ اعظم بھٹو کی جوابی ضیافت میں شرکت کے لئے عوامی ثقافتی ہال میں آئے یہ ضیافت تقریباً پہلی ضیافت کی طرح تھی۔ صرف فرق اتنا تھا کہ اس میں سب سے پہلے مسٹر بھٹو نے تقریر کی اور جواب میں صدر کِم اِل سُنگ نے تقریر کی اور بھٹو صاحب کے تیسری دنیا کے بارے میں مؤقف کی تائید کی مسٹر بھٹو نے اپنی تقریر میں حسبِ دستور دوسرے خیالات کے علاوہ کشمیری عوام کے حقِ خود ارادیت کے حکومتی مؤقف کو دہرایا مگر غور طلب بات یہ ہے کہ صدر کِم اِل سُنگ نے ہمارے مؤقف کے بارے میں اگلے روز مشترکہ اعلامیہ میں مکمل حمایت کی۔ ضیافت میں کھانے کی میز پر میرے ساتھ کوریا کے وزیرِ صنعت و صحت اور ڈائریکٹر جنرل ریڈیو بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ میں نے کوریا کے سماجی مسائل پر بات چیت کی جن کی تفصیلات آگے آئیں گی کھانے کے اختتام پر مختصر سا ثقافتی شو بھی دکھایا گیا جس میں سب سے پہلے عورتوں کے گروپ نے کوریا کا مقبول گیت "چاندنی رات" سنایا اسی گروپ نے پاکستان کا سندھی نغمہ "ہے جمالو" بھی سنایا۔ اس کے بعد خواتین کے دوسرے گروپ نے کوریا کا ایک مقبول نغمہ "خوشی کا گیت" گا کر سنایا اور اس گروپ نے پاکستانی گانا "او لال میری پت رکھیو" پیش کیا۔ بعد میں مردوں کے ایک گروپ نے دو انقلابی نغمے سنائے جس میں ایک کا مفہوم تھا "کہ ہمارا ملک ٹیکسوں سے آزاد ہے۔" دوسرے کا مفہوم تھا کہ "آؤ ہم سب نئے دور کی آزاد اقتصادیات کا گیت گائیں۔" آخر میں مردوں کے ایک گروپ نے سب سے پہلے گوریلا سپاہیوں کے اعزاز میں انقلابی گانا گایا اور اس کے بعد پاکستان کا مقبول گانا "سوہنا دیس" گایا گیا

اس کے اختتام پر وزیر اعظم بھٹو اور صدر کم اِل سنگ اُٹھ کھڑے ہوئے اور باہر چلے گئے۔

ہم سب لوگ بھی تقریباً رات کے ساڑھے دس بجے مہمان خانوں میں پہنچے۔ چونکہ کوریا میں یہ ہماری آخری رات تھی۔ موسم نہایت خوشگوار تھا اور مہمان خانے کے قریب دریا بہہ رہا تھا۔ ہم نے دریا کے کنارے سیر کرنے کا پروگرام بنایا۔ میرے ساتھ حنیف نارو صاحب بھی تھے۔ ان کو یہ بھی تھوڑی سی شکایت تھی کہ نہایت پرتکلف کھانے کھانے کے بعد سیر و تفریح کا موقع میسر نہیں آسکا۔ بہرحال ہم دریا کے کنارے سیر کرنے کے لئے نکل پڑے۔ گائیڈ اصحاب سے آنکھیں بچاتے ہوئے رات گیارہ بجے کے قریب ہم راستہ ناپتے چل پڑے چونکہ ہم اجنبی تھے اس لئے راستے میں پولیس گارڈ نے ہمارا خاموشی سے تعاقب شروع کر دیا تاکہ ہم کسی غلط راستے پر نہ چلے جائیں۔ چلتے چلتے ہم دریا کے لکڑیوں سے بنے ہوئے چھوٹے سے پل پر پہنچ گئے۔ یہاں سے ہم نے دریا کو عبور کیا، پل پر چلتے ہوئے پیانگ یانگ کی روشنیاں نہایت دلکش دکھائی دے رہی تھیں ٹہلتے ٹہلتے میں اور حنیف نارو نے پل عبور کیا اور دریا کے دوسری طرف ایک اور سڑک پر بائیں جانب نکل پڑے۔ اس طرف کافی اندھیرا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم کہیں کھو جاتے یا مُرغے بنا دیئے جاتے ہمارا تعاقب کرنے والا گارڈ کا سپاہی آگے آیا۔ اس نے ہمیں اشاروں سے کہا کہ یہاں سے واپس چلے جانا چاہیئے۔ ہم نے صورتِ حال کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے واپسی کا رخ کیا اور دوسری جانب کو ہو لیے۔ سڑک کے دائیں جانب کافی روشنی تھی۔ اس طرف کافی دور تک گھومتے پھرتے رہے۔ اس سمت میں کئی جگہوں پر کوریا کے مرد اور عورتیں علیحدہ علیحدہ اور ساتھ ساتھ سیر و تفریح کر رہی تھیں۔ یہ عورتیں اور مرد خاصے مطمئن نظر آرہے تھے۔ ایک دو نے ہمیں دیکھ کر سر ہلایا اور خوش آمدید کہا۔ سیر سپاٹا کرتے جب ہم مہمان خانہ کی جانب آتے ہوئے پولیس گارڈ کی چوکی کے قریب پہنچے تو وہاں پر کھڑا سپاہی بھاگ کر فون کی طرف گیا اور اس نے اپنے افسروں کو ہمارے خیر خیریت سے واپس پہنچ جانے کی اطلاع دی۔ اسکو مطمئن دیکھ کر ہماری ڈھارس بندھی

ابھی ہم سونے کی تیاری کرنے ہی لگے تھے کہ حکام کا نوٹس ملا کہ وفد کے اراکین سامان بند کر کے چار بجے صبح سے پہلے دروازے کے باہر رکھ دیں تاکہ پی آئی اے کی گاڑی وقت پر سامان کو ہوائی اڈہ پر پہنچا سکے۔ ہم بہت تھکے ہوئے تھے مگر جوں توں کر کے ڈیڑھ دو گھنٹے میں اپنا سامان باندھا تمام چھوٹے بڑے سوٹ کیس اور ڈبے تیار کر کے ساڑھے بارہ کے قریب ہم نے دروازے کے باہر رکھ دیئے۔ اب ہمارے پاس صرف میز بانوں کا مہیا کردہ سونے والا پاجامہ سوٹ رہ گیا تھا اور ایک پارٹی کی وردی جسے صبح پہن کر ہوائی اڈہ پر جانا تھا۔ میں اور حنیف نازؔ نے سکون کا سانس لیا اور اور اپنے بستروں میں گھس گئے۔ ابھی نیند آنے ہی والی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی باہر کوریا کی وزارتِ خارجہ کا پراٹوکول آفیسر کھڑا تھا۔ اس نے ہمیں کہا کہ "جناب تیار ہو جایئے کیونکہ کوریا کے نائب وزیرِ خارجہ صدر کِم اِل سُنگ کی طرف سے آپ کو تحائف دینے کے لئے آرہے ہیں"۔ ہم نے اصرار کیا کہ آپ خود تحائف لیکر ہمارے کمرے کے باہر رکھ دیں۔ انہوں نے وضاحت کی کہ یہ صدر کا حکم ہے کہ ہر مہمان کو ذاتی طور پر تحفے دیئے جائیں اور صدر صاحب کی طرف سے نیک خواہشات پہنچائی جائیں۔ مجبوراً ہمیں بستروں سے اٹھنا پڑا۔ ہم اپنی وردی جو بڑے اہم موقعوں پر پہنی جاتی ہے پہن کر کمرے میں بیٹھ گئے۔ نائب وزیرِ خارجہ کو آتے آتے کافی دیر لگ گئی اور ہم کوئی ڈیڑھ پونے دو بجے تک وردی پہنے بستروں میں بیٹھے اونگھتے رہے۔ آخر کار دروازے پر دستک ہوئی اور وزیرِ موصوف تحائف کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ہم سے ہاتھ ملایا اور صدر کِم اِل سُنگ کا ذاتی پیغام دیا اور تحائف دیئے۔ تحائف میں دو کتابیں بھی تھیں جن میں ایک کا نام "خوبصورت سرزمین میں "جوچے" ثقافت پھل پھول رہی ہے" اور دوسری کتاب کا نام "کوریا میں سوشلسٹ اصولوں پر ملک کی تعمیر کا کام جاری ہے" تھا، اس کے علاوہ کوریا کا مخصوص چینی کا پھولدان مجھے دیا گیا۔ ہمارے ساتھی محمد بخش نے کوریا کی وزارتِ خارجہ کو



پیانگ یانگ کے عظیم جمنیزیم ہال میں وزیراعظم بھٹو ۲۵ ہزار افراد کی ریلی سے خطاب کر رہے ہیں، صدر کم ال سنگ اور پاکستانی وفد کے دوسرے اراکین پچھلی

درخواست کی تھی کہ انہیں صدر کم اِل سُنگ کی مکمل تصانیف کا مجموعہ درکار ہے وزارتِ خارجہ نے مجموعۂ مذکورہ بھی تحائف کے ساتھ پیش کیا جس پر صدر کم اِل سُنگ کے آٹوگراف بھی تھے۔ یوں محمد بخش مجاہد تحائف کے سلسلے میں بھی ہم سب سے چست اور کائیاں نکلے ہم سے زیادہ تحفے بھی لئے اور کامریڈ کم اِل سُنگ کے دستخط بھی محفوظ کر لئے۔ چونکہ باقی ماندہ سامان باندھا جا چکا تھا اس لئے ان تحائف کو ہم نے ایک تھیلے میں بند کر کے سوٹ کیسوں کے ساتھ رکھ دیا۔ یہاں پر یہ بات خالی از دلچسپی نہ ہو گی کہ بعض رجعت پسند دوستوں نے کتابوں جیسے گراں قدر تحفے وصول کرنے کے بعد یا تو وہیں پھینک دیئے یا راستہ میں کہیں اِدھر اُدھر کر دیے۔ جو خوبصورت پھولدان ہمیں ملے تھے راستہ میں یہ دوست اس کا مذاق بھی اڑاتے رہے حالانکہ یہ نہایت قیمتی تحفہ تھا۔

نائب وزیرِ خارجہ باری باری سب کمروں میں گئے اور تحائف تقسیم کئے۔ بعض کمروں میں تو وہ اڑھائی تین بجے تک پہنچے۔ بہت سے دوستوں نے کپڑے بدلے بغیر ہی بستروں میں بیٹھ کر تحفے وصول کئے (جو یقیناً بُری بات تھی) ایک اطلاع کے مطابق ناصر رضوی کو اڑھائی بجے کے قریب جگایا گیا۔ تحفے وصول کرنے کے بعد ناصر رضوی کی نیند کچھ اتنی اکھڑ گئی کہ وہ ساڑھے تین بجے تک جاگتے رہے اور مشروب ——— سے دل بہلاتے رہے۔ اسی طرح شیخ رشید کو بھی کافی رات گئے تک جاگنا پڑا۔ انہوں نے احتراماً کپڑے بدل لئے۔ مگر مشکل یہ پیش آئی کہ جو تحفے وصول کئے گئے تھے ان کو باندھا کیسے جائے کیونکہ باقی ماندہ سامان کو باندھ کر باہر رکھ دیا گیا تھا جسے پی آئی اے کی گاڑی اٹھا کر لے گئی تھی۔ اس وقت انہیں کچھ نہ سوجھا شیخ صاحب نے شلوار سے ازار بند نکالا اور کتابیں باندھ لیں۔ جلدی میں انہوں نے ایسا کر تو لیا۔ مگر جب ہمارا طیارہ پیکنگ پہنچا تو پی آئی اے حکّام نے کوریا کے تحائف یہ سمجھتے ہوئے کہ ان کی ضرورت پاکستان میں جا کر پڑے گی ہوائی جہاز میں ہی رہنے دیئے اور باقی سوٹ کیس پیکنگ میں ہمارے کمروں میں پہنچا دیئے۔ شیخ صاحب

کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ بدقسمتی سے ان کا نالہ کوریائی تحائف کے ساتھ لپٹا رہا اور جہاز ہی میں رہ گیا۔ ان کے پاس شلوار قمیض سوٹ کیس سمیت لیکن بغیر ازار بند کے پہنچی۔ چنانچہ وہاں انہیں پہلی رات بغیر شلوار کے گزارنا پڑی۔ انہوں نے بعد میں بتایا کہ چونکہ وہ کبھی زندگی بھر اس طرح نہیں سوئے تھے اس لئے رات کو انہیں الرجی ہو گئی تھی اور درجۂ حرارت بھی بڑھ گیا تھا۔ رات کو آرام سے نیند نہیں آسکی تھی۔ اگلے دن شیخ صاحب نے یہ واقعہ اپنے تمام دوستوں کو سنایا اور سب نے مل جل کر ان کی شلوار کے ازار بند کا انتظام کیا۔ بہر حال سب دوستوں میں تحائف تقسیم ہو گئے اور ہم کافی رات گزرنے کے بعد آرام کر سکے۔

۷۶-۵-۲۶ صبح آٹھ بجے اٹھ کر جلدی سے ناشتہ کیا اور پروگرام کے مطابق ساڑھے نو بجے ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہو گئے۔ جہاز سوا دس بجے پیکنگ کے لئے روانہ ہونا تھا مگر کسی وجہ سے ہمارا طیارہ گیارہ بیس پر وہاں سے پرواز کر سکا۔ جب ہم ہوائی اڈے پر پہنچے تو وہاں ہزاروں کی تعداد میں خواتین، بچے اور مرد ہاتھوں میں پھول لئے ہمیں الوداع کہنے کے لئے آئے ہوئے تھے ابھی وزیر اعظم صاحب ہوائی اڈے پر نہیں پہنچے تھے۔ دوستوں نے گھوم پھر کر کوریا کے عوام سے ہاتھ ملائے اور باتیں کیں اس موقع پر جہاز کے پاس ہی ایک لڑکیوں کا گروپ ہلکے پھلکے دیہی رقص کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ان لڑکیوں نے ہمیں بھی رقص میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ ہمارے ساتھ عبدالوحید کٹپر صاحب اور دوسرے ساتھی احتراماً اس رقص میں شمولیت کے لئے تیار ہو گئے۔ ہم نے الٹے سیدھے طریقے سے چند ایک منٹ ان خواتین کی حوصلہ افزائی کی۔ اس دوران ہمارے پریس کے نمائندے اور فوٹوگرافر آ گئے جنہوں نے ہماری چند ایک تصویریں اتاریں۔ تھوڑی دیر کے بعد ہوائی اڈے پر چہل پہل سی مچی اور وزیر اعظم پاکستان اور صدر کم ال سنگ کی گاڑیاں فوج کے سلامی دینے والے دستے کے پاس آکر رکیں۔ وزیر اعظم نے سلامی لی اور اس کے بعد پاس ہی دوسری قطار میں کھڑے کوریا کی حکومت کے وزراء، اعلیٰ حکام اور مرکزی کمیٹی کے اراکین اور دوسرے ممتاز شہریوں کو

الوداع کہا۔ اتنے عرصے میں اخباروں کے نمائندے اور فوٹوگرافر وزیرِاعظم کے اردگرد جمع ہوگئے اوران سے کوریا کے دورے کی کامیابی کے بارے میں سوالات پوچھنے لگے وزیرِاعظم اور کوریا کے صدر بہت خوش نظر آرہے تھے۔ جہاز میں سوار ہونے سے پہلے دونوں بھائیوں کی طرح گلے ملے اور کامریڈ کم اِل سُنگ نے بھٹو صاحب کو الوداع کہا اور بھٹو صاحب اپنے طیارے میں سوار ہوگئے۔ جہاز کے کپتان نے پی آئی اے کے طیارے کی روانگی کا اعلان کیا اور طیارہ آہستہ آہستہ رن وے سے چلتا ہوا آسمان کی طرف اٹھا اور دنیا کے عظیم ترین عوام اور محنت کشوں کے سچے ساتھی ملک عوامی جمہوریہ چین کی طرف پرواز کرنے لگا۔ میرا ذہن ایشیا کے ایک چھوٹے سے ملک عوامی جمہوریہ کوریا کے عظیم انقلابی اور سماجی واقتصادی کارناموں کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں نے چھ روز کے مختصر عرصہ میں اپنی آنکھوں سے جو مشاہدات کئے ان کا مختصر سا خلاصہ اوپر کی سطور میں درج کردیا گیا ہے۔ مزید ہر موضوع پر تفصیلات بھی لکھی جاسکتی ہیں، مگر اس کے لئے علیحدہ مزید تصانیف کی ضرورت ہے۔ تاہم میں نے جو کچھ دیکھا۔ اس کے بارے میں پاکستان کے محنت کش عوام کو ہر ممکن تفصیل بتانا ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں پر رجعت پسند عناصر نے سوشلسٹ ممالک کے بارے میں بہت عجیب وغریب داستانیں گھڑ رکھی ہیں۔

کوریا کے بارے میں چند مزید معلومات

شمالی کوریا کامریڈ کم اِل سُنگ کی عظیم قیادت میں ۲۰ سال کی طویل مسلح جدوجہد کے بعد ۱۹۴۶ء میں آزاد ہوا۔ ملک کا دوسرا حصہ جنوبی کوریا جنگِ عظیم دوم کے اختتام پر پہلے جاپانی سامراج اور بعد میں امریکہ کے تسلط میں چلا گیا۔ شمالی کوریا کی آبادی ایک کروڑ ۷۰ لاکھ کے قریب ہے۔ اس کا کل رقبہ ایک لاکھ ۲۱ ہزار ایک سو ۹۳ مربع کلومیٹر ہے (آٹھ کلومیٹر ۵ میل کے برابر ہوتے ہیں) اس کا دارالخلافہ پیانگ یانگ ہے جس کی آبادی ۱۲ لاکھ ہے اس کے دوسرے اہم شہروں میں ہم ہانگ کا صنعتی شہر ہے اس کی آبادی بھی پیانگ یانگ



کوریا کے دورے کے اختتام پر وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو
کو صدر کم ال سنگ الوداع کہہ رہے ہیں

کے برابر ہے۔ آزادی کی طویل جنگ کی وجہ سے عوامی جمہوریہ کوریا نہایت خستہ حالت میں تھا یہاں کوئی صنعت نہیں تھی۔ زراعت بھی نہ ہونے کے برابر تھی مگر پچھلے ۳۰ سال میں ملک نے بے پناہ ترقی کی ہے اور عوامی جمہوریہ کوریا کی فی کس آمدنی امریکہ کے ایک ہزار ڈالر یعنی پاکستان کے دس ہزار روپے ہے۔ اگرچہ مغربی ذرائع کے مطابق ۴۰۰ ڈالر یعنی ۴۰۰۰ روپے فی کس سالانہ بتائی جاتی ہے جو غلط پروپیگنڈا ہے۔ چونکہ مغربی ممالک عوامی جمہوریہ کوریا کی بے پناہ ترقی اور خوشحالی کو گوارا نہیں کر سکتے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سوشلسٹ ممالک میں فی کس آمدنی کا تصوّر مغربی ممالک سے مختلف ہے۔ سامراجی ممالک کے پروپیگنڈا کی یہ صورتِ حال ہے کہ جن دنوں ہم کوریا کا دورہ کر رہے تھے، لندن کے معروف اخبار ٹائمز میں مضمون چھپا جس میں کہا گیا کہ کوریا کی اقتصادیات کا دیوالیہ نکل چکا ہے کیونکہ کوریا کے غیر ملکی سفارتخانے حکومت اور اپنے لیڈر کے پروپیگنڈا کے لئے بے پناہ رقم خرچ کرتے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ یہ مضمون پاکستان کے ایک رجعت پسند اخبار میں بھی انگریزی زبان میں شائع ہوا۔ حالانکہ سفارتی آداب کا تقاضا تھا کہ وزیر اعظم کے کوریا کے دورے کے دوران ایک دوست ملک کے خلاف ایسا زہریلا مواد نہیں چھاپنا چاہیئے تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنے دورے کے دوران کوریا کی ترقی اور خوشحالی کے ولولہ انگیز مناظر دیکھے۔ ان کے مطابق اقتصادی دیوالیہ پن تو کیا کوریا ایشیا میں جاپان اور جمہوریہ چین کے بعد فوجی اور اقتصادی طاقت کی حیثیت رکھتا ہے اور مستقبل میں جب، تاریخ کے فطری اور منطقی عمل کے تحت شمالی اور جنوبی کوریا متحد ہو جائیں گے تو یہ ملک ایک عظیم بین الاقوامی فوجی اور اقتصادی طاقت کی حیثیت سے ابھرے گا۔ یہ سب کچھ کوریا کے موجودہ نظامِ حکومت اور کامریڈ کم اِل سنگ کی عظیم انقلابی قیادت اور کوریا ورکرز پارٹی کی سوشلسٹ طرز کی تنظیم لائحہ عمل اور کارکردگی کی بدولت ہے۔

——— کوریا میں اگرچہ آزادی کی جدوجہد بہت عرصہ پہلے سے جاری تھی اور مختلف ترقی پسند دھڑے جاپانی سامراج

کے خلاف لڑ رہے تھے مگر جدوجہد کو منظم شکل ۱۹۳۶ء میں کوریا ورکرز پارٹی کی انقلابی کمیٹی اور گوریلا طرز کی جنگی مہارت کی بنیاد پر میسر آئی اور یہ جدوجہد ملکی آزادی کا باعث بنی۔ کامریڈ کم اِل سنگ شروع ہی سے کوریا ورکرز پارٹی کے سیکرٹری جنرل چلے آرہے ہیں۔ اس کے بعد کوریا ورکرز پارٹی کی مرکزی کمیٹی کو اہمیت حاصل ہے جو عملاً حکمرانی کرتی ہے۔ مرکزی کمیٹی میں کوئی دو سو کے قریب ممبران ہیں، جس کی شکل وصورت ایک لحاظ سے ہماری پارلیمانی پارٹی کی طرح ہے۔ روزمرہ کے حکومتی اور پارٹی امور طے کرنے کے لئے ایک درجن کے قریب افراد پر مشتمل "پولٹ بیوریو" موجود ہے۔ یہ ادارہ پارٹی اور حکومت کی اہم پالیسیاں مرتب کرتا ہے۔ اگرچہ اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے وزراء مختلف محکموں کے انتظامی سربراہ، کھیتوں فیکٹریوں کے منیجر اور دوسرے اعلیٰ حکام کا سلسلہ موجود ہے۔ تاہم "پالٹ بیورو" کو ہم اپنے ملک کی مرکزی کابینہ سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ مرکزی کمیٹی کی بے شمار سب کمیٹیاں ہیں جو امورِ خارجہ، دفاع، اقتصادیات، زراعت، صنعت، فنی ثقافتی، تعلیمی اور دوسرے شعبوں کے بارے میں اپنی ماہرانہ پالیسیاں مرتب کرتی ہیں۔ وزراء اور دوسرے انتظامی سربراہ براہِ راست مرکزی کمیٹی کی ہدایات کی روشنی میں کام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوریا کے جو آٹھ صوبے ہیں ان میں ہماری طرح کی صوبائی حکومتیں نہیں ہیں، ہر صوبے میں پارٹی کی صوبائی کمیٹی موجود ہے اور اس کے وسیع اختیارات ہیں جن کی بنیاد پر صوبے کے انتظامی امور سنبھالے جاتے ہیں۔ تاہم مرکزی کنٹرول سنٹرل کمیٹی کے پاس ہے۔ صوبائی کمیٹیوں کے علاوہ علاقائی کمیٹیاں موجود ہیں ان کو ہم ضلعی یا تحصیل تھانہ کی کمیٹیاں نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ یہ کمیٹیاں پیداواری یونٹ کے انتظامی امور کی تقسیم کی بنیاد پر قائم ہیں۔ مثلاً جہاں فیکٹری موجود ہے وہاں فیکٹری کے مزدوروں اور اس ایریا کے شہریوں پر مشتمل پارٹی کی انقلابی کمیٹی موجود ہے۔ جو فیکٹری کے انتظامی امور کے علاوہ پارٹی کی تنظیم اور عوامی رابطہ کے فرائض سرانجام دیتی ہے۔

دیہات میں اجتماعی کھیتی باڑی کے فارم کی آبادی کی نمائندہ ورکرز پارٹی کی انقلابی کمیٹی قائم ہے۔ شہروں میں جہاں فیکٹریاں نہیں ہیں وہاں پر سٹریٹ کمیٹیاں ہیں جو فیکٹری اور فارم کی کمیٹیوں کی طرح فرائض انجام دیتی ہیں۔ واضح رہے کہ ان کمیٹیوں کے ممبران اور عہدیداران کوریا ورکرز پارٹی کے ممبر ہوتے ہیں۔

کوریا ورکرز پارٹی کی ملک میں ۳۰ لاکھ کے قریب ممبر شپ ہے جبکہ ملک کی کل آبادی ایک کروڑ ۷۰ لاکھ ہے۔ چونکہ پارٹی کی ممبر شپ کی شرائط کڑی ہیں اور عوام میں خدمت، کردار، عمل، قیادت کی صلاحیتیں، عوامی مسائل پر مکمل عبور، نظریاتی، فلسفیانہ اور منطقی امور کے بارے میں مکمل واقفیت ایک ممبر کے لئے لازمی ہے۔ اس لئے پارٹی کی ممبر شپ محدود ہے۔ ملک کے جو شہری پارٹی کے ممبر بننا پسند نہیں کرتے یا اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ ان کے لئے کوئی مجبوری اور بندش نہیں ہے جو افراد پارٹی کے ممبر نہیں ہیں وہ ہم خیال تصور کئے جاتے ہیں۔ کوریا ورکرز پارٹی کے علاوہ اور کوئی پارٹی نہیں ہے۔ کھیت فیکٹری اور سٹریٹ کمیٹی کے اراکین کا انتخاب پارٹی سے جمہوری طرز پر عمل میں آتا ہے۔ ورکرز پارٹی کی طرف سے ایک یا ایک سے زیادہ امیدواروں کا پینل پیش کیا جاتا ہے۔ اور مقبول ترین امیدوار پانچ پانچ سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں۔ اس معیّنہ مدّت سے پہلے اگر کوئی کمیٹی کا ممبر اور عہدیدار اپنے فرائض سے کوتاہی کرے تو جمہوری طریقے سے اس پر عدم اعتماد کیا جاتا ہے۔ مگر ایسے واقعات نہ ہونے کے برابر ہیں جس کی بڑی وجہ ان افراد کی ذہنی، فکری، نظریاتی، انقلابی اور قومی اقدار کی مکمل پاسداری ہے۔ نچلی سطح کی یہ کمیٹیاں صوبائی کمیٹیوں کا انتخاب کرتی ہیں اور صوبائی کمیٹیاں اپنے اوپر کی مرکزی کمیٹیوں کا چناؤ کرتی ہیں۔ مرکزی کمیٹی پارٹی کے سیکرٹری جنرل کا انتخاب کرتی ہے اور اس کی بھی ۵ سال مدّت ہے۔ اس کے بعد نئے طریقے سے نیچے سے اوپر تک انتخاب ہوتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ صدر کم ال سنگ کوریا کے عوام کے اتنے ہر دلعزیز

اور عظیم قابلِ احترام رہنما ہیں کہ ۴۰ سال سے پارٹی کے سیکرٹری جنرل ہیں اور ۳۰ سال سے ملک کے صدر جمہوری طریقے سے مسلسل منتخب ہوتے آ رہے ہیں۔

فیکٹری کھیت اور سٹریٹ کمیٹیوں کے پاس ، پارٹی کی تنظیم اور عوامی رابطہ کی مہم کے فرائض کے علاوہ امنِ عامہ، عدالتی ، پولیس اور دوسرے انتظامی اختیارات بھی ہوتے ہیں۔ یہ کمیٹیاں مقامی طور پر ہر نوعیت کے جرائم کی تحقیقات اور انصاف خود کرتی ہیں۔ یہاں پر ہماری طرح کا کوئی پولیس سٹیشن موجود نہیں ہے۔ جب کوئی جرم ہوتا ہے تو مدعی ملزم کے خلاف مقامی کمیٹی میں شکایت کرتا ہے۔ یہ کمیٹی اپنے نمائندے یا سب کمیٹی کے ذریعے تحقیقات کرتی ہے اور دونوں پارٹیوں کو کمیٹی کے سامنے پیش ہونے اور صفائی کے مکمل مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔ کوریا میں اگرچہ یونیورسٹی میں قانون پڑھانے کا شعبہ موجود ہے۔ مگر قانون میں تربیت یافتہ لوگ ملکی سطح پر انتظامی امور چلانے، قومی سطح کے رولز، ریگولیشنز اور قواعد وضوابط مرتب کرنے، بین الاقوامی اقوام کے ساتھ معاہدے اور گفت وشنید کی فنی دستاویزات تیار کرنے کے سلسلہ میں اپنی ماہرانہ صلاحیتیں استعمال کرتے ہیں۔ کوریا میں ہماری طرز پر وکلاء کے پیشے جیسا کوئی نظام نہیں ہے۔ کیونکہ ہماری طرز پر وہاں عدالتیں ہی نہیں ہیں، عوامی کمیٹیوں کے سامنے بہت کم مقدمات پیش ہوتے ہیں جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تاہم اگر کوئی لڑائی جھگڑے یا معمولی گھریلو اختلافات کے معاملات کمیٹی کے سامنے پیش ہوں تو مکمل انصاف کے تقاضے پورے ہوتے ہیں۔ ان معاملات میں اکثر صلح کرائی جاتی ہے اور دونوں کو اصلاح اور نیک چلنی کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اس کمیٹی کے فیصلوں کے خلاف اوپر کی کمیٹی پھر مرکزی کمیٹی اور اسکے بعد صدرِ مملکت تک اپیل کی جاسکتی ہے، اور اکثر انصاف کے تقاضے ایک خاندان کے فرد، بھائی بہن اور بچوں کے جذبے کی طرح پورے کیے جاتے ہیں۔ ہم اپنے معاشرے کو سامنے رکھتے ہوئے ان جھگڑوں کو زیادہ سے زیادہ بہن بھائی ماں، بیٹا باپ بیٹے کی ایک دوسرے کیلئے شکایت سے تشبیہ

دے سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سنگین جرائم قتل، چوری، ڈاکہ، اغوا، زنا، فحاشی، سمگلنگ، ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری قسم کا وہاں کوئی جرم نہیں ہوتا۔ اور جب وزیر اعظم بھٹو کی ضیافت میں گذشتہ روز میں نے وزیر صنعت اور وزیر صحت سے یہ سوال کیا کہ "کیا کوریا میں کبھی کبھار اغوار زنا قتل اور چوری جیسے سنگین جرائم ہوتے ہیں؟" تو انہوں نے میری اس بات پر زوردار قہقہہ لگایا اور کہا کہ "یہ جرائم صرف قبائلی، سرمایہ دارانہ نوآبادیاتی نظام کی پیداوار ہیں۔ سوشلسٹ نظام میں ایسے جرائم واقع نہیں ہوتے۔" یہ بات ناقابل یقین حد تک درست ہے کہ کوریا میں سالہا سال سے اب تک اتفاقاً بھی کسی سے کوئی ایسا جرم سرزد نہیں ہوا۔ میں نے جب وزیر صحت سے پوچھا کہ "کوریا میں مزدوروں کے کس قسم کے مسائل ہوتے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا کہ "چونکہ سوشلسٹ نظام میں تعلیم، صحت، روزگار، رہائش اور دوسری تمام بنیادی سہولتیں ہر شہری کو مہیا کی جاتی ہیں اس لئے ہمارے یہاں مزدوروں کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اگر مسئلہ ہے تو یہ ہے کہ ہمارے یہاں افرادی قوت کی کمی ہے اور بہت ساری ملازمتوں کی اسامیاں خالی پڑی رہتی ہیں۔" میں نے ان سے کہا کہ "اس افرادی قوت کی کمی کو پورا کرنے کے لئے دوسرے ممالک سے مزدور منگواتے ہیں؟" انہوں نے کہا "ہرگز نہیں۔" ہاں تو ہم عوامی کمیٹیوں کے سامنے عوامی امور و مسائل کی بات چیت کر رہے تھے۔ اس ضمن میں ہمیں پتہ چلا کہ شادی اور طلاق جیسے اہم معاشرتی معاملات کے اختیارات بھی ان کمیٹیوں کے پاس ہیں کوریا میں شادی بیاہ نوجوان جوڑے اپنی مرضی سے اور ذہنی ہم آہنگی کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ شادی کا طریقہ یہ ہے کہ جب ایک جوڑا شادی کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اپنے علاقہ کی کمیٹی کے سامنے پیش ہو کر ایک مخصوص رجسٹر پر اپنے دستخط کرتے ہیں۔ اس معمولی سی دستخطوں کی تقریب کے بعد میاں بیوی کی حیثیت سے رہنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس تقریب کو معاشرتی تقدس کی حیثیت دی جاتی ہے۔ شادی کے موقع پر لڑکی اور لڑکے کے والدین کے علاوہ دوست اور عزیز و اقارب بھی

موجود ہوتے ہیں۔ مقامی عوامی ثقافتی ہال یا دوسرے عوامی ادارے میں منفرد نوعیت کی کھانے پینے کی تقریب بھی منعقد ہوتی ہے، جہیز، سہرا بندی، باجا گاجا، ناچ گانا۔ جھوم ڈھولک، پیسے لٹانے اور کسی قسم کے دوسرے تماشے کرنے کا یہاں رواج نہیں ہے۔ شادی کرنے کے فوراً بعد حکومت کی طرف سے نوجوان جوڑے کو ذاتی فلیٹ یا مکان رہنے کے لئے دے دیا جاتا ہے جس کے مالکانہ حقوق بھی منتقل کر دیئے جاتے ہیں۔ میرے سوال کے جواب میں کہ "آیا کوریا میں طلاق بھی ہوتی ہے۔" تو ایک نوجوان خاتون نے مسکرا کر جواب دیا "کیوں ہو" جس کی دلیل اس نے یہ دی کہ جب لڑکا لڑکی اپنی پسند سے شادی کرتے ہیں تو طلاق کی نوبت کیسے آسکتی ہے۔ تاہم دوسرے افراد سے گفت و شنید کے بعد معلوم ہوا کہ کبھی کبھار میاں بیوی کے اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں اور معاملہ عوامی کمیٹی میں پیش ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر صلح صفائی سے مسئلہ طے ہو جاتا ہے۔ البتہ طلاق لینے کا میاں بیوی کو برابر کا حق ہے۔ طلاق کے بعد فریقین دوسری شادی کے لئے بالکل آزاد ہیں۔ لیکن ایک بیوی کی زندگی میں دوسری شادی غیر قانونی ہے۔ کوریا میں چونکہ افرادی قوت کی کمی ہے لہذا وہاں بچوں کی پیدائش پر کوئی قدغن نہیں یعنی وہاں خاندانی منصوبہ بندی جیسی کوئی شے نہیں۔ کوریا کی خواتین ہر معاملہ میں آزاد ہیں اور ملک کی ترقی میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کاج کرتی ہیں۔ آزادی سے پہلے کی جدوجہد اور خاص طور پر ۱۹۵۲ء کی امریکی سامراج کیخلاف جنگ میں مردوں کی کثیر تعداد ماری گئی تھی۔ اس وجہ سے عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔ مگر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جدید دور کا کوریا عورتوں کی محنت، جفاکشی اور پیداواری صلاحیتوں کے بغیر موجودہ ترقی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اگرچہ بچوں کے لئے ڈیڑھ سال کی عمر سے نرسری سکول ہیں، تاہم بازاروں اور گلیوں سے گزرتے ہوئے اکثر یہ منظر سامنے آتا ہے کہ خواتین اپنی پیٹھ پر گٹھری نما تھیلے میں بچوں کو اٹھائے ہوئے خرید و فروخت کر رہی ہوتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محنت مزدوری کے فرائض سرانجام دینے کے بعد فارغ وقت میں بچوں

کی پرورش اور خاندان کے دوسرے فرائض عورتیں آزادانہ طریق پر سرانجام دیتی ہیں۔ سرمایہ داری ممالک کے پراپیگنڈا کے برعکس ہم نے محسوس کیا کہ یہاں پر خاندان کا یونٹ بہت مضبوط ہے۔ میاں بیوی اپنے بچوں سے اور بچے اپنے والدین سے شدید محبت کرتے ہیں۔ عوام کو ہوٹلوں پر قطاروں میں کھڑے ہو کر کھانا لیتے ہم نے کہیں نہیں دیکھا۔ بلکہ خواتین اور بچے ہمارے گھرانوں کی طرح بازار سے سبزی گوشت اور دوسرا سودا سلف لیتے ہیں اور بالکل ہماری طرح اپنے گھروں میں تین چار وقت کا کھانا پکاتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ منافع خوری اور نجی ملکیت کی لوٹ کھسوٹ کا نظام نہ ہونے سے وہاں اشیاء بہت سستی ہیں اور عوام کو اپنی تنخواہ سے بہترین خوراک میسر آتی ہے۔ ہماری طرح گندے بازار نہیں ہیں سڑکوں پر ریڑھیاں، چھابڑیاں اور خوانچے وغیرہ نہیں دیکھے گئے۔ بلکہ بند کمروں میں خوبصورت طریقہ سے سجی ہوئی دوکانوں میں اشیاء فروخت ہوتی ہیں۔ اور یہ بات بھی حیران کن ہے کہ پورے کو ریا میں عظیم عوامی جمہوریہ چین کی طرح کہیں مچھر، مکھی، کوڑا کرکٹ اور گندگی نہیں ہے۔ تمام خواتین تقریباً ایک جیسے صاف ستھرے کپڑے پہنتی ہیں جو یا تو لمبی سکرٹ اور بلاؤز ہوتا ہے یا لمبی جبہ نما قمیض ہوتی ہے۔ عورتوں کی نیچے سے تھوڑی سی ٹانگیں ننگی ہوتی ہیں مگر وہ لمبی لمبی جرابیں پہنتی ہیں۔ مردوں کے بھی صاف ستھرے کپڑے ہوتے ہیں۔ ہم نے کسی کو ٹائی پہنے نہیں دیکھا۔ چین کی طرح چھوٹے کالر والا بند گلے کا کوٹ نما بشرٹ اور پتلون ان کا قومی لباس ہے شرٹ بھی پہنتے ہیں۔ تمام کپڑے اپنے ملک میں تیار شدہ پہنے جاتے ہیں۔ کوئی باہر کا کپڑا نہیں پہنتا۔ یہاں دو بڑی دوکانیں ایک "انٹرنیشنل سٹور" اور دوسری "ڈالر شاپ" ہے جو غیر ملکی باشندوں اور مہمانوں کی خرید و فروخت کے لئے مخصوص ہیں۔ ان پر تھوڑا بہت غیر ملکی تیار شدہ سامان فروخت ہوتا ہے۔ بچوں اور نوجوانوں کی صحت نہایت عمدہ ہے۔ اس کی ایک وجہ سکول کالج میں معیاری فزیکل ٹریننگ ہے جس میں جمناسٹک کے علاوہ فوجی تربیت بھی شامل ہے۔ ہر کسی کو یہ ٹریننگ لازمی دی جاتی ہے۔ بچوں اور نوجوانوں کے علاوہ بڑی عمر کے لوگوں کی بھی صحت

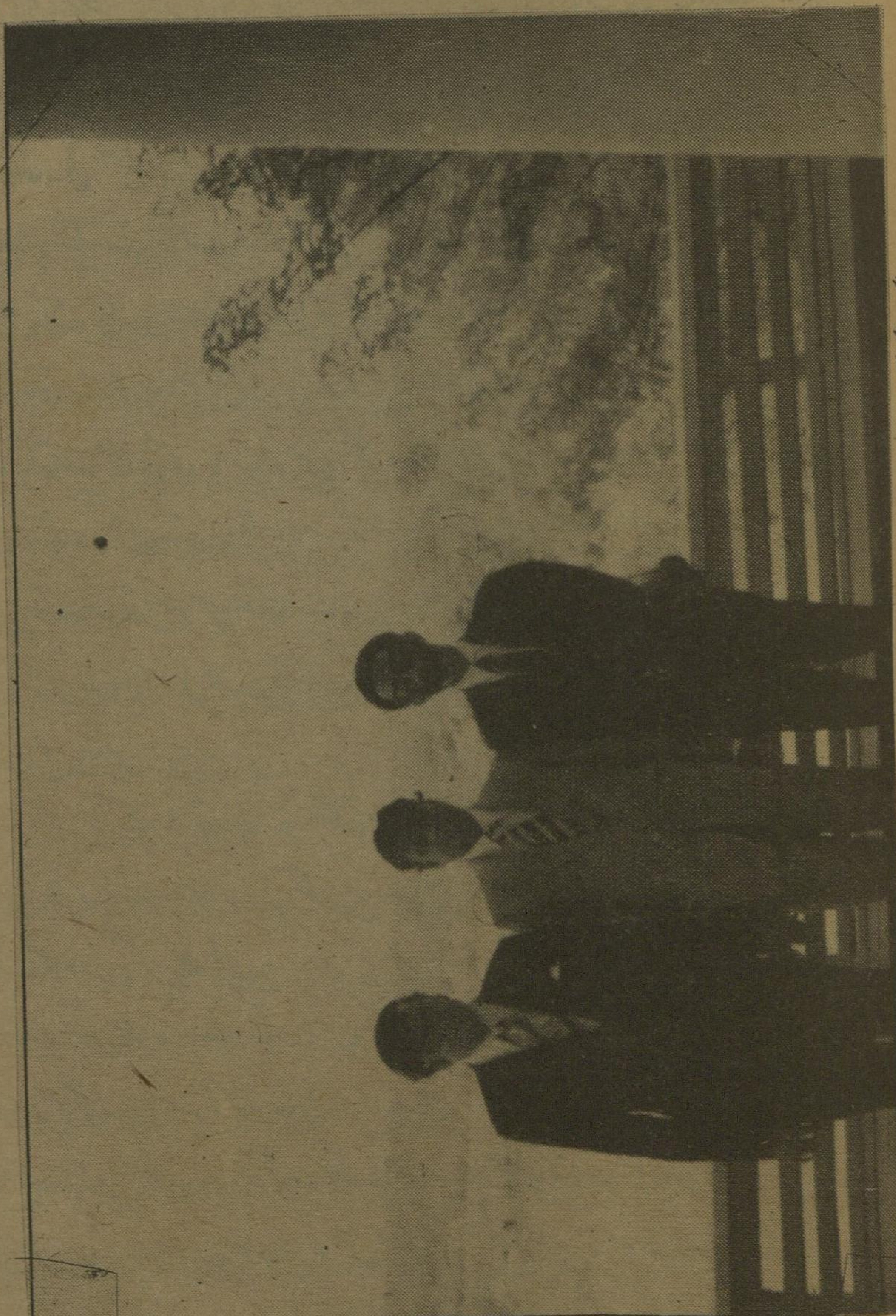
بہت اچھی ہے۔ کوریا کی ایک ضرب المثل ہے کہ ۶۰ سال کی عمر بوڑھاپا نہیں ہے۔ اور ۹۰ سال صرف طویل العمری ہے۔ کوریا میں ۷۰، ۸۰ سال اور ۸۵ سال کے افراد اکثر و بیشتر کام کرتے نظر آتے ہیں ہمارے ساتھ کھانے پر جو وزیر صحت بیٹھے تھے ان کی عمر ۸۰ سال کے قریب ہوگی مگر وہ پاکستان کے لحاظ سے ساٹھ سال کے لگ رہے تھے۔ وزیر صحت نے بتایا کہ چونکہ بچپن سے زندگی کے آخری ایام تک بہترین صحت کی سہولتیں میسر ہیں اس لئے لوگوں کی عُمر طویل ہوتی ہے۔ کوریا میں چین کی طرح کوئی شخص رات کو بھوکا نہیں سوتا۔ یہاں رشوت ستانی، بدعنوانی، اقربا پروری کی لعنتیں بالکل نہیں ہیں اور نہ ہم نے کوئی گداگر ہی دیکھا۔ قدرتی وسائل سے مالامال یہ ملک نہایت خُوبصورت ہے۔ کوریا سرسبز و شاداب پہاڑیوں، ترنم ریز دریاؤں اور ندی نالوں، گنگناتی آبشاروں، شیریں سیبوں، ناشپاتیوں، تربوز اور رنگ برنگے پھولوں کا رنگین خوش و خرم لوگوں اور انسانی آزادیوں کی لہراتی ہوئی قوس قزح کا دیس ہے جہاں فکر و غم اور رنج و مصیبت کا گزر تک نہیں۔

پاک کوریا دوستی کا مختصر جائزہ

کوریا کے ۱۹۴۸ء میں آزاد ہونے کے بعد پاکستان کی حکومت کے ساتھ ۱۹۶۰ء تک عملاً دوستانہ روابط نہیں تھے۔ اس دور میں پاکستان امریکہ کا مکمل اتحادی شمار کیا جاتا تھا۔ اس وجہ سے اقوامِ متحدہ میں بھی پاکستان امریکہ کی قراردادوں کی مکمل حمایت کرتا تھا اور پاکستان اقوامِ متحدہ کے جنوبی کوریا کے فوجی کمشن کا بھی رکن تھا۔

۱۹۶۰ء کے بعد پاکستان اور کوریا کے تعلقات کا نیا باب شروع ہوا جس میں پاکستان جنوبی کوریا کے یک طرفہ تعلقات میں بندھے رہنے کی بجائے عوامی جمہوریہ کوریا کی طرف بھی دوستی کا ہاتھ بڑھانے لگا، چونکہ اس دور میں پاکستان کے چین کے ساتھ دوستانہ تعلقات بڑھنے شروع ہو گئے تھے۔ ان کے اثرات عوامی جمہوریہ کوریا پر پڑے۔ اگرچہ ۱۹۶۸ء میں حکومت نے شمالی اور جنوبی کوریا کی حکومتوں کے کونسل جنرل کی سطح کے نمائندوں کو پاکستان میں دفاتر کھولنے کی سہولتیں فراہم کیں تاہم پاکستان کے چین کے ساتھ خصوصی تعلقات کی بنیاد پر عوامی جمہوریہ کوریا کے ساتھ بہتر تعلقات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔

جب پاکستان میں عوامی حکومت قائم ہوئی تو پاکستان کے کوریا کے ساتھ تعلقات کا خوشگوار دور شروع ہوا۔ ۹ نومبر ۱۹۷۲ء کو پاکستان نے کوریا کی حکومت کو تسلیم کیا اور سفارتی سطح پر تعلقات قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہمارے پہلے سفیر نے اپریل ۱۹۷۴ء میں پیانگ یانگ میں اپنی اسنادِ تقرری صدر کِم اِل سُنگ کو پیش کیں۔ اب جنوبی کوریا کے ساتھ پاکستان کے تعلقات پہلے کی طرح کے نہ رہے لیکن جنوبی کوریا کے کونسل جنرل پاکستان میں موجود ہیں تاہم پاکستان کی طرف سے



جنوبی کوریا میں کوئی سفارتی نمائندہ وغیرہ نہیں ہے۔ پاکستان کے علاوہ صرف مصر دوسرا ملک ہے جس کے دونوں ملکوں (جنوبی، شمالی) کے ساتھ تعلقات ہیں۔ لیکن پاکستان کے عوامی جمہوریہ کوریا کے ساتھ دوستانہ روابط نہایت گہرے اور سفارتی سطح پر ہیں باقی تمام دنیا کے ممالک دو حصوں میں تقسیم ہیں۔ ایک سوشلسٹ بلاک سے متعلق ہیں جب کہ دوسرے امریکہ کے حلیف ملکوں کے بلاک سے روابط قائم کئے ہوئے ہیں۔ پہلے بلاک کے ممالک کے تعلقات صرف عوامی جمہوریہ کوریا سے ہیں اور دوسرے ممالک کے بلاک کے تعلقات جنوبی کوریا سے ہیں۔ مگر دنیا بھر میں پاکستان اور مصر دو ایسے ملک ہیں جن کے دونوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات ہیں مگر پاکستان کے عوامی جمہوریہ کوریا کے ساتھ خصوصی تعلقات ہیں اور جنوبی کوریا کے ساتھ صرف یکطرفہ روابط ہیں۔ یعنی ان کا کونسل جنرل پاکستان میں ہے، جبکہ پاکستان کا کوئی نمائندہ جنوبی کوریا میں نہیں ہے۔

کوریا کے ساتھ سفارتی تعلقات استوار ہونے کے بعد وزیرِاعظم بھٹو کے کوریا جانے سے پہلے دونوں ملکوں کے اعلیٰ سطح کے نمائندے ایک دوسرے کے ملک کا دورہ کر چکے ہیں۔ ۲۸ اپریل ۱۹۷۳ء میں کوریا کے وزیرِ خارجہ "ڈو ڈام" پاکستان تشریف لائے تھے۔ اس کے بعد مارچ ۱۹۷۴ء میں کوریا کے نائب صدر کانگ ریانگ ووک یہاں آئے تھے۔ اور اکتوبر ۱۹۷۵ء میں کوریا کے نائب وزیرِاعظم جونگ جنگ جی نے بھی پاکستان کا دورہ کیا تھا۔ پاکستان کی طرف سے مارچ ۱۹۷۲ء میں مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ کوریا کے دورے پر گئے۔ اپریل ۱۹۷۵ء میں وزارتِ خارجہ کے ایڈیشنل سیکرٹری مسٹر شاہنواز کوریا میں خیرسگالی کے دورے پر گئے اور انہوں نے وزیرِاعظم پاکستان

کے کوریا کے دورے کی تفصیلات طے کیں ستمبر ۱۹۷۲ء میں کوریا کے قومی دن میں شرکت کیلئے پاکستان پیپلز پارٹی کا ایک وفد کیمبل پور کے سینیٹر وحید کی قیادت میں کوریا گیا۔ اس میں لاہور کے مزدور رہنما میر حامد حسین اور بلوچستان کے ایم پی اے مسٹر سنجرانی بھی شامل تھے۔

عوامی حکومت کے قیام سے پہلے کوریا کے ساتھ تجارتی ثقافتی اور فنی میدان میں دونوں حکومتوں کے تعلقات نہ ہونے کے برابر تھے۔ عوامی حکومت بننے کے بعد ۱۹۷۴ء میں اشیاء کے تبادلے کی بنیاد پر ۵ ملین ڈالر یعنی پانچ کروڑ روپے کا تجارتی معاہدہ ہوا۔ جس پر قریب قریب عمل درآمد ہو چکا ہے ۱۹۷۲ء کو ڈاک کے سلسلے میں بھی ایک معاہدہ ہوا۔ ۱۹۷۳ء میں دونوں ملکوں کے درمیان ثقافتی معاہدہ پر دستخط ہوئے، ۱۹۷۵ء میں فضائی رابطہ قائم کرنے کے سلسلے میں بھی دستخط ہو چکے ہیں تاہم عملی طور پر وزیراعظم کے دورے تک اِن معاہدوں پر عمل درآمد نہ ہونے کے برابر رہا ہے۔

وزیراعظم کے موجودہ دورے کا پروگرام پاکستان کے کوریا کے ساتھ نومبر ۱۹۷۲ء میں سفارتی سطح کے تعلقات بحال ہونے کے بعد صدر کِم اِل سُنگ کے ذاتی اور خصوصی دعوت نامے کی بنیاد پر طے پایا۔ یہ دورہ بین الاقوامی سطح پر بہت اہمیت کا حامل تھا کیونکہ وزیراعظم بھٹو جیسے قد آور سیاستدان کا سوشلسٹ ممالک کے علاوہ ایشیائی لیڈر کا یہ پہلا دورہ تھا۔ اس دورے کی اس واسطے بھی اہمیت تھی کہ کوریا نے جنوبی کوریا کا سفارتی دائرہ تنگ کرنے کے لئے سوشلسٹ بلاک سے باہر نئے دوست بنانے کی مہم شروع کی ہے۔ وزیرِاعظم پاکستان کا دورہ اس کا نقطۂ آغاز تھا اور اس سے کوریا کے مؤقف کو عالمی سطح پر تقویت پہنچی۔

وزیرِ اعظم پاکستان مسٹر ذو الفقار علی بھٹو کے کوریا کے حالیہ دورے کے بعد دونوں ملکوں کے تعلقات میں نمایاں اور خوشگوار تبدیلی آئی ہے۔ دونوں ملک بہت گہری دوستی کے رشتے میں منسلک ہو گئے ہیں۔ تجارتی میدان میں بھی دونوں ملکوں کے درمیان اضافے کی توقعات ہیں خاص طور پر فنی معاملات میں پاکستان کوریا سے بہت کچھ سیکھنا چاہتا ہے۔ اس سلسلہ میں زرعی آلات کی مشینری سرِ فہرست ہے۔

اس ضمن میں کافی زرعی مشینیں کوریا سے پاکستان پہنچ چکی ہیں۔ فوجی سامان کے سلسلے میں بھی تعاون کے امکانات روشن ہیں۔ سب سے زیادہ ثقافتی میدان میں تعاون کے مواقع فراہم ہوئے ہیں، اور اس سلسلے میں کوریا کی عظیم ثقافتی تربیتی ٹیم نوجوان طالب علموں کو تربیت دینے کے لئے پہنچ چکی ہے اور جیسا کہ پاکستان کے وزیرِ تعلیم نے حالیہ بیان میں کہا ہے کہ پاکستان میں بھی ۲۵ ہزار بچوں اور طالب علموں پر مشتمل جمناسٹک کی ٹیم کوریا کے تعاون سے تربیت حاصل کر رہی ہے، یہ یقیناً ایک عظیم کام ہے، اور دونوں ملکوں کے مستقبل قریب میں گہرے روابط کی نشان دہی کرتا ہے۔

عوامی جمہوریہ چین

عوامی جمہوریہ چین کو روانگی

۲۶۔۵۔۷۶ کو ریا میں روانگی سے قبل جب ہم وزیرِاعظم کا انتظار کر رہے تھے تو موسم خاصا گرم تھا اور پارٹی یونیفارم پہنے ہوئے گرمی محسوس کر رہے تھے۔ جہاز میں سوار ہونے کے بعد سب سے پہلے اپنی وردی کے گلے کے بٹن ڈھیلے کئے۔ کچھ حضرات نے تو اپنے کوٹ اتار پھینکے۔ ہم نے صبح اپنے مہمان خانوں میں ناشتہ تو کر لیا مگر اس کے باوجود پی آئی اے نے اپنی مخصوص مہمان نوازی کو برقرار رکھتے ہوئے ہمارے لئے بھنی ہوئی مُرغ کی ٹانگ، تازہ سبزیاں، پھل، چائے اور کافی کا اہتمام کیا۔ پچھلی پرواز کی مانند اب کی مرتبہ بھی میرے ساتھ والی نشست پر مسٹر محمد بخش مجاہد اور ان سے آگے کراچی کے مسٹر امان اللہ خٹک بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے سامنے والی نشست پر محترم دوست کرنل محمد اسماعیل چیف آف پراٹوکول اور ان کی بیگم تشریف رکھتی تھیں۔ ہم سب لوگوں نے کوریا میں قیام کے دوران کے تاثرات کا ایک دوسرے کے ساتھ موازنہ کیا۔ اسی اثنا میں، مَیں نے پی آئی اے کی ائیرہوسٹس سے چند رسالے فراہم کرنے کی درخواست کی۔ انہوں نے مجھے پاکستان کے رسائل مہیا کئے۔ جن میں ہفتہ وار "معیار" بھی تھا۔ اس میں سکندر مرزا کی خود نوشت سوانح کی قسط شائع ہوئی تھی۔ میں اسے پڑھنے میں مصروف ہو گیا کہ جہاز میں ہلچل سی ہونے لگی اور لوگ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ جب میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو وزیرِاعظم ہماری نشستوں کے ساتھ کھڑے مجھ سے مخاطب تھے اور کہہ رہے تھے کہ "بھائی تم کمیونسٹوں کے بڑے مداح ہو، میں تم سے پوچھنے آیا ہوں کہ کوریا

کے بارے میں تمہارے کیا تاثرات ہیں؟" انہوں نے مزید کہا "میں تمہیں اس واسطے ساتھ لایا ہوں تاکہ تم اس نظام کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو اور یہ کہ کوریا اور چین کی جماعتیں کیسے کام کرتی ہیں اور ان کا نظم و ضبط کیسا ہے؟"

بھٹو صاحب نے مزید کہا کہ "آخر صدر کم اِل سُنگ خدانخواستہ کوئی پیغمبر نہیں مگر کوریا کے عوام ان کی حد سے زیادہ عزّت کرتے ہیں۔" انہوں نے کہا کہ "تم پیپلز پارٹی پنجاب میں بڑی اہم پوزیشن رکھتے ہو اور اگر جماعت کے ساتھ مکمل تعاون کیا جائے تو اس سے بھی زیادہ اہم مقام مل سکتا ہے۔" بھٹو صاحب نے گلہ کیا کہ میں مکمل تندہی اور خلوص سے کام نہیں کرتا، جس کا انہیں رنج ہے۔"

میں نے اس بات پر کہ وہ مجھے کوریا اور چین کے تاریخی دورے پر اپنے ساتھ لائے، ان کا شکر گزار ہُوا اور کہا کہ ہم کسی صورت میں دوسرے ممالک کے رہنماؤں سے ان کا کم احترام نہیں کرتے۔ مگر ساتھ ہی میں نے عرض کیا کہ "ہمارے ملک میں سیاسی اور سماجی حالات بالکل مختلف ہیں۔ آپ کے علاوہ وزارت کے عہدوں، نچلی سطح کی پارٹی کی قیادت، حکومت کے سیاسی اور انتظامی حکام کے بعض اوقات قابلِ اعتراض عمل اور رویے کی وجہ سے کئی قسم کے شکوک و شبہات کے جنم لینے کا امکان ہر وقت موجود ہے۔" انہوں نے میرے ان خیالات سے اتفاق نہیں کیا۔ وہ مجھے مطالعہ جاری رکھنے کا کہہ کر جب اپنی نشست کی جانب جانے لگے تو محمد بخش مجاہد صاحب نے سندھی زبان میں ان سے میرے بارے میں تعریفی کلمات کہے جس کے جواب میں وزیرِ اعظم صاحب نے کہا کہ "میں لنگاہ صاحب کو بہت عرصے سے جانتا ہوں۔" پھر جہاز میں تمام دوستوں سے باری باری مِلے اور اُن سے حال احوال پُوچھا۔ خاص طور پر صحافی حضرات

سے انہوں نے کافی دیر باتیں کیں، راؤ ارشاد صاحب سے بھٹو صاحب نے خصوصی شفقت کا برتاؤ کیا اور ان سے ہفت روزہ "الفتح" کی اشاعت کے بارے میں تفصیلات پوچھیں۔ اس کے بعد وزیرِ اعظم صاحب اپنی نشست پر جاکر بیٹھ گئے۔

پیانگ یانگ سے پیکنگ تک صرف سوا گھنٹہ کی پرواز ہے۔ جونہی طیارہ چین کی حدود میں داخل ہوا ہم سب عظیم چین کی ایک جھلک دیکھنے کے لیئے بے تاب ہو گئے اور ہمارے کانوں میں ایئر ہوسٹس کی پُرکشش آواز گونجی "حضرات تھوڑی دیر میں ہم پیکنگ کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں۔ آپ حضرات اپنے سگریٹ بجھا دیں اور اپنی کمر کی پیٹیاں باندھ لیں۔" میں ابھی تک "معیار" کے مضمون کو ختم نہیں کر پایا تھا۔ اس آواز نے میرے دل کی دھڑکن کی رفتار تیز کر دی میں نے جہاز کی کھڑکی سے نیچے کی طرف دیکھا تو مجھے چیئرمین ماؤزے تنگ کے خوبصورت ملک چین کے لہلہاتے کھیت نظر آنے لگے، جُوں جُوں طیارہ نیچے اُتر رہا تھا ہمیں خوبصورت ترتیب دیئے ہوئے کھیت، صاف ستھرے دیہات، لاکھوں کی تعداد میں نئے اُگے ہوئے درخت، چھوٹی بڑی ندیاں نالے اور کھیتوں میں سینکڑوں ہزاروں کام کرتے ہوئے مزدوروں کے چہرے دکھائی دینے لگے۔ کھیتوں، مکانوں، درختوں اور ندی نالوں کی ترتیب سے جدید چین کی اجتماعی تنظیم اور قوت کا بھرپُور احساس ہو رہا تھا۔ طیارہ رن وے کو چھُوتا ہوا آہستہ آہستہ ہمارے استقبالیہ کی حدود کی طرف بڑھا تو میری نگاہ استقبال کے لئے سجائے ہوئے لاکھوں سرخ بیزوں اور جھنڈوں پر جم کر رہ گئی۔ پیکنگ کا ہوائی اڈہ بہت وسیع و عریض ہے اور درجنوں کی تعداد میں بین الاقوامی ہوائی کمپنیوں کے جہاز اور عوامی جمہوریہ چین کی ہوائی فوج کے چھوٹے بڑے طیارے

اس کی حدود میں کھڑے تھے۔ ہمیں طیارے میں ہی استقبالیہ کے بارے میں ضروری ہدایات دے دی گئی تھیں۔

جب ہم چین پہنچے تو پیانگ یانگ کے وقت کے مطابق بارہ بجکر بیس منٹ اور چین کے وقت کے مطابق ایک بجکر بیس منٹ تھے۔ ہاں تو فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کی جانب علیحدہ علیحدہ سیڑھیاں لگادی گئیں اور سب سے پہلے پچھلی طرف سے ریڈیو ٹیلی ویژن اور اخبارات کے نمائندے اُترے۔ اس کے بعد وزیرِاعظم اور بیگم بھٹو فرسٹ کلاس کے دروازے سے باہر تشریف لائے۔ وزیرِاعظم چین ہواکو فنگ نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ اس کے بعد دونوں رہنما فوج کے سلامی دینے والے دستوں کے پاس چلے گئے۔ یہاں دونوں ملکوں کے ترانے بجائے گئے اور وزیرِاعظم پاکستان نے سلامی لی۔ سلامی دینے والے فوجی دستے کے جوانوں کے قد بہت بڑے تھے اور یہ نوجوان خوبصورت اور چُست تھے۔ ان سے ذرا پرے ہزاروں کی تعداد میں نوجوان لڑکیاں رنگ برنگے کپڑے پہنے ہاتھوں میں پھول لئے دل آویز انداز میں ہلکا پھلکا رقص پیش کر رہی تھیں۔ سلامی کے وقت فوجی بینڈ اور آرکسٹرا بج رہا تھا جس سے ماحول سہانا ہو گیا تھا جو نوجوان لڑکیاں رقص کر رہی تھیں، وہ بھی لمبے قد کاٹھ اور خوبصورت شکل وصورت کی تھیں۔

فوج کے دستوں کی سلامی کے بعد وزیرِاعظم بھٹو اور ہواکو فنگ معزز شہریوں، اعلیٰ حکّام اور دوسرے شہریوں سے ملے اور اپنی کار میں جاکر بیٹھ گئے۔ ان کے ساتھ بیگم بھٹو، وزیرِاعظم اور مادام ہواکو فنگ بیٹھے۔ اس دوران ہماری گاڑیاں حفظِ مراتب کے لحاظ سے لائن میں لگ چکی تھیں۔ میری کار کا نمبر ۲۴ تھا اور میرے ساتھ مسٹر محمد بخش مجاہد کو بھی سیٹ الاٹ ہوئی۔ وزیرِاعظم بھٹو اور سارے وفد کے سینیئر اراکین کو چین کی مشہور اور اعلیٰ کوالٹی کی ریڈ



پیکنگ کے ہوائی اڈے پر وزیراعظم بھٹو اور پاکستانی وفد کے اراکین کا استقبال۔ بائیں جانب وزیراعظم بھٹو ہوا کوفنگ کے ساتھ ہیں

شار یعنی" سرخ پرچم" کاریں دی گئیں۔ وفد کے دوسرے اراکین کو"شنگھائی" کاریں الاٹ کر دی گئیں۔ چین میں صرف یہی کاریں بنائی جاتی ہیں۔ چونکہ چین میں نجی کار رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لئے صرف سرکاری استعمال کے لئے کاریں تیار کی جاتی ہیں۔ ویسے فنی اعتبار سے یہ کاریں اتنی عمدہ اور نفیس ہیں کہ اگر چین چاہے تو غیر ممالک کو یہ کاریں تیار کر کے برآمد کر سکتا ہے۔ مگر چونکہ چین کی پالیسی برآمدی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں پر اپنی ضرورت کے لئے ہی کاریں تیار کی جاتی ہیں۔ بہر حال ہمارا قافلہ ہوائی اڈے سے پیکنگ شہر کی طرف روانہ ہوا۔ پیکنگ شہر ہوائی اڈے سے ساٹھ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ہوائی اڈے سے شہر کو جانے والی سڑک کافی کشادہ تھی۔ یہاں پرائیویٹ ٹرانسپورٹ بالکل نہیں ہے۔ جس وجہ سے سڑکیں بہت محفوظ ہیں اور صاف ستھری ہیں۔ شہر کو جانے والی سڑک کے دونوں طرف کئی سو فٹ چوڑائی میں لاکھوں کی تعداد میں شجر کاری کی گئی ہے۔ جس سے فضا خوشگوار تھی۔ ان نئے اگائے گئے درختوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ تمام درخت انقلاب کے بعد لگائے گئے ہیں۔ کیونکہ ان میں کوئی پرانا درخت نہیں تھا۔

پیکنگ کا ہوائی اڈہ ۱۹۵۴ء میں بنا تھا۔ اس وقت یہ بالکل معمولی سا رن وے تھا اور یہاں سے شہر تک نہ تو کوئی اچھی کشادہ سڑک تھی اور نہ درخت ہی تھے۔ یہ درخت خاص طور پر ثقافتی انقلاب کے بعد لگائے گئے ہیں۔ سڑک سے ہٹ کر دُور دراز بھی لاکھوں کی تعداد میں نئے درخت لگے ہوئے تھے اور پھولوں کے پودے، نئے دیہات اور ندیاں نالے نظر آرہے تھے۔ بڑی سڑک کے چوراہوں پر سینکڑوں چینی ہمیں دیکھ کر استقبالیہ نعرے لگاتے اور خوشی کا اظہار کرتے۔ یہ افراد سائیکلوں پر سوار تھے اور اپنے اپنے کھیتوں اور دیہاتوں

میں کام کرنے جا رہے تھے۔ دیہاتوں سے بڑی سڑک کو ملانے والی چھوٹی سڑکیں نیم پختہ تھیں مگر بہترین حالت میں تھیں۔ ان سڑکوں کے دونوں اطراف بھی سرسبز و شاداب درخت تھے۔ اور پانی کی نالیاں بہہ رہی تھیں۔ شاہراہ کے دورویہ نہروں اور بڑے بڑے دریاؤں کا ایک وسیع سلسلہ تھا۔ یہ نہریں اور دریا مختلف ندی نالوں کو سائنسی رُخ دینے کے لئے بنائی گئی ہیں۔ انہیں انقلاب کے بعد تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ نہریں اور مصنوعی دریا بارش کے ندی نالوں، طوفانی ندیوں، اور پہاڑوں سے اُبلتے چشموں کے پانی کو رُخ دینے کے لئے اور ان کی طغیانی کم کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ہمارا قافلہ پیکنگ شہر کے قریب پہنچا تو میری نظر اونچے کئی منزلہ رہائشی فلیٹس اور بلند عمارتوں پر پڑی جو چینی عوام کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اب ہماری گاڑیاں شہر کی سب سے بڑی شاہراہ کی جانب مڑیں۔ یہ شاہراہ کئی سو فٹ چوڑی تھی اور اس کے دونوں جانب خرید و فروخت کے مراکز، ہوٹل اور حکومت کے دفاتر واقع تھے۔ اس شاہراہ کے مرکز میں ایک بہت بڑا چوراہا جس کو تِن مِن سکوائر کہتے ہیں، واقع ہے۔ اس چوراہے کے ایک طرف چین کی سب سے بڑی عمارت "عظیم عوامی ثقافتی ہال" ہے۔ اس کے ساتھ ہی قدرے چھوٹی عمارت "جمنیزیم ہال" واقع ہے۔ ان عمارتوں کے بالکل سامنے چین کے سابقہ دور کی سب سے بڑی نشانی "شہنشاہی محل" ہے۔ اس محل کی تفصیلات آگے بیان کی جائیں گی۔ اس شہنشاہی محل کے ساتھ ذرا آگے ایک چھوٹا سا محل ہے جس میں چیئرمین ماؤزے تنگ اور وزیرِ اعظم چین، نائب وزیرِ اعظم اور وزیرِ خارجہ رہتے ہیں۔ ان کے دفاتر بھی اسی عمارت میں ہیں۔ یہ عمارت شہنشاہی محل کا حصّہ ہے۔ اس کے باہر بہت بڑے پول پر چین کا سُرخ پرچم لہرا رہا تھا۔ دروازے پر فوج کے دو جوان پہرہ دے رہے تھے۔ مین گیٹ کے بالکل سامنے ایک بہت بڑے پتّھر پر

چیئرمین ماؤزے تنگ کی طرزِ تحریر میں لکھا ہوا معروف مقولہ "عوام میں جاؤ، عوام کی خدمت کرو" کندہ ہے۔ ان عمارتوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا ہمارا قافلہ آگے جا کر دائیں جانب ایک دوسری شاہراہ کی جانب مڑا اور حکومتی مہمان خانوں میں داخل ہو گیا۔ مہمان خانہ کی عمارت جدید طرز کی ہے اور ۱۹۵۸ء میں بنی تھی۔ یہ بہت بڑی اور خوبصورت عمارت ہے۔ اس میں بہت سارے ریسٹ ہاؤس بنے ہوئے ہیں۔ عمارت میں بڑے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی ایک چھوٹے پتھر پر ماؤزے تنگ کی طرزِ تحریر میں کندہ تاریخی جملہ دکھائی دیا۔ "عوام میں جاؤ، عوام کی خدمت کرو۔"

میرا قیام مہمان خانہ نمبر ۵ میں تھا۔ میرے ساتھ والے کمروں میں شیخ محمد رشید، مسٹر اور بیگم پیرزادہ، مسٹر ناصر علی رضوی، نسیم احمد، جنرل محمد شریف، ایئر مارشل اور بیگم ذوالفقار علی، مسٹر اور بیگم افضل سعید خان، مسٹر مسعود محمود اور مسٹر چوہدری ٹھہرے ہوئے تھے۔ میرے ساتھ کمرے میں مسٹر محمد بخش مجاہد تھے۔ مہمان خانہ نمبر ۶ میں صوبائی وزراء، ممبران اسمبلی، ایئر مارشل نور خان اور دوسرے سینئر حکام تھے۔

وزیرِ اعظم اور بیگم بھٹو گیسٹ ہاؤس نمبر ۱۸ میں ٹھہرے۔ ان کے ساتھ مسٹر عزیز احمد، مسٹر آغا شاہی اور دوسرے وزارتِ خارجہ کے عہدیداران اور وزیرِ اعظم کے ذاتی عملہ کے افسران کو ٹھہرایا گیا۔

جب ہم ہوائی اڈے پر اترے تھے تو پیکنگ کا موسم پیانگ یانگ کے مقابلے میں بھی ذرا گرم اور خشک تھا۔ ہوائیں تو چل رہی تھیں مگر گرمی کا حال پاکستان میں مئی کے مہینے جیسا تھا۔ البتہ درجۂ حرارت پاکستان کے مقابلے میں نسبتاً کم تھا۔ رات کو ضیافت میں کینیڈا کے سفیر کی بیگم نے گفتگو کے دوران کہا کہ ہم چین میں اس وقت آئے ہیں جب موسم خوشگوار ہو گیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے چین آنے سے

چند روز پیشتر بہت تیز اور گرم ہوائیں بھی چلتی رہیں اور اس کے ساتھ کافی گرد و غبار اڑتا رہا۔ ہم اپنے کمروں میں گئے تو اتنی گرمی تھی کہ ہمیں کوٹ اتار کر بشرٹ اور ہلکی پتلونیں پہننا پڑیں ہمارے کمروں میں جانے کے ساتھ ہی ایرکنڈیشنرز چلا دیئے گئے جس سے کچھ سکون محسوس ہوا۔ جس کمرے میں ہمیں ٹھہرایا گیا تھا وہ کوئی بارہ فٹ چوڑا اور ۱۶ فٹ لمبا تھا۔ اس میں دو نہایت کشادہ آرام دہ اور صاف ستھرے بستر تھے، دو بڑی الماریاں، دو آرام دہ کرسیاں، ایک چھوٹی میز، ایک لکھنے والا ڈیسک اور دو چھوٹی کرسیاں تھیں۔ کمرے کے درمیان بیضوی بھورے رنگ کا نہایت خوبصورت اور قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ مہمان خانے کے بڑے کمروں اور ہال میں بھی اس رنگ کے قالین بچھائے گئے تھے۔ لاؤنج میں بچھایا جانے والا قالین کم و بیش ۳۰-۳۵ فٹ چوڑا اور ساٹھ فٹ لمبا تھا۔ جو سنگل پیس تھا۔ مگر نہایت قیمتی تھا۔ ہمارے کمرے کا فرش، دروازے اور کھڑکیاں خوبصورت قیمتی لکڑی کی بنی ہوئی تھیں، ہمارے کمرے میں جدید طرز کا غسل خانہ تھا جس میں نہانے دھونے کا تمام سامان موجود تھا۔ اوپر کی منزل کے کمروں میں ہمارے مرکزی وزراء ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ فلیٹ کافی کشادہ اور خوبصورت تھے، ان میں بیڈ روم اور سٹنگ روم الگ الگ تھے۔ وفد کے سینیئر اراکین کے علاوہ باقی ممبران پیکنگ کے معروف ہوٹل (نیشنلٹی) میں ٹھہرائے گئے تھے، ابھی ہم کمرے میں ذرا سوئے ہی تھے کہ بیرے نے انگریزی زبان میں ہمیں لنچ کے لئے کھانے کے کمرے میں جانے کو کہا۔ میں اور محمد بخش مجاہد ڈائننگ ہال میں آئے، یہاں کھانے کے دو گول میز تھے ایک پر شیخ محمد رشید، بیگم پیرزادہ اور مسٹر نسیم احمد بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسری میز پر جنرل شریف، ایئر مارشل اور بیگم ذوالفقار علی اور ان کے سٹاف آفیسر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ چین کا کھانا کوریا سے کافی ملتا جلتا تھا۔ مگر

ترتیب اور سلیقے کے لحاظ سے چین کا کھانا اپنی طرز کا منفرد کہا جاسکتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ساری دنیا میں چین کے کھانے کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ایک روایت کے مطابق چین کے ۳۰ صوبوں میں مختلف اقسام کے مجموعی طور پر اڑھائی ہزار کھانے ہیں۔ ہم چین کے نہایت دلچسپ اور لذیذ کھانوں کی تفصیلات ضیافت کے موقع پر بیان کریں گے۔اور خاص طور پر خصوصی ضیافت جو وزیر اعظم چین نے وزیر اعظم بھٹو کو اپنے سینئر ساتھیوں کے ہمراہ دی، اس کا تفصیلاً ذکر کیا جائے گا۔ آج کا دوپہر کا کھانا غیر رسمی اور سادہ تھا۔مگر اس کے باوجود سب سے پہلے ٹھنڈی ڈشوں میں مرغا، گائے اور دنبے کا گوشت اور اچار نما سبزیاں کھانے کو دی گئیں۔ گرم کھانوں میں چاول گوشت اور سبزیوں کا سوپ جس میں چاول ڈال کر کھائے جاتے ہیں، دیا گیا۔ کھانے کے تیسرے دور میں گرم مچھلی، مرغی، گائے اور دنبے کا گوشت اور عجیب وغریب جڑی بوٹیوں کی بنی ہوئی سبزیاں اور بغیر مرچ مسالحے کے شوربے سے لذتِ کام ودہن حاصل کی ۔اس کے بعد کوریا کی طرح کے شہد سے میٹھے تربوز کی سویٹ ڈش دی گئی۔ محمد بخش مجاہد اور شیخ رشید تربوز کھا کھا کر تنگ آچکے تھے انہوں نے تربوز کی بجائے آئس کریم منگوائی۔آخر میں چین کی مخصوص سبز چائے پیش کی گئی۔ دو بجے کے قریب کھانا کھانے کے بعد ہم اپنے کمروں میں چلے گئے، اور شام کے تین بجے کے قریب چین کی قدیم تہذیب کا نمونہ شہنشاہی محل دیکھنے کے لئے تیار ہو گئے۔

قدیم شاہی محلّات یا ممنوعہ شہر کا دورہ

تین بجے بعد دوپہر ہمارا قافلہ جس میں مرکزی وزرأ کے سوا باقی سارے اراکین شامل تھے چین کے قدیم زمانے کے شاہی محلات کو دیکھنے کے لئے روانہ ہوئے۔ جس کو ممنوعہ شہر بھی کہتے ہیں، مگر اب یہ ممنوعہ نہیں ہے۔ کیونکہ غیر ملکی مہمانوں اور سیّاحوں کے علاوہ چین کے عوام بھی اس محل کو اندر سے آزادی کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں۔ البتہ محل کے وہ حصّے جو کہ شہنشاہوں کے سونے اور اٹھنے بیٹھنے کے کمروں پر مشتمل ہیں اب عام لوگوں کے لئے ممنوعہ علاقوں میں سے ہیں۔ غیر ملکی مہمانوں کے لئے بھی ان حصّوں میں جانے کی اجازت نہیں مگر پاکستانی وفد کے اراکین کو یہ حصے دکھائے گئے۔ اِن محلّات کے علاوہ چین میں اور بھی بے شمار تاریخی عمارات موجود ہیں۔ جن میں "موسمِ گرما کا محل" سب سے زیادہ مشہور ہے۔ افسوس کہ مختصر قیام کے باعث ہم اسے نہ دیکھ سکے۔ جن محلّات کا ہم ذکر کر رہے ہیں، یہ منگ اور چنگ حکمرانوں کے دور میں تک تعمیر کئے گئے۔ اس زمانے میں چین پر منگ خاندان کا مؤینگ لُو نامی بادشاہ حکمرانی کرتا تھا۔ ان محلات کے کئی حصے منہدم ہو گئے تھے جن کی دوبارہ تعمیر کی گئی یا انہیں مرمّت کر کے محفوظ کیا گیا۔ ان محلات سے تقریباً پانچ سو سال کی تاریخ کے واقعات منسوب ہیں۔

سات لاکھ ۲۰ ہزار مربع میٹر کے علاقہ میں پھیلے ہوئے ان عظیم محلّات میں نو ہزار کمرے ہیں اور چین میں جتنی بھی قدیم تاریخی عمارتیں ہیں ان میں سے یہ محلّات سب سے زیادہ مکمل اور اصل شکل میں محفوظ کیے گئے ہیں۔ ان محلّات کی شان و شوکت عظمت اور فنِ تعمیر کے کمالات قدیم چین کے محنت کشوں کی ذہانت و فراست اور اعلیٰ صلاحیتوں کا نمونہ ہیں۔

ان محلات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصّے میں جو کہ سامنے آتا ہے۔ اس میں تین بڑے بڑے ہال بھی ہیں۔ پہلے ہال کو "عظیم اجتماعات کا ہال" کہتے ہیں۔ اس کو "سنہری گھڑیالوں والا ہال بھی کہتے ہیں اسکو مِنگ خاندان کے شہنشاہ ینگ لُو نے ۱۴۲۰ء میں اپنی شہنشاہیت کے اٹھارویں سال میں تعمیر کیا تھا، اور بعد میں چِنگ خاندان کے شہنشاہ کنگ ہسی نے اپنی شہنشاہیت کے ۲۴ ویں سال ۱۶۹۷ء میں دوبارہ تعمیر کرایا۔ یہ ہال (۳۵) میٹر اونچا ہے اور اس کا دو ہزار تین سو ۰۰ میٹر رقبہ ہے۔

یہ ہال سب سے اونچا اور ان محلّات کی عمارتوں میں سب سے بڑی عمارت ہے۔ اس ہال کے دروازے کے دونوں طرف تانبے کے دو بڑے بڑے شیروں کے مجسمے بنے ہوئے ہیں۔ اس میں چین کے مِنگ اور چِنگ شہنشاہوں کے زمانے میں عظیم اجتماعات مثلاً تاج پوشی، شادی، بیاہ، پیدائش، نئے سال کی تقریبات اور سردیوں میں چاند سورج کی خوشیاں منانے کی تقریبات منعقد کی جاتی تھیں۔

یہ ہال کم و بیش اصل شکل میں موجود ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ تمام محلات لکڑی سے بنائے گئے ہیں اور ان میں اینٹ، پتھر، گارا، لوہا اور کیل وغیرہ بالکل استعمال نہیں کئے گئے۔ کیلوں کا کام چوگاٹھوں سے لیا گیا۔ ہال کے اندر درمیان میں بہت بڑے بڑے لکڑی کے ستون لگے ہوئے ہیں۔ غالباً یہ لکڑی کے ایک ہی تنے سے بنائے گئے ہیں۔ یا شاید ستون کے سائز کا پورا درخت تراش کر لگایا گیا ہے۔ ان ستونوں اور عمارت میں آراستہ لکڑی کے تمام دوسرے حصے پر سُرخ رنگ کا روغن لگا ہوا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ پانچ سو سال کی قدیم تاریخ کے باوجود اس محل کی لکڑی کو کسی قسم کا دیمک یا کیڑا نہیں لگا۔ لکڑی کے ان محلات سے عجیب و غریب کہانیاں بھی منسوب ہیں۔ چین کے مشہور

مقولے کے پیشِ نظر" جہاں لکڑی ہو وہاں آگ لگنا ضروری ہوتا ہے"۔

ان محلات کے باہر بہت بڑے بڑے تانبے اور پتھر کے جار بنے ہوئے ہیں جو پانی اور ریت سے بھرے ہوئے تھے تاکہ آگ لگنے کی صورت میں ضروری حفاظتی اقدامات کیئے جا سکیں۔ ان عمارتوں کے چاروں طرف پانی کے بڑے بڑے فوارے اور تالاب بھی موجود تھے۔

ہال کا اندرونی حصّہ خوبصورت طریقے سے سجایا گیا ہے خاص طور پر لکڑی پر جو نقش و نگار بنائے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم زمانے کا چین بھی فنی اعتبار سے بہت عظیم روایات کا حامل رہا ہے۔ اِسطرح اس ہال اور دوسرے ہالوں میں بہت بڑے بڑے شیشے، جن میں شکل و صورت دیکھی جا سکتی ہے، لگے ہوئے ہیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں پہ شیشے ہیں۔ قالین، کُرسیاں اور صوفے بھی یہاں بہت اچھے طریقے سے آراستہ کیئے گئے ہیں۔

محل کے اندرونی حصّہ کی آرائش کا معیار یورپ، ایشیا اور دوسرے ممالک کے قدیم زمانے کے محلات کے معیار سے بالاتر ہے۔

عظیم اجتماعات کے ہال کے ساتھ ہی جو دوسرا ہال ہے وہ درمیانے درجے کے اجتماعات کے لیئے ہے۔ یہ ہال بھی ۱۴۲۰ء میں مِنگ خاندان کے شہنشاہ یِنگ لُو نے اپنے دورِ اقتدار کے ۱۸ ویں سال میں تعمیر کیا تھا۔ یہ ہال بعد میں تِن چِی کی حکمرانی کے ساتویں سال ۱۶۲۷ء میں دوبارہ بنایا گیا۔ بعد میں اسے چِنگ خاندان کے شہنشاہ کِنگ سی کی شہنشاہیت کے ۲۷ ویں سال ۱۶۹۰ء میں مکمل طور پر مرمت کیا گیا۔ روایت کے مطابق عظیم اجتماعات کے ہال میں تقریبات میں حصّہ لینے سے پہلے شہنشاہ اپنے خصوصی مہمانوں کا استقبال کرنے کے لیئے اسی درمیانی اجتماعات کے ہال میں آیا کرتے تھے۔ یہ ہال بھی اپنی نوعیت کا

واحد ہال ہے۔ اس کے بعد سب سے چھوٹا ہال ہے جس کو "تخلیئے کا ہال" کہتے ہیں اور یہ ینگ لُو خاندان کے ینگ لُو شہنشاہ کی حکمرانی کے اٹھارھویں سال ۱۴۲۰ء میں بنایا گیا۔ اور چن مِنگ شہنشاہ کی حکمرانی کے پانچویں سال ۱۶۲۵ء میں اس کو دوبارہ تعمیر کیا گیا تھا۔ بعدازاں چنگ خاندان کے شہنشاہ چن لِنگ کی شہنشاہیت کے ۲۴ ویں سال ۱۷۶۵ء میں اس کی مرمت کی گئی چن لنگ شہنشاہ کی حکمرانی کے ۴۵ ویں سال ۱۷۹۵ء میں اس ہال کو جاگیرداری اور نوآبادیاتی نظام کے سب سے بڑے چناؤ کے امتحان کا سنٹر بنا دیا گیا۔ جو لوگ اس امتحان کو پاس کرتے تھے ان کو ہمارے یہاں کے سی ایس پی کی طرح "چن شِی" کہتے تھے اور اوّل آنے والوں میں سے پہلے تین افسران کو "چنگ یَن" "تِنگ یَن" اور "تان ہوا" کہتے تھے۔ یہ بھی اُس زمانے کے افسر شاہی کے نظام کی طرح کے اعزازات تھے۔

ان تینوں بڑے ہالوں کے سامنے کی طرف کا بڑا گیٹ بھی فن تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے اور یہ بھی ۱۴۲۰ء میں بنایا گیا تھا۔ پھر ۱۶۴۷ء میں دوبارہ مرمت کیا گیا۔

تخلیہ کے ہال کی پچھلی جانب ڈھلوان پر ایک بہت بڑا پتھر ہے۔ جس پر قدیم زمانہ کے فنِ مصوری کے عظیم نمونے کی شکل میں مچھلیاں، مگرمچھ وغیرہ کندہ کئے ہوئے ہیں' اس پتھر سے بڑی لرزہ خیز اور دلچسپ داستان وابستہ ہے اور یہ مِنگ خاندان کے زمانے کا عظیم ترین اور سب سے بڑا کندہ کیا ہوا پتھر ہے۔ یہ پتھر پیکنگ سے کئی سو میل دور سمندر کے کنارے پہاڑی پر نصب تھا۔ اس کا وزن ۲۵۰ ٹن یعنی سات ہزار من ہے اس پتھر کو پیکنگ تک ایک ہزار گھوڑوں کی گاڑی کے ذریعے رسوں وغیرہ سے باندھ کر کھینچ کر لایا گیا۔

ظاہر ہے ہزار گھوڑوں کی گاڑی کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں مزدور بھی ہوں گے۔ کہتے ہیں جب یہ گاڑی چین کے دیہی علاقوں سے گزری تو اس کی زد میں آنے والے ہزاروں غریب کچلے گئے تھے۔ سینکڑوں کھیت ویران ہو گئے اور بے شمار مکانات گرا دیئے گئے۔ جو بلاشبہ قدیم چین کے جاگیردارانہ نظام کے ظلم و ستم کی بدترین مثال ہے۔ حیران کن امر یہ ہے کہ، ہزار من بھاری اس پتّھر کی لمبائی صرف ساڑھے سولہ میٹر تقریباً ۵۰ فٹ ہے اور چوڑائی تین میٹر اور موٹائی تقریباً پونے دو میٹر ہے۔ کندہ تراشی اور تراش خراش کے لحاظ سے یہ پتّھر دنیا کے عجائبات میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ محل کے دوسرے حصّہ کی تفصیلات کچھ یوں ہیں:

سب سے پہلے حصّے کا نام "آسمانی سکون کا محل" ہے یہ محل بھی ۱۴۲۰ء میں ینگ لُو نے بنایا تھا۔ یہ کئی دفعہ تباہ ہو چکا ہے۔ آخری مرتبہ ۱۷۹۸ء میں بنایا گیا تھا۔

ینگ خاندان سے چنگ خاندان تک شہنشاہ اسی محل میں رہائش رکھتے تھے۔ اور روزمرّہ زندگی کے علاوہ امورِ مملکت یہاں سرانجام دیتے تھے۔ چنگ خاندان کے شہنشاہ یُنگ چنگ اگرچہ دوسرے محل، جس کا نام (ذہنی نشو و نما کا ہال) تھا، میں منتقل ہو گئے۔ اپنی حکومت کے مرتبے کے مختلف عہدیداراں کو اس ہال میں ملنے کا موقع دیتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا محل ہے جسے "ملاپ کا ہال" کہتے ہیں۔ یہ بھی ۱۴۲۰ء میں بنا اور ۱۶۵۵ء میں دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ اس ہال میں چنگ خاندان کی ملکائیں اپنی پیدائش کے دن کی تقریبات منعقد کرتی تھیں۔ ۱۷۴۶ء کے بعد شہنشاہ کی ۲۵ مختلف قسم کی مہریں اسی ہال میں رکھی جاتی تھیں۔ اسی ہال میں چین کے قدیم زمانہ کی پانی کی الارم گھڑی

نصب ہے۔ جو ساری دُنیا میں اپنی نوعیت کی واحد اور مشہور گھڑی تھی۔ پانی کے قطرے گرنے سے وقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وقت کا اندازہ لگانے کا یہ طریقہ اڑھائی ہزار سال پُرانا ہے۔ اور چینیوں کی تخلیق ہے۔ یہ حیرت انگیز ایجاد قدیم زمانہ کے محنت کش چینی عوام کی عظمت کی دلیل ہے۔ یہ پانی سے چلنے والی گھڑی جو یہاں نصب ہے، ۱۷۴۵ء میں لگائی گئی تھی۔ اس کے مغربی جانب دوسری بڑی گھڑی نصب ہے۔ جو جدید دور کے تقاضوں کے گھڑیال کی مانند چلتی ہے۔ یہ گھڑی ۱۷۴۰ء میں شہنشاہ چین کے محکمۂ تعمیرات اور شاہی حکم پر نصب کی گئی تھی۔

اِس سے ملحقہ ایک اور محل ہے جس کا نام "زمین پر سکون کا محل" ہے یہ بھی ۱۴۲۰ء میں بنا تھا اور ۱۶۵۵ء میں اِس کی دوبارہ مرمت کی گئی۔ اس میں مِنگ خاندان کی شہزادیاں اور ملکائیں رہتی تھیں۔ بعد میں مِنگ خاندان کے زمانے ہی میں اس محل کو عبادت گاہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس کے مشرق کی طرف والا کمرہ شہنشاہ کے سونے کا کمرہ تھا۔ ان بڑی عمارتوں کے علاوہ آگے پیچھے اور ارد گرد اور بھی بہت سی عمارتیں ہیں جن میں "شاہی امن ہال" سب سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ ۱۴۲۰ء میں بنا تھا اور ۱۵۳۵ء میں دوبارہ بنا۔ اس کی چھت اپنی طرز کے فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس عمارت پر بے شمار پتھروں پر کندہ کئے ہوئے مجسمے نصب ہیں اور اس وقت کے چینی فن کی زبردست عکاسی کرتے ہیں۔ یہاں پر بھی مِنگ اور چِنگ خاندان کے بادشاہ عبادت کیا کرتے تھے۔

۱۷۱۹ء کے زمانے میں چنگ شہنشاہ نے حکومت کے امور سر انجام دینے کے لئے "ایک گرینڈ کونسل" بنائی۔ جس کے لئے ایک ہال تعمیر کیا۔ اس

اس ہال میں شہنشاہ اور اس کے کونسلر سیاسی، فوجی اور حکومتی اُمور سرانجام دینے کے لئے اجتماعات منعقد کیا کرتے تھے۔ اس ہال کے ساتھ "ذہنی نشوونما کا ہال" واقع ہے جو منگ خاندان کے زمانے میں بنا تھا اور چنگ خاندان کے زمانے میں اس کی مرمت کی گئی۔ اس خاندان کے بادشاہوں نے دو سو سال کا تاریخی عرصہ یہاں گزارا۔ اور اپنے روزمرّہ کے کام کرتے رہے۔ اس کے درمیانی کمرے میں شہنشاہ لکھتے پڑھتے تھے اور اپنے سول و فوجی حکّام کی دستاویزات پر آرڈر دیتے تھے۔ اس کے مشرقی کمرے میں ایک پردے کے پیچھے خصوصی نشست پر ملکائیں اپنے حکومتی امور سرانجام دیا کرتی تھیں۔ یہ ہال وہی ہے جہاں چنگ خاندان کی حکومت نے ۱۹۱۱ء کے انقلاب کے بعد جب شہنشاہیت کا خاتمہ ہوا اور بورژوا، ڈیموکریٹک طرز کی حکومت آئی تو شہنشاہیت سے دستبرداری کے کاغذات پر دستخط کئے تھے۔ اس ہال کی پچھلی طرف چنگ شہنشاہ کے سونے کا کمرہ تھا۔ مغربی کمرے کے بالکل دامن میں ایک خصوصی ہال ہے جہاں چنگ شہنشاہ نے نہایت قیمتی پینٹنگز رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام "برف باری کے بعد صاف آسمان" ہے جسے ایک معروف پینٹر "وانگ ہی چی ہی" نے بنایا تھا۔ دوسری پینٹنگ "خزاں کا درمیانی موسم" "ہی سن چی" نے بنائی تھی اور تیسری پینٹنگ کا نام "پوٹین" ہے یہ چین کے مشہور قدیم پینٹر "وانگ ہوسن نے بنائی تھی۔ یہ تمام ہاتھ کی بنی ہوئی آبی رنگوں کی تصویریں ایک ہی زمانے میں مشہور و معروف پینٹرز نے بنائی تھیں۔ اس کے ساتھ والا ہال جس کا نام "تکمیل کا ہال" ہے ۱۴۲۰ء میں بنا تھا۔ بعد میں اس کو منگ خاندان کے زمانے میں "خواہشات کے محل" کا نام دیا گیا۔ ۱۶۹۳ء میں اس کو دوبارہ بنایا گیا۔ اس کے بعد اس کا نام "تاچی تین" رکھا گیا۔ اس محل میں منگ اور چنگ

دور کے بادشاہوں کی ملکائیں اور داشتائیں رہا کرتی تھیں. یہاں ایک اور بھی چھوٹا سا محل ہے. جس کو "بہار کے زمانے کا محل" کہتے ہیں. یہ ۱۸۱۰ء میں بنا تھا جہاں ایک شہزادی رہتی تھی. اس سے اگلی عمارت کا نام "لافانی بہار کے موسم کا محل" ہے. یہ بھی ۱۴۲۰ء میں بنا تھا. اور ۱۶۸۳ء میں دوبارہ بنایا گیا. یہاں پر چینگ خاندان کی ملکائیں رہائش رکھتی تھیں اور اکثر "اوپرا" وغیرہ کا مظاہرہ اس ہال میں کیا جاتا تھا. ایک اور چھوٹا سا محل جسے "زمین کے امن کا محل" کہتے ہیں ۱۴۲۰ء میں بنا تھا. اور ۱۶۵۵ء میں دوبارہ بنایا گیا. منگ اور چینگ خاندانوں کے دور میں یہاں پر شہزادیاں، ملکائیں اور داشتائیں رہتی تھیں. آخر میں دو اور چھوٹے چھوٹے محل واقع ہیں جن میں سے ایک ۱۸۰۲ء میں بنا تھا جہاں ایک شہزادی نے اپنی ۵۰ ویں سالگرہ پر ایک عظیم ضیافت دی تھی اور دوسرا محل ۱۴۲۰ء میں بنا تھا اور ۱۶۵۵ء میں دوبارہ مرمت کیا گیا تھا. اس میں شہزادیوں اور ملکاؤں کے علاوہ منگ اور چینگ خاندانوں کے دور میں شاہی داشتائیں رہا کرتی تھیں. ان شاہی محلات کے علاوہ ہزاروں دوسرے کمرے ہیں جو غالباً حکومت کے دوسرے شعبوں کے اعلیٰ حکّام کے دفاتر اور رہائش کے کام آتے تھے. یہ سارے محلّات اور کمروں کا تعارف ہمارے گائیڈ نے کرایا اور تقریباً دو گھنٹے ان کمروں میں سے گزرتے لگ گئے. آخر میں ہمیں ان محلات کے نیچے کی طرف لے جایا گیا جہاں شاہی باغ واقع ہے. یہ باغ منگ خاندان کے دور میں بنایا گیا تھا. اس کا سات ہزار مربع میٹر رقبہ ہے. یہاں دیار کی قسم کے کئی صدیاں پرانے بڑے بڑے درخت موجود ہیں. اس باغ کے شمال کی طرف پتھر کی ایک مصنوعی پہاڑی

ہے۔ اس پر منگ اور چنگ حکمران فارغ اوقات میں آرام اور سیر کرتے تھے۔ ان تمام محلات کا فرش بھی لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ لیکن ایک محل سے دوسرے محل تک جانے کے راستے پتھر سے بنائے گئے ہیں۔

اگرچہ ۱۹۱۱ء کے انقلاب کے بعد شہنشاہیت کا خاتمہ ہو گیا تھا مگر آخری شہنشاہ کو اپنے محل میں ۱۹۲۴ء تک رہنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اس شہنشاہ کے ذاتی کمروں میں نجی استعمال کی اشیاء جن میں صوفے کرسیوں اور میزوں کے علاوہ بستر، کتابیں، پہننے کے کپڑے اور دوسری چیزیں شامل ہیں، ابھی تک اپنی اصل شکل میں محفوظ ہیں۔ لگاتار دو گھنٹے پھرنے سے ہم کافی تھک چکے تھے۔ اس لئے ہمیں محل کے اندر ایک جدید طرز کے ایک چھوٹے سے ریستوران نما ہال میں لے جایا گیا۔ وہاں ہم نے تھوڑی دیر آرام کیا اور سنگترے کے جوس کے علاوہ چین کی مقبول ترین سبز چائے کے ساتھ بسکٹ اور چاکلیٹ کھائے۔ یہ بھی پرانی عمارت کا حصّہ ہے مگر اس کو جدید طرز پر آرام اور کھانے پینے کی جدید سہولتوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اس کمرے کے بالکل سامنے ایک برآمدہ نما ہال ہے جس میں قدیم زمانے میں تھیٹر، اوپرا اور موسیقی کی تقریبات منعقد ہوتی تھیں۔

اس جگہ ہماری خدمت پر چھوٹی عمر کی نوجوان چینی لڑکیاں مامور تھیں۔ ان لڑکیوں نے نیلے رنگ کی پتلونیں، سفید رنگ کے بوشرٹ اور کپڑے کے کالے رنگ کے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ یہ جوتے چیئرمین ماؤزے تنگ خود بھی پہنتے ہیں۔ یہ لڑکیاں صرف اپنی چھوٹی چوٹیوں سے پہچانی جا سکتی تھیں، ورنہ ان کا لباس بالکل مردانہ تھا۔ ہمارے ساتھ جو آدھ درجن کے قریب ترجمان لڑکیاں اور لڑکے تھے وہ رواں انداز میں انگلش

بول سکتے تھے۔ ان میں ایک نوجوان ایسا بھی تھا جو بڑی شستہ اردو بولتا تھا۔ اسس نوجوان کو عبدالوحید کٹپر اور ڈاکٹر عبدالخالق اچھی طرح جانتے تھے۔ کیونکہ وہ کراچی میں رہ چکا ہے اور یہاں اس نے ۷۴-۱۹۷۳ء میں اردو کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ہم اس نوجوان سے انگلش میں بات کرتے تو وہ ہمیں اردو میں جواب دیتا تھا۔ ہمارے بعض دوستوں کے کہنے کے مطابق کئی چینی ترجمان پنجابی بھی جانتے تھے۔ اس ریستوران میں آدھ گھنٹہ آرام کرنے کے بعد ہم اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ گئے اور چھ بجے کے قریب مہمان خانوں میں واپس آ گئے۔ شام سات بجے وزیرِ اعظم چین نے وزیرِ اعظم پاکستان کے اعزاز میں جو ضیافت دی تھی اُس میں ہمیں بھی جانا تھا۔ ہم نے تھوڑی دیر آرام کیا۔ نہا دھو کر کپڑے بدلے اور ضیافت کھانے کے لئے عظیم ہال کی طرف قافلہ کی شکل میں روانہ ہو گئے۔

ضیافت


وزیرِ اعظم بھٹو کے علاوہ ہمارے قافلے کے دوسرے تمام اراکین سوا سات بجے کے قریب عظیم عوامی ہال کے سامنے والے بڑے دروازے سے استقبالیہ کمرے میں پہنچ گئے۔ اس کمرے میں آراستہ کرسیوں پر ہمیں بٹھا دیا گیا اور حسبِ دستور سبز چائے پینے کے لئے دی گئی۔ عظیم ہال جدید دور کی کشادہ اور خوبصورت ترین عمارتوں میں سے ایک ہے۔ استقبالیہ ہال اتنا وسیع ہے کہ دس ہزار سے زائد افراد اس میں بیک وقت سما سکتے ہیں۔ اس استقبالیہ کمرے کے علاوہ بالائی منزل پر بہت بڑا ضیافت ہال ہے جس میں پانچ ہزار کے قریب آدمی بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہیں۔ یہ ہال چار منزلہ ہے۔ ضیافت کے ہال کے علاوہ تیسری منزل پر اجتماعات کا بہت بڑا ہال ہے جس میں دس ہزار سے زیادہ نشستیں ہیں اور اگر یہاں لوگوں کو کھڑا ہونے

کی بھی اجازت ہو تو بیس ہزار سے زائد افراد سما سکتے ہیں۔ اس عظیم عمارت میں چین کے تیس صوبوں کیلئے ایک ایک چھوٹا ہال مخصوص ہے جو ہر صوبے کی تاریخ اور ثقافت کی عکاسی کرتا ہے اور اس میں ان صوبوں کے سالانہ اجتماعات ہوتے ہیں اِن چھوٹے بڑے ہال کمروں کے علاوہ سینکڑوں کمرے بنائے گئے ہیں جن میں اعلیٰ احکام کے دفاتر اور کھانے کے چھوٹے کمرے اور کام کرنے کے دفاتر ہیں۔ چین میں غیر ملکی وفود کے اراکین کی میٹنگیں، ضیافت اور غیر رسمی طور پر بھی ملنے جلنے کا اہتمام اس ہال میں کیا جاتا ہے۔ کوئی بھی وزیر یا اعلیٰ عہدہ دار اپنے گھر یا دفتر میں کسی غیر ملکی مہمان کا استقبال نہیں کرتا چنانچہ ہمارے قیام کے دوران جب وزیرِ اعظم بھٹو نے بیگم چواین لائی سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو عظیم عوامی ہال کے ایک مخصوص کمرے میں مادام چواین لائی کو وزیرِ اعظم بھٹو سے ملانے کا اہتمام کیا گیا۔ اس طرح ہمارے قیام کے دوران وزیرِ اعظم بھٹو کے اعلیٰ سطحی اجلاس بھی یہاں منعقد ہوئے اُن کے علاوہ ہمارے وفد کی اقتصادی اور فوجی کمیٹی کے اراکین کے اجلاس بھی یہاں ہوئے۔ پاکستان کے وزیرِ تعلیم مسٹر حفیظ پیرزادہ کے اعزاز میں بعد میں ایک خصوصی کھانے کا اہتمام بھی یہاں پر کیا گیا۔ اگلے روز ہم نے جو ثقافتی شو دیکھا وہ بھی اسی ہال کے آڈیٹوریم میں دکھایا گیا۔ وزیرِ اعظم بھٹو پونے آٹھ بجے کے قریب تشریف لائے اور وزیرِ اعظم چین نے دروازے پر ان کا استقبال کیا۔

بھٹو صاحب کے آنے سے تھوڑا عرصہ پہلے دوسری منزل کی جانب سیڑھیوں کے راستے کے درمیان ہمیں ایک مخصوص جگہ پر آگے پیچھے فوٹو کھنچوانے کے لیے کھڑا کر دیا گیا۔

تیسری قطار میں وزیرِ اعظم بھٹو، ہوا کو فنگ اور وفد کے

دوسرے سینئر اراکین آکر کھڑے ہوئے فوٹو لینے کے بعد نچلی منزل پر واقع کھانے کے ہال کمرے میں ہمیں لے جایا گیا اور تالیوں سے ہال گونج اٹھا۔ کھانے کے ہال کمرہ میں تقریباً بارہ بارہ آدمیوں کی گول میزوں پر تین ہزار کے قریب مہمان اپنی اپنی مخصوص نشستوں پر بیٹھ گئے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد وزیراعظم بھٹو اور ہوا کوفنگ خاص دروازے سے داخل ہوئے' ان کے آنے پر تمام مہمان کھڑے ہو گئے اور ہال کی چھت پر سینکڑوں کی تعداد میں نصب خوبصورت روشنیوں کے بلب جگمگا اٹھے درجنوں کے قریب ٹیلی ویژن اور دوسرے کیمرے حرکت میں آ گئے۔ کھانے کی نشستوں کی پچھلی طرف سو سے زیادہ افراد پر مشتمل آرکسٹرا کی دھن پر سب سے پہلے پاکستان کا ترانہ بجایا گیا سامنے کی بہت بڑی گول میز پر وزیراعظم چین اور وزیراعظم پاکستان کے علاوہ ۲۰ کے قریب مہمان اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ اس میز کے پچھلی طرف دیوار پر پاکستان اور چین کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ وزیراعظم پاکستان کی میز پر مرکزی وزراء اور فوج کے اعلیٰ حکام کی نشستیں تھیں ان کے ساتھ ایک ایک برابر کے مرتبے کا چینی مہمان اور ایک ترجمان بیٹھا ہوا تھا۔ اس میز کے بائیں طرف دو بڑی میزوں پر پاکستانی وفد کے دوسرے سینئر اراکین جن میں صوبائی وزراء اور ممبران اسمبلی شامل تھے، بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ مرتبہ کے لحاظ سے چینی میزبان بیٹھے تھے۔ وزیراعظم کی میز کے دائیں جانب بھی پاکستانی وفد کے دوسرے سینئر اراکین اور ان کے ساتھ چینی میزبان بیٹھے تھے۔ ہماری میز دوسری صف میں بالکل درمیان میں بھٹو صاحب کی میز کے برابر تھی۔ ہماری پچھلی صفوں میں پاکستانی وفد کے دوسرے اراکین کے علاوہ غیر ملکی سفارت خانوں کے سربراہ اور اعلیٰ حکام چین کے اعلیٰ حکام اور پارٹی کے اعلیٰ عہدہ داران تشریف رکھتے تھے۔



پیکنگ کے عوامی ہال میں ضیافت کا منظر، پیچھے آرکسٹرا بج رہا ہے۔

ان صفوں کے آخر میں آرکسٹرا انقلابی دھنیں بکھیر رہا تھا۔ پاکستانی مہمان اپنی مخصوص وردی پہن کر آئے تھے چینی میزبان بالکل غیر رسمی اور سادہ مخصوص چینی وردی میں ملبوس تھے۔ چینی فوجی حکام نے اپنی مخصوص وردی پہنی ہوئی تھی جو کہ بالکل سادہ تھی۔ ہمارے وفد کے فوجی افسران نے بھی اپنی وردیاں پہنی ہوئی تھیں۔ غیر ملکی سفارت خانوں کے حکام میں سے افریقہ اور عرب ممالک کے افسران نے اپنا قومی لباس پہنا ہوا تھا۔ مغربی ممالک کے سفارتی افسران نے شام کا مخصوص لباس پہنا ہوا تھا۔ مغربی خواتین نے بھی لمبے لمبے شام کے کھانے کے لباس زیب تن کئے ہوئے تھے۔ ضیافت کے کھانے، نوجوان چینی لڑکیاں لگا رہی تھیں۔ انہوں نے بالکل سادہ لباس پہنا ہوا تھا۔

میری کھانے کی میز پر میرے ساتھ پاکستانی سفارت خانہ کے ملٹری آتاشی بریگیڈیئر شفیع صاحب ان کی بیگم اور وزیر اعظم پاکستان کے ذاتی معالج کرنل محبوب، مسٹر محمد بخش مجاہد اور ایک طالب علم رہنما کے علاوہ چین کے وائس منسٹر آف ڈیفنس اور ان کی بیگم بیٹھی تھیں جو انگریزی زبان اچھی طرح جانتی ہیں اور بچوں کی ماہر ڈاکٹر ہیں۔ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھنے کے فوراً بعد کھانا شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے ٹھنڈے کھانے میں گوشت، مچھلی، اچار اور سبزی کے کورس پیش کئے گئے۔ اس کے بعد اُبلے ہوئے چاول اور گوشت کی یخنی دی گئی۔ یخنی میں چاول ڈال کر کھائے جاتے ہیں۔ بعد میں گرم کھانے کا دور شروع ہوا۔ اس میں گائے کے گوشت، مرغ، کئی قسم کی مچھلی اور سبزیاں دی گئیں ان کھانوں کے بعد میٹھی ڈشوں کا کورس شروع ہوا۔ سب سے پہلے نہایت لذیذ اور میٹھے تربوز کھانے کو دیئے گئے۔ ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے چین کے نائب وزیر دفاع اور ان کی اہلیہ نے اصرار کیا کہ زیادہ سے زیادہ تربوز کھانا چاہیئے۔ اس کے

بعد آئس کریم اور سبز چائے بھی دی گئی لیکن بہت سے لوگوں نے تربوز کھانے کے بعد آئس کریم نہیں کھائی۔

کھانے کے دوران ترجمان کی وساطت سے چینی میزبانوں کے ساتھ سیاسی، سماجی، ملکی اور غیر ملکی مسائل پر کھل کر بات چیت ہوئی۔ نائب وزیرِ دفاع سے میں نے ان کی انقلابی جدوجہدِ آزادی کے بارے میں تفصیلات پوچھیں۔ میرا خیال تھا کہ وزیر موصوف لانگ مارچ کے تجربات سے بھی ہمیں آگاہ کریں گے۔ مگر استفسار پر انہوں نے بتایا کہ وہ ۱۹۳۸ء میں جاپانی سامراج کے خلاف قومی متحدہ محاذ کی جنگ کے وقت انقلابی فوج میں شامل ہوئے تھے۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے بریگیڈیئر شفیع صاحب نے مجھے بتایا کہ جن لوگوں نے ماؤزے تنگ کے ساتھ لانگ مارچ کی جدوجہد میں حصہ لیا تھا چین میں ان کو بہت زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے چونکہ ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے وزیر موصوف نے لانگ مارچ کے بعد انقلابی فوج میں شمولیت کی تھی اس لئے سفارتی آداب کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ہم نے ان سے اس موضوع پر مزید سوالات نہ کئے۔

ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے چینی دوستوں نے پاکستان کے عوام کے بارے میں گہرے دلی جذبات کا اظہار کیا چین اور پاکستان کے عوام کی دوستی مضبوط کرنے کے سلسلے میں وزیرِ اعظم بھٹو کی خدمات کا اعتراف کیا۔ کھانے کے اختتام پر چین کے وزیرِ اعظم تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے بھٹو صاحب کی چین کے عوام کے ساتھ دوستی اور محبت کو سراہا۔ انھوں نے پاکستانی عوام کی سامراج دشمنی کی جدوجہد کی تعریف کی۔ ہوا کوفنگ نے جنوب مشرقی ایشیا کو غیر ایٹمی علاقہ قرار دینے کے مطالبہ کی حمایت کی۔

انہوں نے تیسری دنیا کے ممالک کی سامراج سے اقتصادی آزادی کی جدوجہد کی

بھرپور حمایت کی اور تیسری دنیا کے ممالک کو اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے منظم و متحد ہونے کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کے مظلوم عوام کی سامراج سے آزادی کی جنگوں کی حمایت کی اور چینی عوام کی طرف سے انھیں بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ ہوا کو فنگ نے اپنی تقریر میں سری لنکا حکومت کے اس مطالبے کی حمایت کی کہ بحرِ ہند کو امن کا علاقہ قرار دیا جائے۔ انہوں نے نیپال کے شہنشاہ کے اس مطالبہ کی بھی حمایت کی کہ نیپال کو بھی آزاد اور امن کا علاقہ تسلیم اور قرار دیا جائے۔ انہوں نے پاکستان اور بنگلہ دیش، پاکستان اور ہندوستان کے بہتر تعلقات کو سراہا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ چین تیسری دنیا کا سوشلسٹ ترقی پذیر ملک ہے۔ اور چیئرمین ماؤ کی عظیم قیادت میں طبقاتی کش مکش کو بنیادی تضاد تصور کرتے ہوئے انقلاب کے مراحل طے کر رہا ہے اور پیداوار میں روز بروز اضافے کے ساتھ ساتھ انقلابی بنیادوں پر ملکی تعمیر اور سامراج کے خلاف جنگ کی صورت میں مکمل تیاریوں کے تقاضے پورے کر رہا ہے۔ مگر انہوں نے وزیرِ اعظم بننے کے بعد پہلی مرتبہ چین میں حالیہ نظریاتی کشمکش کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ ابھی کچھ لوگ موجود ہیں۔ جو ملک میں رائج سوشلسٹ نظام کے مقابلے میں سرمایہ داری نظام کو بحال کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان وجوہات کی بنا پر چینی عوام کی جدوجہد مسلسل جاری ہے۔ چیئرمین ماؤزے تنگ کے ارشادات کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ جدوجہد کے بغیر کوئی ترقی نہیں ہو سکتی اور اسّی کروڑ چینی عوام جدوجہد کے بغیر اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔ حالیہ نظریاتی جدوجہد کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ جدوجہد چیئرمین ماؤ کی ہدایات کی روشنی میں جاری ہے اور انہوں نے خود تن سیاؤ پنگ کی انقلاب دشمن، ترمیم پسند اور دائیں بازو کی انفرادیت

پسندانہ لائن پر کڑی نکتہ چینی کی ہے اور عوام کی حمایت سے انقلابی لائن کو کامیابی حاصل ہوئی ہے اور آئندہ بھی چین کے عوام کی سوشلسٹ انقلاب کی تکمیل کے لیے ملک کے اندر اور بیرونِ ملک چیئرمین ماؤ کی ہدایات کے مطابق جدوجہد جاری رہے گی۔

تقریر کے بعد وزیرِ اعظم چین نے ٹوسٹ پیش کیا اور تالیوں کی گونج میں اپنی میز کے علاوہ پاکستانی مہمانوں کی دوسری میزوں پر ہاتھ ملانے کے لیے تشریف لائے۔ ان کے اپنی نشست پر واپس آنے کے بعد کھانے کے بقیہ کورس جس میں میٹھا اور لذیذ تربوز آئس کریم اور سبز چائے شامل تھے، شروع ہوا۔ اس کے اختتام پر وزیرِ اعظم پاکستان تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے انہوں نے چینی عوام کی تیسری دنیا کے مظلوم عوام کی بھرپور حمایت کو سراہا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ پاکستانی عوام ہندوستان کے ساتھ جہاں باعزت طور پر خوشگوار تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں وہاں کشمیری عوام کے حقِ خود ارادیت کے مؤقف سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ بھٹو صاحب نے نئے اقتصادی نظام کی تشکیل کو وقت کی بڑی ضرورت قرار دیا اور تیسری دنیا کے ممالک کی اقتصادی غلامی کے خلاف جدوجہد کو متحدہ طور پر جاری کرنے کی ہدایت کی۔ آخر میں بھٹو صاحب نے چیئرمین ماؤ کی صحت کے لیے ٹوسٹ پیش کیا اور اپنی میز کے علاوہ دوسری میزوں پر جا کر چینی میزبانوں سے ہاتھ ملایا اور اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد وزیرِ اعظم بھٹو اور ہوا کوفنگ اُٹھ کھڑے ہوئے، آرکسٹرا نے ایک بار پھر پاکستانی اور چینی ترانوں کی دھنیں بجائیں۔ اور پھر ضیافت کا اختتام ہوا۔ رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے تمام مہمان اپنی اپنی کاروں کی جانب چل پڑے۔ راستے میں میری ملاقات کینیڈا کے سفیر کی

اہلیہ سے ہوئی۔ انہوں نے اپنے میاں سے پاکستانی وفد کے رکن کی حیثیت سے میرا تعارف کرایا۔ ان کی چین سے پہلے تعیناتی چونکہ پاکستان میں تھی اس لیے میاں بیوی نے پاکستان کے موسم کھانے اور اپنے دوستوں کا حال احوال پوچھا کینیڈا کے سفیر اور ان کی اہلیہ نے وزیر اعظم بھٹو کے حالیہ دورۂ کینیڈا کے خوشگوار نتائج کا بھی ذکر کیا۔ انھوں نے ہندوستان کے ایٹم بم بنانے کے عزائم کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ بین الاقوامی برادری میں کینیڈا کی پوزیشن بہت خراب ہوئی ہے۔ انہوں نے برصغیر میں ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ کے خدشات کا اظہار کیا۔ اس کے جواب میں میں نے ان سے کہا کہ پاکستان صرف پر امن مقاصد کے لیے ایٹمی توانائی کو استعمال کرنے کا خواہش مند ہے۔ جاتے ہوئے گیانا کے ہندوستانی نژاد سفیر اور ان کی برطانوی نژاد اہلیہ سے ملاقات ہوگئی۔ ان لوگوں نے بھی پاکستان میں بے شمار دوستوں کے بارے میں پوچھا۔ کینیڈا کے سفیر کی اہلیہ نے بتایا کہ گذشتہ چند ہفتوں میں پیکنگ میں موسم خراب رہا ہے اور یہاں شدید گرمی تھی۔ اس کے ساتھ تیز ہوائیں اور گرد بھی اڑ رہی تھی۔ جب ہم باہر نکلے تو پیکنگ کا موسم قدرے خوشگوار تھا اور ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ ہم اپنی کار میں بیٹھ کر مہمان خانے میں واپس آگئے۔ اپنے کمرے میں تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد میں اوپر کی منزل پر مسٹر ناصر رضوی صاحب کے کمرے میں گپ شپ کے لیے گیا۔ ان کے پاس وفد کے ایک اور سینئر رکن بھی بیٹھے تھے۔ ہم نے چین اور کوریا کے منصفانہ سماجی نظام کے بارے میں دیر تک تبادلہ خیال کیا۔ دوستوں نے پاکستان اور چین کے گہرے تعلقات پر تبصرہ کرتے ہوئے اس بات کا بھی ذکر کیا کہ دونوں ملکوں کے عوام نے ایک دوسرے کی دوستی مضبوط کرنے کے لیے بے پناہ قربانیاں دی ہیں۔ اس دوران دونوں ملکوں نے بین الاقوامی

سامراج کی سازشوں کا بھی مقابلہ کیا ہے۔ اس کے بعد میں اپنے کمرے میں واپس آکر نیند کی وادی میں پہنچ گیا۔ رات گئے جب میں اپنے کمرے میں سونے کے لئے آیا تو محمد بخش مجاہد صاحب پہلے ہی گہری نیند سوئے ہوئے تھے اور کبھی کبھی ان کے زوردار خراٹوں سے کمرے کی فضا دہل جاتی تھی میں نے بھی موقع غنیمت جانا اور سو گیا۔

۲۷ — ۵ — ۷۶ صبح ۶ بجے کے قریب میری آنکھ اس وقت کھلی جب میرے کانوں میں تلاوت کی آواز پڑی یہ تلاوت ریڈیو پر ہو رہی تھی پہلے تو میں سمجھا کہ مجاہد صاحب اپنے ٹرانسسٹر ریڈیو پر یا تو پاکستان کا سٹیشن سن رہے ہیں یا ریڈیو پیکنگ، پاکستانی وفد کی چین میں آمد کے موقع پر تلاوتِ قرآن پاک سنا رہا ہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ مجاہد صاحب ٹیپ ریکارڈ پر تلاوت سن رہے ہیں۔ محمد بخش مجاہد صاحب چونکہ رات کو جلدی سو گئے تھے وہ صبح کو ۵ بجے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سب سے پہلے نماز پڑھی پھر سورت یٰسین کا ٹیپ چلایا۔ خود بھی قرآن پاک کی تلاوت کی۔ رات کو مجاہد نے اپنا سامان وغیرہ کھولنے کے بعد اپنے ساتھ لائی ہوئی چیئرمین ماؤزے تنگ اور چیئرمین بھٹو کی دو تصویریں بڑے سلیقے سے اپنے پلنگ کے سرہانے لٹکا دی تھیں۔ جن سے کمرہ سج گیا تھا۔ تلاوت کے بعد میری نیند میں خلل انداز ہوئے بغیر مجاہد صاحب سیر کرنے کے لیے باہر چلے گئے۔ سات بجے کے قریب واپس لوٹے مجھے جگایا اور بتایا کہ وہ وزیرِاعظم بھٹو کی خواب گاہ کی کھڑکی تک جھانک کر آئے ہیں۔ مجاہد صاحب کے کہنے کے مطابق وزیرِاعظم صاحب اُٹھے ہوئے تھے اور امورِ مملکت کے کام کر رہے تھے ہم نے اپنے پہننے کے کپڑے نکالے اور چونکہ چین میں ہر آدمی کو اپنی جوتی خود پالش کرنا پڑتی ہے حتیٰ کہ سرکاری مہمان خانے کے بیرے کے فرائض میں بھی

جوتی صاف کرنا نہیں ہے۔ چنانچہ ہمیں اپنے جوتے خود ہی پالش کرنا پڑے اور ہم آٹھ بجے کے قریب تیار ہو کر ناشتہ کرنے کے لیے گئے۔ شیخ رشید صاحب اور کچھ دوسرے ساتھی وہاں پہلے ہی موجود تھے ہمارا ناشتہ کچھ انگریزی طرز کا تھا۔ شیخ صاحب کے اصرار پر ہیں مغربی طرز کی کافی بھی دی گئی۔ ناشتہ کے بعد شیخ صاحب نے گپ شپ کرنے کے لیے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور اپنے پاجامے کا واقعہ سنایا۔ اسی دوران حنیف نارو صاحب بھی آ گئے۔ انہوں نے کہا کہ گیارہ بجے تنسنگ ہوا یونیورسٹی دیکھنے جانا ہے۔ اس سے پہلے چین کے مشہور فرینڈ شپ سٹور سے خرید و فروخت کرنا چاہیئے۔ ان کی ضد پر ساڑھے نو بجے کے قریب ہم سٹور چلے گئے وہاں بہت سارے دوست ہم سے پہلے ہی پہنچے ہوئے تھے۔

نمونے کے طور پر میں نے اور حنیف نارو نے فی کس پچاس روپے چائنا بوسکی کی ایک ایک قمیض خریدی۔ فرینڈ شپ چائنا سٹور غیر ملکی مہمانوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہاں مقابلتاً معیاری چیزیں فروخت ہوتی ہیں مگر ان کی قیمتیں مارکیٹ کی دوسری دکانوں سے زیادہ نہیں ہیں۔ دوسری دکانوں کے بارے میں ہم آگے چل کر ذکر کریں گے۔ چائنا فرینڈ شپ سٹور کی تین منزلیں ہیں۔ ہر منزل پر مختلف اقسام کی چیزیں نہایت خوب صورتی سے سجی ہوئی تھیں۔ ہمارے مقصد کی زیادہ چیزیں دوسری منزل پر تھیں۔ یہاں سلک کے کپڑے بہت سستے تھے کیونکہ چین میں سلک بہت زیادہ ہوتی ہے اور خام سلک سے کپڑا تیار کرنا کاٹن، ریان اور نائیلون سے سستا پڑتا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ریان اور کاٹن کے کپڑے سلک سے زیادہ مہنگے تھے۔ اگلے روز جب میں نے شیخ صاحب کو بتایا کہ بوسکی کی قمیض ہم نے صرف پچاس روپے میں خریدی ہے تو انہوں نے بھی دو قمیضیں غالباً

زندگی میں پہلی مرتبہ خریدیں۔ پیرزادہ صاحب نے ازراہِ مذاق کھانے کی میز پر شیخ صاحب اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ بھائی تم دونوں سوشلسٹ بوسکی کی قمیضیں بڑی پہنتے ہو میں تمہاری وزیرِ اعظم صاحب سے شکایت کروں گا اور اگر ضروری ہوا تو معاملہ مرکزی کمیٹی میں پیش کیا جائیگا۔ ہم نے ان سے کہا بھئی تعجب کی بات ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے سوشلسٹ ملک میں سب سے سستی بوسکی ہی ہے اور پھر پاکستان میں بوسکی صرف جاگیرداروں کا "ورثہ" ہے لیکن سوشلسٹ ملک میں اس کو مزدور کسان بھی پہن سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میرے پاس دو سو ڈالر ہیں۔ ان میں کیا کیا خریدا جا سکتا۔ مزید یہ کہ بعض دوستوں کے مقابلے میں ہماری خریداری کی مثال "سو سنار کی ایک لوہار کی" کے مصداق ہے۔ جب ہم فرینڈ شپ سٹور میں سیر کر رہے تھے تو میرے ایک شفیق دوست نے آدھ درجن کے قریب رات کے سونے کے لئے بوسکی کے کرتے اور پاجامے خرید ڈالے اس کے علاوہ گرمیوں کے موسم کے سوٹ بشرٹیں پتلونیں اور خواتین کے کپڑے خریدنے کا شوق فرمایا۔ ہمارے ساتھ سفر کرنیوالے چند سرکاری افسروں نے جو قدم قدم پر چین اور کوریا کے سماجی نظام کا مذاق اڑا رہے تھے، جی بھر کر خرید و فروخت کی۔ ہم نے ان سے کہا کہ سوشلسٹ نظام کی مخالفت کا تقاضا ہے کہ آپ یہاں سے خریداری نہ کریں۔ ہماری یہ بات سن کر ان میں سے ایک افسر نے ہمیں کچھ عجیب طریقے سے اپنی آنکھیں دکھائیں۔ ہم سمجھ گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے عہدے اور مرتبے سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمارے خلاف لازمی سیکورٹی رپورٹ مرتب کریں گے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا بہرصورت ہم تھوڑی دیر فرینڈ شپ میں گھومنے پھرنے کے بعد مہمان خانے میں واپس آئے تو ہمیں تشنگ ہوا یونیورسٹی میں جانے

سے لیے تیار ہونے کو کہا گیا اور ساتھ ہی ہمیں کہا گیا کہ مہمان خانہ نمبر ۸ میں فوراً پہنچ جائیں کیونکہ وہاں سے وزیر اعظم کی قیادت میں قافلہ روانہ ہوگا ہماری رہائش گاہوں سے یونیورسٹی بیس کلومیٹر پر واقع تھی۔ اس یونیورسٹی کو یونیورسٹی آف چائنا بھی کہتے ہیں۔

یونیورسٹی کا دورہ

ہم ساڑھے گیارہ بجے کے قریب بھٹو صاحب کی قیادت میں یونیورسٹی پہنچ گئے۔ بڑے دروازے پر ہاتھوں میں سُرخ جھنڈیاں اور رنگ برنگے پھول لیے ہزاروں لڑکوں اور لڑکیوں نے ہمارا استقبال کیا۔ یونیورسٹی کی عمارت بہت شان و شوکت والی ہے۔ پہلی منزل پر ہمیں بہت بڑے لاؤنج کمرہ میں لے جا کر صوفے اور کرسیوں پر بٹھا دیا گیا۔ یہ وہی یونیورسٹی ہے جہاں گزشتہ مہینوں میں نظریاتی جدوجہد کے سلسلے میں رجعت پسند طاقتوں کے خلاف کھلے مظاہروں کا آغاز ہوا تھا۔ اس یونیورسٹی کی خاص خاص جگہوں پر مشہور زمانہ بڑے بڑے پوسٹر دیواروں پر چسپاں تھے۔ اس کے بارے میں ذکر کیا جائیگا۔

استقبالیہ کمرے میں وزیر اعظم کے ساتھ یونیورسٹی کی انتظامیہ کے سربراہ جن کو چیئرمین انقلابی کمیٹی کہتے ہیں، بیٹھے تھے ابتدائی تعارف کے بعد چیئرمین انقلابی کمیٹی نے یونیورسٹی کے بارے میں بتایا کہ یہ یونیورسٹی ۱۹۱۱ء میں قائم ہوئی تھی مگر ۱۹۴۹ء یعنی قیام کے ۳۸ سال بعد تک یہ یونیورسٹی عوام کی کوئی خدمت نہیں کر رہی تھی بلکہ یہ یونیورسٹی سامراجی ثقافت کی یلغار کی زد میں تھی۔ ۱۹۴۹ء سے سوشلسٹ انقلاب کے بعد اس میں عوامی جذبے کے تحت تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا مگر پھر بھی ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۶ء یعنی ثقافتی انقلاب کی درمیانی مدت میں اس یونیورسٹی کے نظام میں زبردست انقلابی تبدیلیاں رونما

ہوئیں۔ اس وقت یونیورسٹی میں گیارہ بڑے شعبے اور ۵۰ چھوٹے شعبے ہیں۔ ۳۵ لیبارٹریوں میں ۹ ہزار طالب علم ہیں۔ تین ہزار اساتذہ ہیں یونیورسٹی میں داخلہ مرکزی کمیٹی کی ہدایات کے مطابق کسانوں، مزدوروں اور سپاہیوں میں سے عملی تجربے کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اصل میں ہوتا یوں ہے۔ کہ دس سال کی سکول کی تعلیم کے بعد ہر لڑکی اور لڑکے کو لازمی طور پر دو سال کے لیے کھیت، فیکٹری یا فوج میں عملی تربیت کے لیے جانا پڑتا ہے وہاں پر یہ طالب علم عوامی انقلابی کمیٹی کی سرکردگی میں کام کرتے ہیں۔ ان طالب علموں میں سے جو بچے بہترین صلاحیتوں، قیادت کے راہنما اصولوں اور نظریات کے فلسفیانہ نقطۂ نظر میں اپنا نام روشن کرتے ہیں۔ ان کے لیے عوامی انقلابی کمیٹی یونیورسٹی میں داخلہ کی سفارش کرتی ہے۔ یہ طریقِ انتخاب ثقافتی انقلاب کے بعد رائج کیا گیا۔ چیئرمین انقلابی کمیٹی نے ہمیں بتایا کہ عظیم ماؤ کی قیادت میں چین کے عوام کو جہاں اپنے اچھے اور بُرے معاملات کے بارے میں مکمل تربیت دی جاتی ہے وہاں اپنے اعلیٰ فوجی مقاصد یک جہتی اور ترقی کے لیے بھی درس دیا جاتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ثقافتی انقلاب سے پہلے طالبِ علم، مزدوروں اور کسانوں کے مسائل سے کما حقہٗ واقفیت نہیں رکھتے تھے اور مُلکی پیداوار میں اضافہ کرنے میں ان کا حصّہ کم تھا۔ ثقافتی انقلاب کے بعد قربانی کے جذبے کے تحت طالب علموں نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ اسی بنا پر یونیورسٹی کی تعلیم کا طریقۂ کار بالکل بدل گیا ہے، اور یونیورسٹی کے شعبہ جات بھی مزدور کسان اور سپاہی طالب علموں کی ضرورت کے مطابق قائم کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے بتایا کہ دو سال کسانوں میں عملی کام کرنے کے بعد یونیورسٹی میں طالب علموں کو زراعت کے شعبے میں کافی ایڈوانس زرعی تربیت دی جاتی ہے۔ اس قسم کے تعلیمی ماحول کے لیے یونیورسٹی کے اساتذہ کو بھی سیاسی، نظریاتی اور عملی تجربات



پیکنگ یونیورسٹی کے دورے کے دوران وزیر اعظم بھٹو اور وفد کے دوسرے اراکین ورکشاپ میں طالبعلموں کے عملی کام کو دیکھ رہے ہیں۔

کی بالکل مختلف تربیت دی جاتی ہے۔

انہوں نے بتایا کہ ثقافتی انقلاب سے قبل کے زمانے کے مقابلے میں آج کے دور کے طالب علم زیادہ خصوصیات کے مالک ہیں اور ان کا بنیادی تعلیمی مقصد عوام کی خدمت کرنا ہے۔ فنی تعلیم کے تقاضے بھی بالکل بدل دیئے گئے ہیں۔ پچھلے سال کی نظریاتی کشمکش کی وجہ سے کسان، مزدور اور سپاہی طالب علموں نے اپنے تعلیمی ماحول کو نیا رُخ دیا ہے۔ طالب علموں نے اپنے ان سیاسی لیڈروں پر جو پارٹی لائن کی مخالفت کرتے ہیں، آزادی سے نکتہ چینی کرنے کا موقعہ پایا ہے۔ اس جدوجہد کے تحت حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ موجودہ نظریاتی جدوجہد ثقافتی انقلاب کا حصّہ ہے اور یہ جدوجہد جاری رہے گی۔ انہوں نے کہا کہ جو لوگ ثقافتی انقلاب کی حمایت نہیں کرتے وہ خود کو تن تنہا محسوس کرتے ہیں۔ مزدور، کسان اور سپاہی طالب علم ترمیم پسند لائن بالکل مسترد کر چکے ہیں۔ جو لوگ انقلابی لائن کی مخالفت کرتے ہیں وہ چین میں بچے کھچے نجی ملکیت کے تحفظ کرنے والے طبقوں کی حمایت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ نظریاتی تحریک چیئرمین ماؤ اور مرکزی کمیٹی کی قیادت میں چلائی جا رہی ہے انہوں نے بتایا کہ یونیورسٹی میں یہ تحریک پارٹی کی کمیٹی کی سرکردگی میں چل رہی ہے۔ چیئرمین نے بتایا کہ اس کمیٹی میں اساتذہ، طالب علم، مزدور، کسان اور سپاہیوں کے نمائندے بیٹھتے ہیں۔

اب وزیراعظم بھٹو صاحب نے چیئرمین انقلابی کمیٹی کی تقریر کے جواب میں مختصر سی تقریر کی جس میں انہوں نے پاکستان اور چین کی دوستی اور باہمی تعاون کو سراہا انہوں نے کہا کہ ہماری دوستی کا تقاضا ہے کہ کوئی بھی عمل جو چین میں استحکام اور اتحاد کی فضا قائم کرتا ہے۔ ہمارے لیے خوشی کا باعث ہے۔ اسی طرح چین میں انقلابی

جدوجہد کے عمل میں معمولی سے معمولی پسپائی بھی اگر چین کے لیے فکر مندی کا باعث بنتی ہے تو پاکستان بھی اس میں برابر کا شریک ہے۔ انہوں نے کہا ہمیں یقین ہے کہ چین کے عوام چیئرمین ماؤ کی قیادت میں انقلاب کے استحکام کی منزلیں کامیابی سے طے کرلیں گے۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ مزید تبصرہ کرنا میرے لیے مناسب نہیں ہوگا۔ کیونکہ ایسا کرنا چین کے اندرونی معاملات میں جھانکنے کے مترادف ہوگا۔ تاہم بھٹو صاحب نے اپنے وفد کے دوسرے اراکین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ وہ کوئی سوال پوچھنا چاہیں تو پوچھ سکتے ہیں۔ سب سے پہلے پیرزادہ صاحب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بھٹو صاحب نے کہا کہ "غالباً وہ مخلوط تعلیم پر کوئی سوال پوچھنا پسند کریں گے۔" جس پر دوست زیرِ لب مسکرائے بہرحال پیرزادہ صاحب نے سوال کیا۔

سوال؟ مزدور، کسان طالب علم جو یونیورسٹی میں آتے ہیں ان کے لیے کس قسم کے نصاب کا انتخاب کیا جاتا ہے

جواب:۔ چیئرمین انقلابی کمیٹی نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ سب سے پہلے ان طلباء کے عملی تجربہ کو مدِنظر رکھا جاتا ہے اس کی بنیاد پر انھیں مناسب شعبہ میں پڑھنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ نصاب کا انتخاب اسی عملی تجربے اور آئندہ کی تربیت کے مطابق کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر بھٹو صاحب نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ آپ کا طریقۂ انتخاب یقیناً قابلِ قدر ہے اور دوسرے ترقی پذیر ممالک کو بھی زیرِ عمل لانا چاہیئے۔ اب بھٹو صاحب میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا "لنگاہ صاحب! آپ کو سوال پوچھنے کا بڑا شوق ہوتا ہے اور آپ کے سوال کے بغیر ہم چین سے کیسے واپس جا سکتے ہیں۔" میں نے چیئرمین انقلابی کمیٹی سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا

سوال : آپ سائنس اور ٹیکنالوجی کے مضامین کی تربیت کے لیے مزدوروں، کسانوں اور سپاہیوں میں سے کس طرح چناؤ کرتے ہیں ؟

جواب : یہ چناؤ عمل اور نظریات کے فلسفہ کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ مزدور، کسان، طالب علموں کو سب سے پہلے کھیت اور فیکٹری میں بھیجا جاتا ہے تاکہ وہ عملی تجربات سے مسلح ہو کر یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے کے قابل ہو سکیں۔

میں نے استفسار کیا ۔مگر سوال یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے مضامین کا مطالعہ کرنے کے لیے طلبار کے رجحان کا علم یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران ہی کیا جا سکتا ہے ۔مگر یونیورسٹی میں آنے سے پہلے مزدور، کسان اور سپاہی طلبار کے سائنس کے مضامین پڑھنے کے رجحانات کا اندازہ کس طرح لگایا جاتا ہے؟

جواب : ،چیئرمین انقلابی کمیٹی نے میرے اس سوال پر اپنے مختلف شعبہ جات کے وہاں پر موجود سربراہوں سے چینی زبان میں گفت وشنید کرنے کے بعد جواب دیا"۔طالب علموں کے یونیورسٹی میں داخل ہونے کے بعد ہم انھیں مختلف ریسیرچ کے شعبہ جات میں ٹریننگ کے لیے بھیجتے ہیں وہاں پر اُن کے رجحان کا گہرا مطالعہ کیا جاتا ہے جس کی بنیاد پر مختلف مضامین کے ماہر اساتذہ طلبار کے رجحان کے بارے میں سفارش کرتے ہیں یونیورسٹی کے مطالعہ کے وقفے کے دوران عملی تجربہ اور ٹریننگ کو بھی اس ضمن میں مدنظر رکھا جاتا ہے

میں نے سوال کیا۔آپ کے پاس اس یونیورسٹی کے علاوہ بھی اعلیٰ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تربیت کے ادارے موجود ہیں؟

جواب : چیئرمین ۔جہاں تک یونیورسٹی کی تعلیم کا تعلق ہے۔چین میں اب اس یونیورسٹی کی طرح کی بے شمار یونیورسٹیاں موجود ہیں اور جہاں تک سائنس اور ٹیکنالوجی کے مضامین میں سپیشلسٹ ریسیرچ کا تعلق ہے ہمارے پاس دوسرے خصوصی ادارے

موجود ہیں میرے سوال کے اختتام پر بھٹو صاحب ڈاکٹر عبدالخالق کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا کہ "آپ پنجاب کے وزیر تعلیم رہ چکے ہیں اگر کوئی سوال پوچھنا چاہیں تو ضرور پوچھیں"۔

انھوں نے کہا کہ میں نے چین کے تعلیمی نظام کا مکمل مطالعہ کیا ہے۔ اس لیے سوال پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ پھر وزیر اعظم شیخ محمد رشید صاحب کی طرف متوجہ ہوئے تو انہوں نے بھی اپنے عملی تجربہ کا حوالہ دیتے ہوئے کوئی سوال نہ پوچھا۔ عبدالوحید کٹپر صاحب نے بھی سوال پوچھنے میں دل چسپی نہ لی۔ آخر میں بھٹو صاحب نے پاکستان کے معروف کالم نویس مسٹر برکی سے کوئی سوال پوچھنے کو کہا۔ برکی صاحب بھی کمال کے آدمی ہیں انہوں نے صبح کا مخصوص انگریزی لباس پہنا ہوا تھا اور گلے میں "بو" باندھ رکھی تھی یوں لگتا تھا جیسے کوئی انگریز بیٹھا ہو۔ انہوں نے "بو" ٹھیک کی اپنے کوٹ کے کالر درست کئے ذرا ہلے جلے کبھی دائیں پہلو اور کبھی بائیں پہلو۔ مزے کی بات ہے کہ چیئرمین انقلابی کمیٹی لگاتار ان کی جانب متوجہ تھے کہ ابھی کوئی سوال پوچھیں گے مگر انھوں نے اتنا عرصہ ترسانے کے بعد سوال پوچھنے سے معذرت کر لی اب ماحول کچھ غیر رسمی ہو گیا اور دوسرے دوستوں نے بھی جرأت کر کے چند سوال پوچھ ڈالے۔

کراچی بار ایسوسی ایشن کے صدر مسٹر صغیر حسین جعفری نے سوال کرتے ہوئے پوچھا! سوال: یونیورسٹی طلباء کے چناؤ کا معیار کیا ہے۔؟

جواب: کھیت اور فیکٹری پر عملی کام کا تجربہ قیادت کی صلاحیتیں سیاسی اور نظریاتی سطح کے پیش نظر کھیت، فیکٹری اور فوجی انقلابی کمیٹی کے اراکین کی سفارش کی بنیاد پر یونیورسٹی کے لیے طلباء کا چناؤ کیا جاتا ہے۔ اس سے قبل جونیئر اور ہائی سکول اور کم از کم دو سال کے عملی تجربات کے نتائج بھی یونیورسٹی تعلیم کے

لیے زیرِ غور آتے ہیں۔ کوئٹہ کے اخبار (قاصد) کے ایڈیٹر مرزا ابراہیم خلیل نے سوال کرتے ہوئے پوچھا۔

سوال: کیا آپ کو سائنس اور ٹیکنالوجی جیسے مضامین چینی زبان میں پڑھانے میں کوئی دقت پیش آتی ہے۔؟

جواب: چیئرمین انقلابی کمیٹی نے پُرزور لہجے میں کہا "بالکل نہیں"۔ اس موقع پر وزیرِاعظم بھٹو صاحب نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ چینی زبان میں تعلیم کی کوئی دقت نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ چین میں سائنس کے ٹیکنیکل الفاظ کا چینی زبان میں ترجمہ کیا جا چکا ہے اور یہ زبان بذاتِ خود بہت کشادہ دامن ہے۔

اس کے بعد چیئرمین نے بات آگے بڑھاتے ہوئے وضاحت کی کہ انقلاب سے پہلے فنی مضامین چینی اور انگریزی زبان میں پڑھائے جاتے تھے۔ مگر اب تمام ریسیرچ صرف چینی زبان میں کی جاتی ہے۔ وزیرِاعظم بھٹو نے چیئرمین انقلابی کمیٹی کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ سوال یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے وہ الفاظ جو انگریزی زبان میں نہیں ہیں بلکہ جرمن یا لاطینی زبان میں ہیں اور بین الاقوامی لغت کا حصہ بن چکے ہیں کیا ان کو بھی استعمال نہیں کیا جاتا۔؟

چیئرمین انقلابی کمیٹی نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ "بالکل نہیں کیا جاتا"۔ بھٹو صاحب نے مزید گفتگو جاری رکھتے ہوئے چیئرمین انقلابی کمیٹی سے کہا کہ "اصل میں آپ کی زبان بالکل مکمل ہے"۔ آپ نے اپنی زبان میں جاپانی اور دوسری زبانوں کے الفاظ استعمال نہیں کئے جب کہ ہماری زبان فارسی عربی اور سنسکرت کا مرقع ہے چونکہ فارسی عربی زبان نے بھی بین الاقوامی لغت کے الفاظ اپنا لیے ہیں۔ اس لیے ہم نے اپنی زبان میں غیر ملکی الفاظ اپنانے سے گریز نہیں کیا۔ اسکے علاوہ ہمارے یہاں بذاتِ خود مکمل زبانیں ہیں۔ ان وجوہات کو بھی ہمیں سامنے رکھنا پڑتا ہے جبکہ چین میں علاقائی

زبانوں کا کوئی مسئلہ نہیں۔ اس کے بعد سوالات کا سلسلہ ختم ہوا اور چیئرمین انقلابی کمیٹی نے وفد کے اراکین کا شکریہ ادا کیا۔

اس سوال و جواب کے دوران چائے، بسکٹ اور سنگترے کے جوس سے ہماری تواضع کی گئی یہاں سے اٹھنے کے بعد ہمیں قریب ہی واقع اس مشہور و معروف کارخانہ میں لے جایا گیا۔ جہاں دیواروں پر قدِ آدم پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ ہمارے گائیڈ نے ہمیں بتایا کہ ان پوسٹرز پر چین کی موجودہ نظریاتی کش مکش کے سلسلے میں تن سیاؤ پنگ اور ان کے اتحادیوں کے خلاف انقلابیوں کی طرف سے جوابی نکتہ چینی کی گئی ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ پچھلے سال ستمبر، اکتوبر میں، جب کہ مسٹر چو این لائی ابھی زندہ تھے اور تن سیاؤ پنگ نائب وزیرِ اعظم تھے تو انہوں نے ماؤزے تنگ کے اقوال کے مسودے سے پارٹی کے بنیادی یونٹوں تک ایک سرکلر تقسیم کیا۔ اس سرکلر میں یہ کہا گیا تھا کہ چین میں اندرونِ ملک بنیادی تضاد اقتصادی مسائل ہیں یعنی چین میں پیداوار بڑھانے، مزدوروں کی تنخواہیں زیادہ کرنے اور دوسری مراعات دینے، کھیت اور فیکٹری میں مزدوروں کو منافع میں شریک کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ درحقیقت اس سرکلر میں سرمایہ داری نظام کے رجحانات اور ترمیم پسندی کی جھلک تھی کمیونسٹ پارٹی کی روایات کے مطابق تن سیاؤ پنگ کا یہ سرکلر ملک کے دور دراز علاقوں میں پارٹی کے بنیادی یونٹوں تک تنقید اور خود تنقید کے لیے تقسیم کیا گیا۔ پارٹی کے کاڈرز نے جب اس کا گہرا مطالعہ کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سرکلر سرمایہ داری نظام اور ترمیم پسندی کے رجحانات کا عکاس ہے۔ نچلی سطح سے بحث و تمحیص کے بعد پارٹی کی کمیٹیوں کی رائے اوپر کی سطح کی کمیٹیوں کو بھیجنے کے اس عمل میں پانچ چھ مہینے گزر گئے اس دوران مسٹر چو این لائی کا انتقال ہو گیا اور تن سیاؤ پنگ قائم

مقام وزیرِ اعظم بن گئے ملک کے مختلف علاقوں میں خاص طور پر یونیورسٹیوں میں تن سیاؤ پنگ کی ترمیم پسند لائن کے بارے میں پہلے ہی تھوڑی بہت تنقید ہونی شروع ہو گئی تھی۔ اب چوں کہ چو این لائی کے انتقال کے بعد چین کے نئے وزیرِ اعظم کے انتخاب کا مسئلہ بھی درپیش تھا تن سیاؤ پنگ کے حامیوں نئے ترمیم پسند لائن پر عمل کرنے اور ان کو مستقل وزیرِ اعظم بنانے کے لیے تحریک شروع کر دی۔ اس تحریک کا آغاز اس یونیورسٹی کے ترمیم پسند اساتذہ کی مدد سے ہوا۔ تن سیاؤ پنگ کے حامیوں نے سب سے پہلے اس یونیورسٹی میں اپنے نقطۂ نگاہ کی حمایت میں قدِ آدم پوسٹر لگائے۔ یہ پوسٹرز پیکنگ کے دوسرے حصّوں میں بھی لگائے گئے اور پندرہ ہزار کے قریب تن سیاؤ پنگ کے حامیوں نے پیکنگ تیئن این من سکوئر میں جلوس نکالا۔ اور چیئرمین ماؤزے تنگ کی انقلابی لائن کے خلاف نعرے لگائے۔ یہاں تک کہ چیئرمین ماؤ کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ ان مظاہروں کے بعد اساتذہ کے مقابلے میں طالب علموں نے انقلابی لائن کی حمایت میں سب سے پہلے اس یونیورسٹی میں جوابی پوسٹر لگائے اور تن سیاؤ پنگ کی لائن کے خلاف احتجاج کیا۔ یہ احتجاج پارٹی کے انقلابی دھڑے کی قیادت میں کیا گیا تن سیاؤ پنگ دھڑے کے پندرہ ہزار افراد کے جلوس کے مقابلے میں انقلابیوں نے جو جلوس نکالا وہ لاکھوں افراد پر مشتمل تھا۔ انہوں نے پیکنگ تیئن این من سکوئر میں مظاہرہ کیا۔ اس کے ملک بھر میں مہم شروع ہو گئی۔ کھیتوں، فیکٹریوں اور یونیورسٹیوں میں ماؤزے تنگ کی حمایت میں اور تن سیاؤ پنگ کی لائن کے خلاف زبردست اور تاریخی مظاہرے ہوئے گویا یہ ایک عوامی ریفرنڈم تھا جس کے نتیجہ میں تن سیاؤ پنگ اور اس کے ساتھی جن میں ایک وزیرِ تعلیم بھی تھے، کو عہدوں سے ہٹا دیا گیا اور ان کی جگہ مرکزی کمیٹی نے ہوا کوفنگ کو چین کا وزیرِ اعظم منتخب کر لیا۔ ترمیم پسندوں کا مؤقف تھا کہ چین میں جو مزدور

کی دس سال سے تنخواہ نہیں بڑھی ہے اس کو بڑھایا جائے۔ مزدوروں کو مزید مراعات دی جائیں اور انھیں منافع میں شریک کیا جائے۔

ماؤزے تنگ لائن یہ ہے کہ چین ابھی ترقی پذیر سوشلسٹ ملک ہے۔ اگرچہ نجی ملکیت کا خاتمہ ہو چکا ہے مگر ابھی پرانے جاگیرداروں کے بیٹے بیٹیاں اور ان کے حواری سرمایہ داروں کی اولاد گماشتہ افسر شاہی میں رجعت پسند اور ترمیم پسند کافی تعداد میں موجود ہیں ان لوگوں کی مسلسل کوشش ہے کہ چین میں انقلابی عمل کو نقصان پہنچایا جائے۔ اور سرمایہ داری نظام کو بحال کرنے کی کوشش کی جائے۔ ماؤزے تنگ لائن کے مطابق سوشلسٹ انقلاب کی تکمیل کے ضمن میں صرف ایک اہم منزل ابھی تک طے ہوئی ہے یعنی نجی ملکیت کا مکمل خاتمہ اسکے علاوہ سرمایہ داری نظام کی لعنتوں کے دوسرے فکری عوامل اور باقیات ابھی موجود ہیں۔ ذراسی کوتاہی پر بھی یہ لوگ پر پرزے نکال سکتے ہیں جب کہ ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۶ء تک کا ثقافتی انقلاب بھی موجودہ نظریاتی جدوجہد کا حصہ تھا۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ چین میں موجودہ تنخواہیں اتنی زیادہ ہیں کہ مزدور کسان خوشحالی سے زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان کی طرف سے تنخواہوں میں اضافے کا کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا۔ تنخواہوں کے علاوہ بھی انھیں یہاں بے شمار مراعات دی جاتی ہیں۔ مزدوروں کی تنخواہوں میں اضافے کی بات تن سیاؤ پنگ اور اس کے ترمیم پسند دھڑے کی طرف سے ہی پیش کی گئی تاکہ چین کے انقلاب کو نقصان پہنچایا جائے۔ سرمایہ دار ممالک کا یہ پراپیگنڈہ کہ سوشلسٹ ممالک میں بدترین آمریت ہوتی ہے اور کسی شخص کو جمہوری رائے دینے کا حق نہیں ہے، بالکل بے بنیاد ہے۔ تن سیاؤ پنگ کے خلاف تحریک کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوشلسٹ ممالک میں اپنی طرز کا جمہوری عمل موجود ہے۔ جس کے تحت نچلی سطح سے اوپر تک

عوام آزادانہ طریقے سے اپنی رائے دے سکتے ہیں۔ حقیقت میں یہ طریقہ سب سے اعلیٰ جمہوری عمل ہے جس کے تحت عوام ہی کو بالادستی حاصل ہے۔ کوئی بھی شخص عوام کی مرضی کے بغیر حکومتی عہدہ پر نہیں رہ سکتا۔ بلاشبہ سائنسی اندازِ نظر کے "تابع" مغربی طرز کی جمہوریت کے مقابلے میں عوامی جمہوریت ایک جدید معتبر نظام ہے۔ تن سیاؤ پنگ کے خلاف تحریک میں جو مظاہرے ہوئے ان میں تن سیاؤپنگ کے دھڑے کے افراد میں سے سو کے قریب گرفتار بھی ہوئے۔ مگر چین میں گرفتاری کے بعد کسی کو ذہنی یا جسمانی اذیت نہیں دی جاتی۔ اس کی بجائے سیاسی قیدیوں کو اصلاحی عمل سے سمجھایا بوجھایا جاتا ہے اور اس کے لیے ان کو کھیتوں فیکٹریوں یا صلاحیت کے مطابق دوسرے کام کے اداروں میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں پر عوامی انقلابی کمیٹی ان لوگوں کو تنقید خود تنقید اور بحث و تمحیص کے ذریعے راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتی ہے۔

ہم پوسٹرز دیکھ رہے تھے اور اس تحریک کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے تھے۔ جو پوسٹرز دیواروں پر چسپاں تھے ان پر دونوں دھڑوں کی طرف سے اپنے اپنے نظریات کے حق میں لکھا ہوا تھا۔ ہمیں گائیڈ نے بتایا کہ تن سیاؤپنگ کے واقعہ کے علاوہ بھی دوسرے نظریاتی سیاسی، ملکی اور غیر ملکی معاملات پر اس طریقے سے یونیورسٹی کھیت، فیکٹری اور عوام کے اداروں میں پوسٹرز کے ذریعے جمہوری خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد ہم یونیورسٹی مشین ٹول ورکشاپ دیکھنے کے لیے گئے۔ یہاں دو سو کے قریب لڑکے اور لڑکیاں مشینوں پر کل پرزے بنانے کی مشق کر رہے تھے۔ یہ ٹریننگ یونیورسٹی تعلیم کا حصہ ہے اور عملی تجربات کی بنیاد پر تعلیم حاصل کرنے کے اصولوں کا جزو ہے۔ یہاں پر وزیرِ اعظم بھٹو اور وفد کے دوسرے اراکین نے گھل مل کر باتیں کیں اور ان کی ٹریننگ کے بارے

میں تفصیلات پوچھیں۔ یہاں سے فارغ ہو کر ہم واپس گاڑیوں کی طرف آئے۔ راستے میں یونیورسٹی کے طلباء اور طالبات کے ہوسٹل تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ لڑکے اور لڑکیوں کے علیحدہ علیحدہ ہوسٹل ہیں مگر لڑکے اور لڑکیوں کو اکٹھے گھومنے پھرنے کی مکمل آزادی ہے۔ یونیورسٹی کے طلباء و طالبات کے لباس تقریباً ایک جیسے تھے نیلے رنگ کی پتلون اور سفید رنگ کے بشرٹ لڑکیوں نے پہنے ہوئے تھے اور لڑکوں نے بھی اسی قسم کا لباس پہنا ہوا تھا۔ لڑکیوں کے چہرے پر کوئی میک اپ نہیں تھا۔ زیورات یا بناوٹ بالکل نہیں تھی۔ یونیورسٹی طالب علموں کے عادات و اطوار کے بارے میں ہم نے جب پوچھا تو گائیڈ نے بتایا کہ طالب علم معمولی سگرٹ نوشی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں کوئی بری عادت موجود نہیں ہے چین میں شراب پر قانونی پابندی نہیں ہے۔ لیکن مہنگی اتنی ہے کہ عام آدمی اسے خرید ہی نہیں سکتا۔ یہاں بئیر کی عام بوتل پانچ روپے میں ملتی ہے۔ وسکی اور دوسری شرابیں تقریباً چالیس پچاس روپے فی بوتل کے حساب سے دستیاب ہیں جو اوسط آمدنی کے تحت عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہے۔ تنخواہ پانچ سو روپے ماہانہ ہے جبکہ زیادہ سے زیادہ دو ہزار روپے اور کم از کم اڑھائی تین سو شہر میں اور پونے دو سو دیہات میں فی کس اوسط آمدنی ہے نتیجۃً عوام تعیشات میں نہیں پڑ سکتے وہ ان چیزوں کو نہ تو خرید سکتے ہیں اور نہ ہی ایسی عادت ڈال سکتے ہیں۔ ویسے بھی چین کے سوشلسٹ نظام میں ایسی فضول خرچیوں اور عیش و عشرت کی گنجائش نہیں اور نہ برائیوں کی طرف عوام کی رغبت ہی ہے۔ اخلاقی اعتبار سے یہ لوگ اتنے بلند ہو چکے ہیں اور وہاں فکر و عمل کی عظمت کے دھارے اس طرح بہہ رہے ہیں کہ ان اشیاء کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں جاتا اور چینی عوام نے ان کو اپنی زندگی سے نکال پھینکا ہے۔ جب ہم اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر واپس مہمان خانے

کی طرف آ رہے تھے تو نگاہ اِرد گرد بنے ہوئے ان مکانوں پر گردش کر رہی تھی جو بظاہر پُرانے طرز کے لگتے تھے مگر صاف ستھرے اور جدید سہولتوں سے آراستہ تھے۔ ان تمام دیہات میں بجلی پانی اور صحت و صفائی کے مکمل انتظامات تھے۔ جوں جوں شہر قریب آ رہا تھا تو جدید طرز کے کئی منزلہ فلیٹ بھی دکھائی دیتے۔ ہمارا قافلہ ڈیڑھ بجے کے قریب مہمان خانہ میں واپس آیا۔ ہم دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد آرام کرنے کے لیے اپنے کمروں میں چلے گئے تین بجے اٹھ کھڑے ہوئے اور سٹیل کمپنی دیکھنے کے لیے تیار ہو گئے

کیپٹل آئرن اینڈ سٹیل کمپنی

تین بجے بعد دوپہر ہم کیپٹل آئرن اینڈ سٹیل کمپنی دیکھنے کے لیے گئے چونکہ وزیرِ اعظم مرکزی وزراء اور وفد کے دوسرے سینئر اراکین نے چینی راہنماؤں کے ساتھ مذاکرات کرنے تھے اس لیے ہمارے اس وفد میں صوبائی وزراء، اراکینِ اسمبلی، پارٹی عہدہ دار اور صحافی دوست شامل تھے سٹیل فیکٹری پیکنگ سے چالیس کلومیٹر پر واقع ہے۔ ہمارا قافلہ سب سے پہلے کمپنی کے ہیڈ کوارٹر کے پاس آ کر رُکا۔ یہاں پر سینکڑوں کی تعداد میں مرد اور کارکن خواتین نے ہمارا استقبال کیا۔ اس کے بعد ہمیں استقبالیہ کے کمرے میں لے جا کر بٹھایا گیا۔ حسبِ دستور سنگترے کا جوس، سبز چائے ہمارے سامنے رکھ دی گئی کمپنی کے سربراہ جو کہ انقلابی کمیٹی کے چیئرمین بھی ہیں نے ہمیں فیکٹری کا تعارف کرایا۔ چیئرمین کے علاوہ سٹیل کمپنی کے دوسرے عہدے دار اور نمائندے بھی وہاں پر موجود تھے۔ فیکٹری کے مزدوروں کی نمائندگی ایک نوجوان خاتون کر رہی تھی کیپٹل آئرن اینڈ

سٹیل کمپنی جیسا کہ ہمیں چیئرمین نے بتایا، چالیس سال قبل وجود میں آئی تھی اور انقلاب سے پہلے رجعت پسند حکومتوں میں اس فیکٹری میں مزدور جانوروں کی طرح خون پسینہ بہاتے تھے اور اس کی مشینری نامکمل اور خستہ حالت میں تھی۔ انقلاب سے تین سال قبل تک یہاں پر صرف دو لاکھ چھیاسی ہزار ٹن خام لوہا تیار کیا جاتا تھا۔ انقلاب کے بعد چین کی قابل قدر مرکزی کمیٹی اور عظیم ماؤزے تنگ کی ذہانت۔ فراست اور اعلیٰ قیادت کی وجہ سے مزدور اور عوام اس کمپنی کے مالک بن چکے ہیں۔ انقلاب کے بعد اقتصادی بحالی کے دوران ایک محتاط اندازے کے مطابق اس فیکٹری میں خام لوہے کی پیداوار پچھلے سالوں کی پیداوار سے مجموعی طور پر ۱۳۰۰٪ بڑھ چکی ہے ۱۹۵۸ء کے زمانہ میں جب اقتصادی ترقی کی اہم منزلیں طے ہوئیں تو فیکٹری کے مزدوروں نے چودہ دن کی زبردست محنت مشقت کے بعد خام لوہے کو فولاد میں ڈھالنے کا پہلا سانچہ تیار کیا۔ ۱۹۵۹ء میں مزدوروں نے نئی لوہے کی دھات کی کان کنی کا کام شروع کیا جو ایک سال میں مکمل ہو گیا اور تھوڑی سی مدت میں یہ فیکٹری جو پہلے سے صرف خام لوہا تیار کرتی تھی۔ اس کی نہ تو اپنی کان تھی اور نہ اس میں فولاد ہی تیار ہوتا تھا سانچے کی تعمیر اور کان کنی کے بعد اس فیکٹری کی دس لاکھ ٹن خام لوہا تیار کرنے کی صلاحیت ہو گئی۔ اس کے علاوہ اس میں دس اور منصوبے جن میں آکسیجن سے فولاد ڈھالنے کا سانچہ، لوہا پگھلانے کی بھٹی، رولنگ مل کوکنگ فرنس اور لوہے کو ٹھوس بنانے کی ورکشاپ شامل تھیں تیار کئے گئے۔ ثقافتی انقلاب سے تھوڑا عرصہ قبل کمپنی کے مزدوروں اور سٹاف ممبران نے ماؤزے تنگ کی انقلابی لائن سے رہبری حاصل کرتے ہوئے اور انقلابی جذبے سے سرشار تین سال محنت شاقہ کے بعد ایک اور لوہے کی دھات کی کان کھودی

اور تعمیر کی بسنہ ۱۹۷۱ء میں لوہے کی دھات کی پیداوار خود کفالت تک پہنچ گئی۔ یہ پیداوار ۱۹۷۱ء میں ثقافتی انقلاب کے سال ۱۹۶۶ء کے مقابلے میں سوا تین گنا زیادہ تھی ۱۹۶۴ء میں صرف ۹ مہینے کے عرصہ میں ورکشاپ نمبر ۸۵ کی تکمیل ہوئی۔ ۱۹۷۱ء-۷۳ء کے تین سال کے دوران خام لوہے کی پیداوار بتدریج ۱۲، ۱۴، ۳۷، فی صدی بڑھی۔ اس عرصے میں فولاد کی پیداوار میں اڑھائی گنا کا اضافہ ہوا اس وقت اس کمپنی میں چالیس ہزار مزدور اور سٹاف کے دوسرے اراکین مختلف شعبہ جات میں کام کرتے ہیں اور اب یہاں بارہ لاکھ ٹن سالانہ فولاد تیار ہو رہا ہے۔ اتنی حیرت انگیز ترقی سوشلسٹ اصولوں کی بدولت ہوئی ہے فیکٹری کی پیداوار وسعت اور اضافے کے ساتھ ساتھ مزدوروں اور کارکنوں کی تنخواہیں اور ضروریات زندگی کی فراہمی میں انقلابی تبدیلیاں آئی ہیں اس وقت کمپنی اپنی سرکردگی میں رفاعِ عامہ کے منصوبے جن میں مزدوروں کی کنٹین۔ سکول ہسپتال۔ مکانات کی تعمیر نرسری اور کنڈر گارٹن سکول وغیرہ شامل ہیں بنا چکی ہے اور مزید منصوبے زیرِ تکمیل ہیں۔

ان تفصیلات کا ذکر کرتے ہوئے چیئرمین انقلابی کمیٹی نے آخر میں ہمیں بتایا کہ اب بھی بلز انتظامیہ کو بے شمار مسائل درپیش ہیں، مثلاً پیداوار کی شرح قدرے کم ہے، مختلف شعبوں میں مشینری پرانی ہے۔ فیکٹری میں فولاد کی تیاری کے دوران گیس، مائع اور دوسرے بچے کھچے اجزاء کا سودمند مصرف نہیں کیا جاتا۔ فیکٹری کے ارد گرد کے ماحول کو خوش گوار اور صاف ستھرا کرنے کی ابھی ضرورت ہے۔ اب مزدور اور کارکن چیئرمین ماؤ کی انقلابی ہدایات کے مطابق فیکٹری کی کارکردگی اور بہتر سہولتوں کے لیے مزید جد و جہد کر رہے ہیں۔ اس تعارف کے بعد چیئرمین انقلابی کمیٹی نے ہم سے سوال پوچھنے کو کہا۔ ہمارے وفد کے ایک سینئر رکن جو بزعمِ خود وفد کی قیادت کر رہے تھے، چیئرمین انقلابی کمیٹی سے کہا کہ سب لوگوں نے سمجھ

لیا ہے اور اب ہمیں فیکٹری کے مختلف شعبوں میں موقع پر جا کر ملاحظہ کا موقع دیں۔ چنانچہ سوال و جواب کی حسرت دل میں لیے ہم فیکٹری دیکھنے چلے گئے۔ سب سے پہلے ہمیں لوہا پگھلانے کی بھٹیاں دکھائی گئیں اس کے بعد ہم فیکٹری کے اس حصے میں گئے جہاں گرم لوہے کے بڑے بڑے تودوں کو کاٹ کر فولاد کے گارڈرز سریے اور دوسرے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تیار کئے جاتے ہیں۔ یہ مل کا حصہ فنی اعتبار سے پیچیدہ اور وسیع و عریض تھا جب ہم اس حصہ سے باہر نکلے تو سینکڑوں کی تعداد میں مزدوروں نے ہمارا پھر استقبال کیا۔ فیکٹری کے اس حصے کے باہر بہت بڑے بڑے اشتہار اور پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ ہمارے استفسار پر پتہ چلا کہ یونیورسٹی کی طرح ان اشتہاروں پر نظریاتی جدوجہد کے بارے میں بحث و تمحیص کی گئی ہے۔ ان پوسٹروں میں ماؤ لائن کی حمایت اور تن سیاؤ پنگ کی ترمیم پسندی کی مخالفت کی گئی تھی۔ یہاں پر ہمیں فیکٹری کی مختلف درکشاپیں اور دوسرے شعبہ جات دکھانے کے لیے لے جایا گیا۔ جس کے بعد ہمارے دورہ کا اختتام ہوا۔ اس کئی مربع میل میں پھیلی ہوئی فیکٹری کے چند ایک نمایاں پہلوؤں کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ یہاں چند ایک اور باتیں بھی بیان کرنی ضروری ہیں جب ہم انتظامیہ کے مرکزی دفاتر گئے تو یوں محسوس ہوا جیسے یہ دفتر نہیں کوئی معمولی سا کمرہ ہے۔

استقبالیہ روم بہت وسیع تھا اور صاف ستھرے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ کوئی افسر شاہی ٹائپ چیز موجود نہ تھی۔ چیئرمین انقلابی کمیٹی اور دوسرے بڑے انجینئر افسر اور ماہرین جن سے ہم ملے نہایت سادہ کپڑوں میں ملبوس تھے اور ان کا خلق تو کبھی نہیں بھول سکے گا۔ کارکنوں اور افسروں میں بہت کم فرق نظر آرہا تھا۔ افسروں کا اور مزدوروں کا باہمی تعلق ایک خاندان کے افراد کی طرح دیکھنے میں آیا۔ مرد اور عورتیں شانہ بشانہ کام کر رہی تھیں سٹیل فیکٹری میں ملک کی تمام فیکٹریوں کے مقابلے

میں تنخواہوں کی شرح کچھ زیادہ ہے مگر مرد اور عورتوں کی تنخواہیں مرتبہ اور کام کی نوعیت کے مطابق ایک جیسی ہیں۔ یہاں مزدور اور انتظامیہ کے افراد ملک کی دوسری فیکٹریوں اور کارخانوں کی طرح ۲۴ گھنٹوں میں صرف آٹھ گھنٹے کام کرتے ہیں۔ ان آٹھ گھنٹوں میں چائے اور کھانے کے لیے ریلیسٹ کا وقفہ بھی دیا جاتا ہے۔ مزدوروں کو شفٹ سسٹم کے تحت ہفتہ میں ایک چھٹی بھی دی جاتی ہے لیکن پورے چین میں ایک بھی فیکٹری سال میں ایک دن کے لیے بھی بند نہیں ہوتی کیونکہ اگر ملک میں ایک دن کی چھٹی کر دی جائے اور فیکٹری بند ہو جائے تو اسّی کروڑ آبادی کے ملک میں اسّی کروڑ پیداواری دن ضائع ہو جانے سے ملک کی ترقی اور خوشحالی میں فرق پڑ سکتا ہے۔ ہم سٹیل کمپنی کی فکر انگیز معلومات لیکر باہر آئے اور اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر مہمان خانوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستہ میں میری نظر مزدوروں کے رہائشی کوارٹروں پر پڑی جو کشادہ اور صاف ستھرے تھے اور یہ فیکٹری سے کافی دور واقع تھے۔ یہاں سے مزدور بسوں کے ذریعے یا اپنی سائیکلوں پر فیکٹری میں جاتے ہیں۔ ان رہائشی مکانات کی حدود میں نرسری سکول اور کنڈر گارٹن ہائی سکول ہسپتال اور ثقافتی مراکز واقع ہیں۔ ساڑھے پانچ بجے کے قریب ہمارا قافلہ واپس پیکنگ شہر میں داخل ہوا، ہماری کاروں کا رخ سرکاری مہمان خانہ کی طرف تھا کہ ہمارے وفد کے وہ ارکان جو فیکٹری سے نکلنے کی جلدی میں تھے قافلہ سے کٹ کر فرینڈ شپ سٹور میں خرید و فروخت کرنے کے انقلابی عمل میں جت گئے۔ وفد کے دوسرے اراکین مہمان خانہ میں واپس آئے اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد ساڑھے سات بجے ثقافتی شو میں جانے کیلئے تیار ہو گئے۔

ثقافتی شو

ساڑھے سات بجے وزیرِ اعظم کے علاوہ وفد کے دوسرے اراکین عظیم عوامی ہال میں پہنچے۔ ہال کی تیسری منزل پر آڈیٹوریم واقع تھا۔ وزیرِ اعظم پاکستان اور وزیرِ اعظم چین پونے آٹھ بجے کے قریب تشریف لائے ہال مہمانوں سے پہلے ہی کھچا کھچ بھرا ہوا تھا دونوں راہنما جب ہال میں داخل ہوئے تو ٹیلی ویژن کیمروں کی روشنیاں اون کر دی گئیں۔ ہال میں موجود لوگوں نے تالیاں بجا کر لیڈروں کا استقبال کیا۔ آٹھ بجے کے قریب شو شروع ہوا۔ یہ آڈیٹوریم ہال لاہور کے واپڈا آڈیٹوریم ہال سے تقریباً دوگنا بڑا تھا اور اس ہال کی طرح گول شکل کا تھا۔ مگر عمارت کی ساخت اور زیبائش بالکل مختلف تھی۔ اس ہال کے بالکل وسط میں وزیرِ اعظم بھٹو اور وزیرِ اعظم چین اور وفد کے دوسرے اراکین کی نشستیں تھیں، ان نشستوں کے دائیں بائیں معزز شہری بیٹھے تھے۔ بالکل پچھلی طرف پاکستانی وفد کے دیگر ارکان کی نشستیں تھیں۔ ہال میں بقایا نشستوں پر پیکنگ میں مقیم پاکستانی، اُن کے بچے، خواتین اور باقی سیٹوں پر چینی مزدور، سپاہی، حکام اور پارٹی کے اراکین بیٹھے تھے۔ دونوں وزراء اعظم کے بالکل سامنے بہت بڑا اسٹیج آراستہ تھا۔ سٹیج اور وزراء اعظم کے درمیان نشستوں کی سطح سے دو تین فٹ نیچے مخصوص جگہ پر آرکسٹرا بج رہا تھا۔ چاروں طرف خوبصورت روشنیاں جگمگا رہی تھیں اور ہال میں دن کا سا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ شو کے آغاز سے پہلے آرکسٹرا نے پاکستان اور چین کے قومی ترانے بجائے۔ اس کے بعد سٹیج کا پردہ اٹھا اور ایک لمبے قد کی خوبصورت شام کے لباس میں ملبوس چینی لڑکی نے شو کا افتتاح کرتے ہوئے پہلی پیشکش کا اعلان کیا۔

پہلی پیشکش

اس پیشکش کے دو حصے تھے۔

پہلے حصے میں ڈرم اور دوسرے چینی موسیقی کے آلوں پر پنگ سیاؤ وین اور سیاؤ ہیو چوان لائی کی ترتیب دی ہوئی نشاطیہ دھنیں بجائی گئیں جن کا مفہوم تھا، "چین کے غریب اور چھوٹے مالک کسانوں نے آفات ارضی وسماوی کا دلیرانہ مقابلہ کرتے ہوئے بھرپور فصلیں اگائیں"۔ اس نشاطیہ میں غریب کسانوں کی خوشی اور انقلابی جذبے کا ولولہ انگیز اظہار کیا گیا تھا

دوسری پیشکش

سب سے پہلے سازندوں نے پاکستان کے مایہ ناز شاعر مسرور انور کے مقبول نغمے "سوہنی دھرتی" کی دھنیں بجائیں، یہ دھنیں پن سیاؤ وین نے ترتیب دی تھیں اور سازندوں کی قیادت وانگ کوانگ نے کی۔

پیشکش کے پہلے حصے میں ایک گانا سنایا گیا یہ گانا یُو یَو وین نے لکھا تھا اور اس کا میوزک لُوشی چن نے ترتیب دیا تھا۔ اس کا مفہوم تھا بحریہ کے سپاہی "انقلابی چین کی بحریہ کے سپاہی اپنی سرزمین کی عظمت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے سمندر کے سفر کے دوران نہایت بہادری سے تند وتیز ہواؤں اور غضبناک سمندری لہروں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اس عظیم جدوجہد میں سب سے بڑا کارفرما جذبہ یہ ہے کہ سمندر کی مسافت طے کرنے کے بعد سپاہی اپنی مشترکہ جدوجہد کے عمل کے سلسلے میں دنیا کی دوسری مظلوم قوموں کے ساتھ اپنا رشتہ مضبوط کرنے کا اظہار کرتے ہیں۔

پیشکش کے دوسرے حصے میں ایک اور نغمہ گایا گیا جس سے فارموسا کے عوام کے لئے چینی عوام کی طرف سے اپنی دوستی اور محبت کے جذبے کا اظہار کیا گیا۔ یہ گانا یُوینگ سن اور ان کے ساتھیوں نے لکھا تھا، میوزک

چیؤ پنگ نے ترتیب دیا تھا اور گانا شی ہوانگ ای نے گایا تھا۔ جس کی سی تا چن نے معاونت کی تھی۔ اس گانے کا مطلب یہ تھا" اے تائیوان کے لوگو! تم ہمارے اپنے بھائی ہو، دن رات ہمارے دلوں میں بستے ہو، ہم عہد کر چکے ہیں کہ ایک نہ ایک دن تائیوان کو آزاد کرائیں گے اور اس جزیرے میں سورج کی کرن روشن ہوگی۔"

تیسری پیشکش

تیسری پیشکش میں ایک ڈانس پیش کیا گیا۔ اس ڈانس کے زاویے یُوچِنگ لن اور چنگ سنگ ین نے ترتیب دیے تھے۔ میوزک ہُوچنگ پن کا تھا۔ ڈانس ٹولی نے پیش کیا۔ ڈانس کا عنوان تھا" ین میں اس پیشے سے محبت کرتا ہوں"۔ یہ ایک ریستوران کے کارکن کے جذبات کا اظہار تھا۔ اس ڈانس میں ایک نوجوان اپنے کام کے قابلِ قدر جذبے اور عوام کی خدمت کا تہِ دل سے اظہار کرتا ہے۔

چوتھی پیشکش

چوتھی پیشکش میں چین کے صوبے ہُوپے شہر چنگ ینگ کے علاقائی اور مقبول نغمے گائے گئے۔ چنگ ینگ چین میں علاقائی ثقافتی اور مقبول گانوں میں شہرت رکھتا ہے اس گانے میں کامیاب فصل کے موقع پر کسان خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور فن کار دوسرے کسانوں کو زراعت کی کامیابی اور ترقی کے لیے آٹھ نکات کا پروگرام بتاتے ہیں۔ اس پیشکش کے دوسرے حصے میں ایک اور گانا گایا جاتا ہے جس کا عنوان تھا" ہم مزدور کسان اس سرزمین کے آقا ہیں" اس گانے میں لِن پیاؤ اور کنفیوشس کے اس رجعت پسند نظریہ کی مذمت کی گئی تھی جس میں یہ کہا گیا ہے کہ "کھیتی باڑی کرنے والے انسان کم تر ہیں"۔ گانے میں اس حقیقت کا اظہار کیا گیا تھا "درصل جو انسان زمین کا سینہ چیر کر لوگوں کے لیے خوراک اور دوسری اشیاء

پیدا کرتے ہیں وہ عظیم ہیں' یہ گانا چنگ یومِن اور فوشو کوانگ نے گایا تھا اور معاونت وانگ چوان ہو اور اُنکے ساتھیوں نے کی تھی

پانچویں پیشکش

پانچویں پیشکش میں نشاطیہ دُھن بجائی گئی، جس کا مفہوم تھا "فصل کے موقع پر ٹیکس ادا کرنا خوشی کا مقام ہے" اس نشاطیہ میں کمیون کے ممبران کی طرف سے مسرت کا اظہار کیا گیا تھا کہ "جب فصل زیادہ ہو تو اسمیں سے ایک حصّہ ٹیکس کی شکل میں خوشی کے ساتھ ادا کرنا چاہیئے"۔ یہ دُھن کُوڈُو سِنگ اور منِگ چِن چِن نے ترتیب دی تھی اور چِنگ چِن ہُو نے بجائی تھی، جس کی یُوآن لی نے معاونت کی تھی۔

چھٹی پیشکش

چھٹی پیشکش کے دو حصّے تھے۔ پہلے حصّے میں ایک گانا گایا گیا۔ جس کا عنوان تھا "پارٹی چشمے کے تر و تازہ پانی کی طرح اور میں ابھرتی ہوئی کلی کیطرح ہوں"۔ یہ گانا ہیوُسِی شِنگ نے لکھا تھا اور میوزک ہُوتا سِنگ نے ترتیب دیا تھا اس گانے کے بول یہ تھے "پارٹی ایک تر و تازہ پانی کے چشمے کی طرح ہے اور میں ایک اُبھرتی ہوئی کلی ہوں"میں زمین میں اپنی جڑیں اس طرح مضبوط کروں گی جس طرح ایک جھاڑی زمین میں اپنے پنجے گاڑھے ہوئے ہوتی ہے۔ غریب اور درمیانے طبقے کے کسان مجھ پر اپنی ڈھیروں محبت اس طرح نچھاور کرتے ہیں جیسے صبح کے وقت سورج نکلتے وقت شبنم کے موتی کلیوں پر قربان ہو جاتے ہیں میں اپنی تمام زندگی دیہات میں گزار دوں گی اور وہاں میرا انقلابی شباب پوری عظمت کے ساتھ جگمگائے گا"۔ اس کے دوسرے حصّے میں ایک اور گانا گایا گیا جس کے الفاظ سَن ہینگ نے لکھے تھے اور میوزک سِی سے لی نے ترتیب دیا تھا۔

اس کا عنوان تھا "تنگ کینگ کی پہاڑیوں پر نئے گیت چمکیں گے اور آنے والا زمانہ اس سے بھی زیادہ خوش آئند ہے۔ سرخ پرچم ہماری اور بھی اونچی چوٹیوں کو سر کرنے کی راہنمائی کر رہا ہے جن کی طرف چیئرمین ماؤ کی قیادت میں ہم بڑھ رہے ہیں۔" یہ گانا کی چن نے گایا تھا۔ کوہنگ ہوا اور ان کے ساتھیوں نے معاونت کی تھی۔

ساتویں پیشکش

ساتویں پیشکش میں ایک ریلوے گارڈ نے ڈانس پیش کیا اس ڈانس میں ریلوے ٹریک پر کام کرنے والے ایک مزدور کی جرأت اور چستی دکھائی گئی ڈانس کی کہانی یوں ہے۔ "ایک ملک دشمن اور سامراجی ایجنٹ ریلوے کی پٹڑی کو اکھاڑ کر گاڑی کو حادثہ سے دوچار کرنے کی سازش کرتا ہے مگر نوجوان مزدور بروقت وطن دشمن اور سامراجی ایجنٹ کا سراغ لگا لیتا ہے اور اس کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔ ریلوے کی پٹڑی اکھاڑی جا چکی ہوتی ہے مگر بہادر کارکن، عوام دشمن ڈاکو کو مار بھگانے کے بعد اکھڑی ہوئی پٹڑی کو اپنے دوسرے ساتھیوں کی امداد سے جوڑ دیتا ہے اور پیچھے سے آنے والی گاڑی بالکل محفوظ طریقے سے گزر جاتی ہے۔" اس پیشکش میں ڈانس چیاؤ پیاؤ لنگ، کواؤ تنگ چو اور تائی ہنگ تے نے کیا۔ زاویے چن چیئن من، ہن وی اور وُو ینگ نے ترتیب دیئے تھے۔ میوزک لیاؤ ژن چُو کا تھا، یہ ڈانس خوبصورتی سے پیش کیا گیا اس کے اختتام پر درمیانی وقفہ ہوا ہال میں کچھ ہل چل ہوئی میں نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی تو معلوم ہوا کہ وزیرِ اعظم پاکستان اور وزیرِ اعظم چین ہال سے باہر تشریف لے جا رہے ہیں۔ درمیانی وقفہ میں دوست ہال سے باہر تشریف لائے اور بڑے کمرے میں چائے پینے کے لیے گئے تو معلوم ہوا کہ وزیرِ اعظم بھٹو صاحب اور بیگم بھٹو اور مسٹر عزیز احمد وزیرِ اعظم چین کے ہمراہ چیئرمین ماؤ زے تنگ کے ساتھ ملاقات کرنے جا رہے ہیں۔ جب میں



پیکنگ کے عظیم ثقافتی ہال میں ضیافت کے شروع ہونے سے قبل پاکستانی وفد کے اراکین اور چینی رہنماؤں کا گروپ فوٹو۔ شیخ رشید کے عقب میں تاج محمد لنگاہ کھڑے ہیں۔

پاکستان سے چین کے دورے پر روانہ ہوا تھا تو میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ چیئرمین ماؤ سے ملاقات کا شرف حاصل ہو۔ ۱۹۷۴ء میں وزیرِ اعظم کی قیادت میں جو وفد چین گیا تھا ان کے سیاسی اراکین کی ملاقات چیئرمین ماؤ سے کرائی گئی تھی مگر اس دفعہ ان کی مصروفیات کی وجہ سے ہم ایشیا کے عظیم راہنما اور دنیا بھر کی مظلوم قوموں کے ہمدرد ساتھی ماؤ سے نہ مل سکے اور یہ حسرت دل میں رہ گئی۔ وقفہ کے دوران چائے کی میز پر میرے ساتھ راؤ ارشاد کے علاوہ ایئر مارشل نور خان تشریف رکھتے تھے۔ انھوں نے پہلی مرتبہ ۱۹۵۴ء میں چین کا دورہ کیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ اس زمانہ میں پیکنگ کا ہوائی اڈہ بالکل معمولی سا تھا اور پیکنگ ہوائی اڈہ سے شہر تک کا راستہ بالکل ویران اور بیاباں کی طرح تھا۔ پیکنگ کی آب وہوا بھی ان دنوں میں بہت گرم مرطوب ہوتی تھی اور یہاں آندھیاں چلتی تھیں اور گرد وغبار اکثر و بیشتر چھایا رہتا تھا۔ بعد میں پیکنگ شہر اس کے مضافات اور پورے ملک میں کروڑوں کی تعداد میں نئے درخت لگائے گئے جس سے ملک کا نقشہ ہی بدل گیا۔ اور آب وہوا بھی یکسر بدل گئی یہ ساری ترقی چیئرمین ماؤ اور مسٹر چو این لائی کی ذاتی کوشش کی مرہونِ منت ہے۔ مسٹر چو این لائی خود ملک کے دور دراز علاقوں میں جاکر درخت اگانے کی مہم تیز کرنے کی ہدایت دیتے تھے اور خود بھی اپنے ہاتھ سے درخت اگاتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پاکستان کی حکومت چین سے فضائی رابطہ اور دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی خواہاں تھی جب کہ سابقہ حکومتوں نے دوستی اور تعاون کے بہت سے مواقع کھو دیئے تھے۔ ریٹائرڈ ائیر مارشل حالیہ چیئرمین پی آئی اے نور خان نے ہمیں بتایا کہ چونکہ ہوائی فوج کے اعلیٰ افسر کی حیثیت سے وہ تقریباً بیس سال سے چین آتے جاتے رہے ہیں اور ان کے راہنماؤں سے ذاتی مراسم ہیں اور پاک چین دوستی کو مستحکم بنانے میں انہوں نے بھی چندے خدمات انجام دی ہیں۔

وقفہ کے اختتام پر ہم دوبارہ ہال میں واپس آئے جب سارے مہمان اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو سب سے آخر میں پاکستان کے وزیرِ زراعت اور کسان راہنما شیخ محمد رشید جن کے ساتھ چین کے وزیرِ زراعت تھے۔ وزیرِ اعظم بھٹو کی غیر موجودگی میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ ہال میں تالیاں بجیں اور چند لمحوں کے بعد ایک مرتبہ پھر آرکسٹرا اپنی دھنیں بکھیرنے لگا اور باقاعدہ ثقافتی شو شروع ہوا۔

آٹھویں پیشکش

آٹھویں پیشکش میں میوزک پر چین کے سن کنگ صوبے کے علاقہ تِن شان کی پہاڑیوں پر موسمِ بہار کی کیفیت بیان کی گئی اس کیفیت کا مفہوم یہ تھا: "سوشلسٹ سن کنگ صوبہ میں تِن شان کی پہاڑیوں پر خوشحالی کی وجہ سے خوشیوں اور کامرانیوں کا گل گوں غازہ بکھرا ہوا تھا اس میوزک کو عثمان جان اور یُوچن یی نے ترتیب دیا تھا اس کو وانگ کائی تائی نے پیش کیا تھا اس کے دوسرے حصے میں ایک پاکستانی نشاطیہ "ہمارا پاکستان" پیش کیا گیا اس کے بول تنگ لِنگ ہِنگ نے اردو میں گائے تھے۔ اس نشاطیہ کے دوران تمام حاضرین پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور سب لوگ گانے والے کے ساتھ گنگنانے لگے۔ اور عجیب کیف پرور سماں بندھ گیا تھا۔ اس وقت مجھے پھر کوریا کی طرح احساس ہوا کہ ہم اپنی ثقافت سے کتنی دور ہٹ گئے ہیں اور ہمارے دوست ممالک میں پاکستانی ثقافت کی توانا جھلکیاں موجود ہیں۔ جب تنگ لِنگ ہِنگ پاکستان کا نشاطیہ گا کر سٹیج سے چلی گئی تو زندہ دل پاکستانی افراد کے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ ہال میں "دوبارہ دوبارہ" کی صدائیں گونجنے لگیں مگر چینی روایت کے مطابق یہ شو دوبارہ نہ دکھایا گیا۔

نویں پیشکش

نویں پیشکش کا آغاز ہوا۔ اس کے پہلے حصّے کا عنوان "دریاؤں میں سے بڑے بڑے تنے بہا کر لانے والے ملاّحوں کا گیت" تھا۔ اس میں ملاّح جو نہایت جفاکش تھے۔ دریاؤں میں سے دیار کے بڑے بڑے درختوں کے تنے پہاڑوں سے کاٹ کر دریاؤں میں سے بہا کر میدان میں لاتے ہیں۔ ان کی زندگی اور مشکلات بیان کی جاتی ہیں۔ یہ گیت ھُوکِی اور اس کے ساتھیوں نے نہایت خوبصورت انداز میں گایا۔ میوزک چِنگ "تان چِنگ نے ترتیب دیا تھا۔ اس کے دوسرے حصّے میں ایک گانا گایا گیا۔ جس کا عنوان تھا" ہم آج ایک خوشی کا گیت گائیں گے" اس سے ایک غریب بوڑھا کسان جو انقلاب سے پہلے کے زمانے میں ظلم و ستم اور بدحالی کا شکار تھا۔ آج کے خوشحال چین میں پُر مسرّت زندگی گزارنے کا اظہار کرتا ہے۔ اس گیت کو لیوجِن چِی نے گایا اور چِنگ لُوفان نے معاونت کی۔ میوزک لیاڈ چِنگ وِی نے دیا تھا۔ اس گیت کے بول مختلف لوگوں نے اجتماعی طور پر ترتیب دیئے تھے۔

دسویں پیشکش

دسویں پیشکش کا صرف ایک حصّہ تھا۔ اس میں ایک لڑکی نے ایک گیت گایا جس کا عنوان تھا" وِین چِی کی ہان میں واپسی" اس گیت کا پس منظر یُوں تھا۔ تیسری صدی کے اوائل میں ہان خاندان کے دور کے اختتام پر لیڈی سائی وِین چِی کو چین کے اقلیتی قومیتوں کے ایک "ہنز" علاقے سے جو کہ جنوب میں واقع تھا۔ ایک فرد نے اغوا کر لیا۔ بعد میں شہنشاہ وُو نے اس کو بھاری قیمت ادا کر کے آزاد کرایا تاکہ لیڈی سائی وِین چِی اپنے مورّخ باپ سائی یَنگ جو مر چکے تھے، کی معروف تاریخ کی ادھوری کتاب کو مکمل کر سکے۔ اس پیشکش میں لیڈی وِین چِی، ہان کے علاقے میں واپس آجاتی ہے اور سائی یَنگ کی قبر پر جا کر غم و مسرّت کے ملے جُلے احساسات کا اظہار کرتی ہے۔ اور اپنے ماضی کے زمانے کی یادوں پر غور کرتی ہے۔ یہ گیت محترمہ سیانگ زُوہُوا

نے گایا اور ینگ سائی سن اور ان کے ساتھیوں نے میوزک میں معاونت کی تھی۔

گیارھویں پیشکش

گیارہویں پیشکش میں ایک گیت گایا جاتا ہے۔ جس کا عنوان تھا "ہمارے گیت کبھی بھی مکمل طور پر چیئرمین ماؤ کے احسانات کو خود میں سمو نہیں سکتے" یہ ایک علاقائی گیت تھا اور اس میں لن کینگ کی قومیت کی جانب سے چیئرمین ماؤ کے لئے بے پناہ محبت اور جذبے کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس پیشکش کے دوسرے حصے میں "خالی" علاقے کا ایک علاقائی گیت جس میں عوامی فوج کے اپنی سرزمین کا دفاع کرنے اور اس ملک کی تعمیر میں قابلِ قدر خدمات سرانجام دینے کو سراہا گیا تھا۔ یہ گیت ایک لڑکی گوُلی نے گایا۔ اس کی معاونت لیائی پنگ ون اور ان کے ساتھیوں نے کی تھی۔

بارھویں پیشکش

بارھویں پیشکش میں پیانو کی ایک دُھن بجائی گئی جس کا عنون "سمندری طوفانوں کا مقابلہ" تھا۔ اس میں جدید چین کی بندرگاہ پہ کام کرنے والے مزدوروں کی جرائت اور نیک کردار کا مظاہرہ کیا گیا۔ منظر ملاحظہ ہو "سمندر کا ساحل ایسا غضبناک محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ہم ساحلِ سمندر پہ کھڑے ہیں اور غضبناک سمندری لہریں بپھرتی ہوئی چلی آرہی ہیں اور ہم اس کی لپیٹ میں آ گئے ہیں۔

یہ پیشکش مجھے بہت پسند آئی اور اس کو پیش کرنے والے نے حقیقتاً اپنی تمام فنکارانہ صلاحیتوں سے کام لیا۔ پیانو بجانے والے چین کے بین الاقوامی شہرت یافتہ پیانو نواز سیاؤ شی ہی کن تھے۔ جس کے لئے سُر وانگ چنگ یُن نے بنائے تھے اور ترتیب پیانو نواز کواؤ چی ہی ہنگ نے دی تھی۔

تیرھویں پیشکش

تیرھویں اور ثقافتی شو کی آخری پیشکش نہایت مسحور کن، دلچسپ اور زبردست انقلابی تھی۔ اس کا ایک حصہ جس میں قدیم چین کی انسانوں کو اذیت دینے والی ہلاکت خیز چھڑیوں کو ہاتھ میں لئے، دو درجن کے قریب لڑکوں نے ڈانس پیش کیا۔ اس کا عنوان تھا "اس ہلاکت خیز چھڑی کو چھوڑ دو" اس ڈانس کا مفہوم یہ تھا کہ "قدیم چین کے ظلم و جبر کی چھڑیاں سوشلسٹ انقلاب کے بعد توڑ دی گئی ہیں اور غریب کسان کئی سال کی مسلسل کامیاب اور بھرپور فصل اگانے کے بعد مسرور ہیں اور اب بے پناہ خوشیاں محسوس کرتے ہیں" اس ڈانس کے زاویے ہوتاپن، ٹوچنگ ینگ اور ان کے ساتھیوں نے بنائے تھے۔ میوزک میاؤ شن یی نے ترتیب دیا تھا ڈانس کرنے والے سنگ تو بی اور ان کے ساتھی تھے۔ ڈانس کے کنڈکٹر چو سن این تھے۔ اس ڈانس میں نوجوان لڑکوں نے نہایت خوبصورت سرخ اور سفید لباس پہنے ہوئے پھرتی سے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ جب شو کا اختتام ہوا تو حاضرین نے تالیاں بجا کر فنکاروں کو داد دی۔ ثقافتی شو کی تیرہ پیشکشوں میں حصہ لینے والے تمام فنکار لڑکے اور لڑکیاں سٹیج پر جمع ہو گئے اور جھک کر حاضرین کی داد کا شکریہ ادا کیا۔ ساڑھے دس بجے کے قریب شو ختم ہوا اور مہمان ہال سے نکل کر باہر آئے اور اپنی کاروں میں بیٹھ کر مہمان خانے میں واپس آ گئے۔ ہم تمام دوستوں کے پیٹ بالکل خالی تھے اور محمد بخش مجاہد تو غالباً بھوک سے نڈھال ہو چلے تھے۔ گیارہ بجے کے قریب ہم سب دوست مہمان خانہ کے کھانے کے کمرے میں گئے ہم جس میز پر بیٹھے تھے وہاں شیخ محمد رشید اور مسٹر نسیم احمد سیکرٹری اطلاعات پاکستان بھی تشریف فرما تھے۔ ہم نے کافی دیر تک انقلابی شو پر باتیں کیں۔ میں نے

شیخ صاحب سے مسٹر نسیم احمد کے سیکریٹری اطلاعات بننے سے پہلے بین الاقوامی سطح پر صحافت میں شہرت حاصل کرنے کا ذکر کیا۔ مسٹر نسیم احمد نے بتایا کہ تقریباً گیارہ سال قبل جب ایوب خان نے چین کا دورہ کیا تو انہوں نے بھی نجی حیثیت سے اس دورے میں شمولیت کی تھی اور ۱۹۶۶ء میں جب ایوب خان کی ٹیم روس گئی اور شاستری ایوب مذاکرات کے نتیجے میں معاہدہ تاشقند ہوا تو نسیم احمد صاحب نے پاکستان کے عوام کے مؤقف کی زبردست حمایت کی تھی۔ یہ گپ شپ جاری تھی کہ ڈائننگ ہال میں مسٹر اور بیگم پیرزادہ داخل ہوئے اور وہ اسی میز پر آ کر بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھتے گفتگو کا موضوع بدل گیا اور ذرا زبان کا ذائقہ بدلتے ہوئے ہم نے فیشن پر تبصرے شروع کر دیئے۔ کھانے کے ساتھ فیشن پر تبصرے دوہرا لطف پیدا کر رہے تھے۔ انہی خوش گپیوں میں ہم کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلے گئے۔ یہ تو قارئین کو یاد ہو گا کہ چین میں میرے ساتھ انقلابی دوست مسٹر محمد بخش مجاہد ٹھہرے ہوئے تھے میرا خیال تھا کہ ان سے ثقافتی شو کے بارے میں کوئی بات چیت کی جائے مگر رات زیادہ گزر چکی تھی اس لیے ان کے گراں قدر خیالات نہ سن سکا اور بستر پر لیٹتے ہی نیند کے مزے لینے لگا۔

۲۸ جون ۱۹۷۶ء

حسبِ معمول محمد بخش مجاہد صاحب نے صبح اٹھنے کے بعد نماز ادا کی اور پھر سورۂ یٰسین کا ٹیپ چلا دیا اور خود سورۂ یٰسین کی تلاوت میں منہمک ہو گئے۔ میری بھی آنکھ کھل گئی اور ہاتھ منہ دھو کر مجاہد صاحب کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے صبح کی سیر کرنے ان کے ساتھ باہر چلا گیا۔ میں نے شلوار قمیض اور سلیپر پہنے ہوئے تھے۔ مہمان خانے کے دروازے پر موجود سنتری نے ٹبے

غور سے مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھا اور اپنے ساتھی کو اشارہ کیا کہ وہ میری مناسب راہبری کرے۔ میں نے اشارے سے جواب دیا کہ مہربانی میں صرف سیر کرنے کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ اس وقت صبح کے ساڑھے چھ بجے تھے۔ تقریباً سات بجے تک ہم سڑک پر دور تک گھومتے پھرتے رہے۔ اس دوران ہم نے دیکھا کہ سڑک کے دونوں طرف سینکڑوں کی تعداد میں چینی محنت کش پیدل، سائیکلوں اور بسوں پر معمول کے مطابق اپنے اپنے کام کاج پر جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار مائیں اپنے چھوٹے بچوں کے ہاتھ پکڑے سیر کرا رہی تھیں اور بہت سی اپنے بچوں کو اسکول چھوڑنے جا رہی تھیں۔ یہ سڑک بہت کشادہ تھی۔ دونوں طرف تقریباً کھلا سبزہ زار تھا۔ جہاں رہائش رکھنے والے سیر وغیرہ کر رہے تھے۔ اس قطعۂ زمین پر نئے درخت اور پھول لہلہا رہے تھے اور کیاریوں میں مزید پھول اگانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ چونکہ پیکنگ میں بارش نسبتاً کم ہوتی ہے۔ اس لیے گھاس لگانے کا کام زیادہ تیز رفتاری سے نہیں ہوتا۔ تاہم پانی کی کمی چھوٹی چھوٹی نالیوں سے پوری کر لی جاتی ہے۔ یہاں بھی ایسی نالیاں بنی ہوئی تھیں ان کے ذریعے درختوں اور پھولوں کی کیاریوں کو سیراب کیا جا رہا تھا۔ یہاں ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا جو نہایت خوبصورت تھا۔ سڑک کے دونوں طرف صفائی کا یہ عالم تھا کہ کہیں ایک تنکا بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا اور نہ گرد و غبار ہی نظر آتا تھا۔ یہاں بھی کوریا کی طرح سڑک پر بسوں کے علاوہ کوئی بھاری ٹریفک نہیں تھا۔ چین کے شہری علاقوں میں ریڑھے، تانگے اور گدھا گاڑیاں تو کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آئیں اور نہ چین میں ان سے شہری علاقوں میں کام لیا جاتا ہے۔ البتہ چین میں قیام کے دوران ایک دو دیہات میں دو اور

دو سے زائد گھوڑوں والی گاڑیاں ہمارے ضرور دیکھنے میں آئیں جو بار برداری کے لیے استعمال میں لائی جاتی ہیں۔ وہاں کسی جگہ ہمارے علاقوں کی طرح تانگے اور بیل گاڑیاں نہیں ہیں۔ ایک جگہ ایسی گاڑیاں بھی ہمارے دیکھنے میں آئیں جسے بھینسے کھینچ رہے تھے۔ یہ گاڑی بہت بڑی تھی۔ اسے بھی بار برداری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے پیکنگ شہر اور اس کے گردونواح میں سائیکل کے تین پہیوں سے چلنے والی ریڑھی نما گاڑیاں اکثر دیکھنے میں آئیں۔ یہ گاڑی پاکستان کے شہر کراچی میں چلنے والی گدھا گاڑی سے مشابہ تھی۔ اس گاڑی میں سائیکل کا ایک بڑا پہیہ آگے ہوتا ہے درمیان میں ڈرائیور کی سیٹ ہے اس کے بعد لمبے لمبے تختے ہیں۔ پیچھے بائیسکل کے دو پہیے ہیں۔ یہ گاڑی دیکھنے میں خوبصورت ہے اور پائیدار بھی۔ چین میں اس گاڑی سے ہمارے یہاں کی بیل گاڑیوں کی طرح کام لیتے ہیں۔ ایک جگہ میں نے دیکھا کہ ایسی بائیسکل پر ایک شخص اپنی بوڑھی ماں کو بٹھا کر سیر کروا رہا تھا۔ ایسے مناظر اکثر دیکھنے میں آتے رہے اور یہ ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ چین کے نظام کے مخالفین جو یہ کہتے ہیں کہ انسانی جذبات واحساسات اور رشتوں کی قدریں پامال کر دی گئی ہیں، ان کی تشفی کے لیے ایسے واقعات کافی ہیں۔ بہر صورت ہم جب سڑک پر گھوم پھر رہے تھے تو ایسے بہت سے دل افروز مناظر روح کو تازہ کرتے رہے۔ ایک اور بات جس نے سب سے زیادہ ہمیں متاثر کیا وہ یہ تھی کہ سڑک پر آتے جاتے چینی عوام جب ہمیں دیکھتے تو فرطِ جذبات میں ہاتھ ہلا کہ خوش آمدید کہتے ان کے چہروں پر مسکراہٹوں کی لکیریں پھیل جاتیں اور جب ان کے اس بھائی چارے اور گہرے جذبات سے متاثر ہو کر ہم ان کی جانب دیکھتے تو ہماری اور چینی عوام کی مسکراہٹیں پھولوں کی مہک کی طرح فضا میں پھیل جاتیں۔ ہم یوں

محسوس کر رہے تھے کہ اپنے ہمدرد اور شفیق بھائیوں میں آ گئے ہیں اور چینی عوام کو ہم سے بے پناہ محبت ہے۔ چینیوں کا یہ خلوص، پاکستانیوں کے بارے میں اپنائیت کا اظہار ناقابلِ فراموش تھا۔ میں اور محمد بخش مجاہد ساڑھے سات بجے مہمان خانہ میں واپس آئے۔ کپڑے بدلے اور ناشتہ کے لیے کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ آٹھ بجے ناشتہ کر کے کمرے میں واپس آتے تو ہمارے گائیڈ مسٹر چُو نے پروگرام کے مطابق دیوارِ چین جانے کی خوشخبری سنائی۔ اسی اثنا میں نیوز بلیٹن اور پیپلز ڈیلی کے شمارے ہمارے کمرے میں پہنچ گئے۔ میں نے گائیڈ کی وساطت سے پیپلز ڈیلی کی اہم خبروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں تو انہوں نے بتایا کہ گذشتہ رات چیئرمین اور وزیرِ اعظم بھٹو کی ملاقات کی خبر پیپلز ڈیلی میں شہ سرخیوں کے ساتھ چھپی ہے۔ متن یہ تھا کہ "مسٹر بھٹو وزیرِ اعظم پاکستان اور بیگم نصرت بھٹو نے چیئرمین ماؤ کے ساتھ گذشتہ رات ملاقات کی ان کے ساتھ مسٹر عزیز احمد بھی موجود تھے۔ جب وزیرِ اعظم بھٹو ہال کے دروازے پر پہنچے تو چیئرمین ماؤ نے ان سے مصافحہ کیا اور پاکستانی معزز مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ بعد میں چیئرمین ماؤ نے دوستانہ اور خوشگوار ماحول میں بھٹو صاحب اور مسٹر عزیز احمد سے گفت و شنید کی اور پاکستان کے عوام کی خوشحالی اور ترقی کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ اس ملاقات میں چین کے وزیرِ اعظم ہوا کوفنگ بھی موجود تھے۔" پیپلز ڈیلی کے صفحۂ اول پہ درمیان میں چیئرمین ماؤ اور وزیرِ اعظم بھٹو کی تصاویر بھی شائع کی گئی تھیں۔ پیپلز ڈیلی میں اور بیشمار ملکی اور بین الاقوامی خبروں کے علاوہ گذشتہ روز پاکستانی وفد کے یونیورسٹی کے دورے اور ثقافتی شو دیکھنے کی خبر بھی شائع ہوئی تھی۔ اس سے فارغ ہوئے تو ہمارا قافلہ سوا آٹھ بجے دیوارِ چین دیکھنے کے لیے روانہ ہوا۔

دیوارِ چین

دیوارِ چین پیکنگ سے ۶۰ کلومیٹر تقریباً ۴۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ فاصلہ طے کرنے میں ڈیڑھ گھنٹہ لگا۔ راستے میں چین کے دیہی علاقوں کو دیکھنے کا اتفاق ہُوا۔ چونکہ چین میں سردیوں میں برفباری عام ہوتی ہے اس لیے گندم کی فصل ہماری نسبت دیر سے پکتی ہے۔ ہم دیہی علاقوں سے گزر رہے تھے تو گندم کے کھیت لہلہا رہے تھے مگر ابھی تک ان کے سٹے سبز تھے۔ جبکہ پاکستان میں گندم مکمل طور پر پک چکی تھی اور کئی علاقوں میں گندم کاٹ کر کھلیانوں میں محفوظ بھی کر لی گئی تھی۔ گندم کے کھیت نہایت ترتیب اور خوبصورتی سے لگائے گئے تھے اور پانی کے کھالوں کے کنارے اور کھیتوں کی مٹی کی باڑوں پر مختلف قسم کے تازہ درخت اگائے گئے تھے۔ کوئی کھیت درختوں سے خالی نظر نہیں آتا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جو ہائی سکول سے فارغ ہونے کے بعد داخلہ کے خواہش مند تھے، کھیت اور فیکٹری میں ٹریننگ کے لازمی وقفہ میں کھیت میں امداد کیلئے آئے ہوئے تھے اور کام کرنے میں مصروف تھے۔ سڑک کے دونوں طرف بے شمار ٹریکٹر ٹرالیاں، گھوڑا گاڑیاں، گدھا گاڑیاں، بائیسکل اور تین پہیوں والی سائیکل کی گاڑیاں زرعی پیداوار کی اشیاء کی نقل و حمل کے سلسلہ میں اِدھر اُدھر آجا رہی تھیں۔ اِن ٹریکٹر اور ٹرالیوں میں ایک درمیانی درجے کی ٹرالی نے ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ اس ٹرالی کا درمیانی ٹریکٹر کے سائز کا انجن تھا۔ اس کے کُل چار پہیے تھے۔ ہمارے یہاں عام طور پر چار پہیوں والے ٹریکٹر کے پیچھے دو پہیوں والی ٹرالی لگائی جاتی ہے لیکن چین میں ایسی ٹرالی بنائی گئی ہے جس میں دو پہیوں کی بچت کی گئی ہے۔ جو دیہات میں کام کرنے کے لیے نہایت سود مند ہے۔ جن دیہی

علاقوں سے ہم گزر رہے تھے۔ وہاں چھوٹی بڑی نہریں پانی کی گزرگاہیں اور پانی کی چھوٹی بڑی مصنوعی جھیلیں بھی نظر آ رہی تھیں، ان جھیلوں میں پانی کا ذخیرہ کیا گیا تھا اور اکثر میں مچھلیاں بھی پالی گئی تھیں۔ جس سڑک سے ہم گزر رہے تھے۔ وہ پیکنگ میونسپل کمیٹی کی امداد سے دیہی عوام کی اپنی مدد آپ کی بنیاد پر تیار کی گئی تھی۔ یہ سڑک تعمیری معیار، کشادگی اور صفائی کے لحاظ سے کسی بھی جی ٹی روڈ سے کم نہیں تھی۔ تقریباً آدھا سفر طے ہوا ہوگا کہ ہمارا قافلہ پہاڑی علاقے میں داخل ہو گیا۔ جہاں سے دیوارِ چین صاف نظر آ رہی تھی۔ کوئی دو ہزار فٹ کی چڑھائی کے بعد ہم ایسے مقام پر پہنچے جہاں سڑک دیوارِ چین کو عبور کرتی ہے یعنی یہ سڑک دیوارِ چین کے نیچے سے گزرتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے۔ یہاں ہمارا قافلہ رک گیا۔ قافلہ اس جگہ رکا تھا جہاں پر دیوارِ چین کے ایک حصے کو سیاحوں، چینی عوام اور مہمانوں کے لیے محفوظ رکھا ہوا تھا۔ یہ مرمت وغیرہ کرنے کے بعد اصلی حالت میں موجود ہے۔ دیوارِ چین جیسا کہ ساری دنیا جانتی ہے قدیم چین کے فنِ تعمیر کے کمالات کا عظیم ترین نمونہ ہے۔ یہ دیوار دنیا بھر کے سات عجائبات میں سے ایک ہے۔ جن میں سے ایک تاج محل اور دوسرا اہرامِ مصر ہیں۔

دیوارِ چین چار پانچ سو سال قبل مسیح میں ریاستوں کے حکمرانوں نے اپنی سرحدوں کو بیرونی حکمرانوں کے حملوں سے محفوظ کرنے کے لیے خاص طور پر مشرقی علاقوں کے ہُنز خاندان کے حملوں سے بچاؤ کی خاطر دفاعی نقطۂ نظر سے تعمیر کی۔ تیسری صدی قبل مسیح میں جب چِن خاندان کے پہلے شہنشاہ نے چین کی مختلف ریاستوں کو اپنے زیرِ نگیں کر لیا اور چین کو متحد کیا تو ان کی علیحدہ علیحدہ تعمیر شدہ دفاعی دیواروں کو ایک عظیم دیوار میں تبدیل کر دیا گیا۔ تاکہ اگر مشرقی علاقوں کے ہُنز حکمران حملہ آور ہو جائیں تو چین کا دفاع کیا جا سکے۔ بعد کے آنے والے حکمرانوں نے اس

دیوار کی مضبوطی اور مرمت میں گہری دلچسپی لی۔ جس دیوار کے حصے کو ہم دیکھنے گئے تھے۔ اس کو پاٹلنگ سیکشن کہتے ہیں۔ اس حصے کو مینگ خاندان کے زمانہ میں سابقہ بنیادوں پر عظیم دیوارِ چین کے ساتھ ملحق کر دیا گیا تھا۔ یوں تو یہ حصہ بھی کافی ٹوٹ چکا تھا مگر انقلاب کے بعد اس کی مرمت کر دی گئی تھی تاکہ چین کے قدیم ورثے کی حفاظت ہو سکے۔ دیوارِ چین مشرق میں شن ہائی کوآن علاقہ سے مغرب میں چیاؤ کوآن کے علاقہ تک پھیلی ہوئی ہے اس کی کم سے کم لمبائی چھ ہزار کلومیٹر تقریباً چار ہزار میل ہے اور اس کی اوسط اونچائی سات میٹر یعنی تقریباً ۲۲ فٹ اور چوڑائی ۵ ½ میٹر یعنی تقریباً ۱۶ فٹ ہے زیادہ سے زیادہ اونچائی چالیس میٹر یعنی تقریباً ۱۲۳ فٹ اور چوڑائی ۷ کلومیٹر یعنی تقریباً ۲۱ فٹ ہے۔ اس دیوار پر تین سو گز کے فاصلے پہ دو منزلہ چھوٹے چھوٹے فوجی قلعے بنے ہوئے ہیں۔ ان قلعوں میں رہائش کے علاوہ فوجی سامان اور نجی استعمال کے سامان کو سٹور کرنے کی مکمل سہولتیں موجود ہیں اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مورچے بنے ہوئے ہیں۔ یہ دیوار مشرقی چین کے آٹھ سے زیادہ صوبوں سے گزرتی ہے جس حصے کو ہم دیکھنے گئے وہ چین کے بیرونی علاقے کی طرف جانے کے مشہور و معروف درہ پر واقع ہے۔ انقلاب کے بعد اس حصے کو اپنی پرانی شان و شوکت کے مطابق مرمت کر دیا گیا تھا۔ دیوار خالصتاً پتھر سے بنائی گئی ہے۔ قدیم زمانہ جب کہ سائنس اور ٹکنالوجی کا وجود تک نہیں تھا۔ ایسی عظیم دیوار بنا دینا یقیناً حیرت انگیز کارنامہ ہے سیمنٹ بہت بعد کی ایجاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیوار میں پتھر جوڑنے کا کام چاول کے گارے سے لیا گیا جو بلا شبہ چینیوں کا ہی حصہ ہے اس دیوار کے بعض حصے جرنیلی سڑکوں کی طرح چوڑے ہیں اور بغیر روک ٹوک کے دو بڑی گاڑیاں برابر سے گزر سکتی ہیں۔

دیوار کی سطح پہاڑ کی ڈھلوان کی مانند ہے۔ مگر اس کے کنارے کئی فٹ اونچے ہیں ہم گھومتے پھرتے دیوار سے ایک پہاڑی کے اس کونے تک پہنچ گئے جہاں سے آگے دیوار ٹوٹی ہوئی تھی اور اس پر چلنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ پھر ہم یہاں سے واپس ہو لیے۔ جب ہم گھوم پھر رہے تھے تو وہاں سینکڑوں چینی عوام اور غیر ملکی سیاح بھی اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ چینی خواتین بھی دیوارِ چین دیکھنے آئی ہوئی تھیں اور ان کے ساتھ چھوٹے بچے بھی تھے۔ جاپان کے سیاح بھاری تعداد میں یہاں آئے ہوئے تھے جن میں اکثریت نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی تھی۔ مغربی ممالک کے سیاح بھی گھوم پھر رہے تھے اور بڑے شوق سے دیوارِ چین اور اس کے گرد و نواح کے خوبصورت مناظر کی تصاویر لے رہے تھے۔ ہمارے ساتھ شامل پی آئی اے کی تین خوبصورت ہوسٹسیں بھی یہاں آئی ہوئی تھیں یہ دوشیزائیں سب سے پُرکشش اور خوبصورت لباس میں ملبوس تھیں اور سب سے الگ تھلگ لگتی تھیں یہی وجہ تھی کہ سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ ہمارے وفد کے اراکین کے علاوہ دوسرے سیاحوں نے بھی ان لڑکیوں کے ساتھ تصاویر کھنچوائیں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ اوپر نیچے گھومنے کے بعد ہم دیوارِ چین سے اتر کر اپنی گاڑیوں میں آ کر بیٹھ گئے اور واپسی سفر اختیار کیا۔ واپس آتے ہوئے دیوارِ چین اور پیکنگ کے عین وسط میں ہمارا قافلہ تِنگ لِنگ کے عجائب گھر کے قریب جا کر رُکا۔

تِنگ لِنگ کا عجائب گھر

پیکنگ سے شمال مغرب کی طرف تقریباً پچاس کلومیٹر یعنی ۳۰ میل کے فاصلے پر تِنگ لِنگ کا عجائب گھر ہے۔ اِن کو شِشان لِنگ" یعنی تیرہ مقبرے بھی کہتے ہیں۔ یہ مقبرے مِنگ خاندان کے تیرہ شہنشاہوں کے ہیں۔

جنھوں نے ۱۳۶۸ء سے ۱۶۴۴ء تک حکومت کی۔ ٹنگ لنگ کا مقبرہ دسویں شہنشاہ چُوپی چن اور اس کی دو ملکاؤں کا ہے۔ اس نے ۱۵۷۳ء سے ۱۶۲۰ء تک چین پر حکومت کی۔ ۱۹۵۶ء سے پہلے یہاں ایک مقبرہ نما عمارت تھی اور آثارِ قدیمہ کے محکمہ نے اس مقبرے کی مرمت کا کام شروع کیا تو ایک جگہ تیر کا نشان ملا جس سے اندازہ لگایا گیا کہ اس مقبرے کے علاوہ یہاں کچھ اور چیزیں بھی ہیں۔ جب کھدائی کی گئی تو کئی سو فٹ گہرائی میں جا کر ایک محل نما مقبرہ برآمد ہوا جو ٹنگ لنگ کا تھا۔ یہ مقبرہ طلسماتی نوعیت کا ہے۔ زمین میں تین سو فٹ نیچے ایک بڑا ہال ہے جسے "لنگ اِن ہال" کہتے ہیں اس کے علاوہ ایک ستون ہے جو منگ ٹاور کے نام سے مشہور ہے۔ منگ ٹاور اور بڑے ہال کے پیچھے زمین دوز محل واقع ہے جس کا رقبہ ۳۶ سو مربع فٹ کے قریب ہے۔ اس محل سے ملحقہ پانچ بڑے چیمبرز ہیں ایک سامنے کی طرف ایک پیچھے کی طرف ایک مرکز میں اور دو دائیں بائیں یہ تمام ہال اور چیمبرز پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔ ان تمام مقبروں میں لکڑی کہیں استعمال نہیں کی گئی۔ درمیانی، سامنے اور پچھلی طرف والے چیمبرز کندہ کیے ہوئے سنگِ مرمر سے بنائے ہوئے تھے۔ ان چیمبرز میں بڑے بڑے صندوق رکھے ہوئے تھے جن کی اونچائی ۲۲ فٹ کے قریب تھی۔ درمیان والے چیمبر میں سنگِ مرمر کے تین بُت اور پوجا پاٹ کرنے کے ٹھڑے بنے ہوئے ہیں جن پر مختلف نشانات ہیں ایک ستون ہمیشہ جلنے والی لالٹین کی طرح ہے۔ اور پچھلا چیمبر تیس فٹ سے بھی زیادہ اونچا ہے۔ اس میں شہنشاہوں کے کفن رکھے ہوئے ہیں۔ قدیم چین کی روایات کے مطابق جب شہنشاہ مر جاتا تھا تو اسے نہلا کر لکڑی کے بڑے بڑے صندوقوں میں بند کر دیا جاتا تھا۔ اور اس صندوق میں کھانے

پینے کی چیزیں کام کرنے کے اوزار حتیٰ کہ جنگ کرنے کے ہتھیار بھی ساتھ ہی دفن کر دیئے جاتے تھے۔ اکثر شہنشاہ جب مر جاتے تھے تو ان کے غلاموں کو بھی قتل کر کے ان کے ساتھ کفن میں بند کر کے دفنا دیا جاتا تھا، وہ یہ ظلم عجیب و غریب عقیدے کے تحت کرتے تھے۔ انکا خیال تھا کہ موت کی طویل حالت سے گزر کر شہنشاہ دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔ تو کھانے پینے اور استعمال کرنے



شہنشاہوں کے مقبرے کے سامنے پاکستانی وفد کے اراکین کا گروپ فوٹو (دائیں سے بائیں) پاکستان میں چینی سفیر، بیگم زاہدہ سلطانہ، نواب مظفر ملک کالاباغ، حنیف نارو، عبدالخالق، عارف نظامی، تاج محمد لنگاہ، فاروق نثار اے پی پی، چینی ترجمان

کی دوسری چیزیں انہیں اپنے ہی گھر سے دستیاب ہو جائیں گی اور غلام بھی اٹھ کھڑے ہونگے جو حسبِ سابق ان کی خدمات سرانجام دیں گے۔ اسطرح حیاتِ نو میں بھی کاروبارِ سلطنت چلتا رہے گا۔ تنگ لنگ کے عجائب گھر کی کھدائی کے دوران زمین دوز محل سے تین ہزار چھوٹی بڑی چیزیں ملیں، جن میں سونے چاندی اور تانبے کے زیور۔ چینی اور مٹی کے برتن، لکڑی اور اس کا سامان، لکڑی پر روغن کرنے کا مسالہ، سلک کے پہننے کے کپڑے اور کپڑے سے بنی ہوئی چیزیں شامل ہیں۔ ان اشیاء میں سے کچھ چیزیں نمائش کے لیے رکھی ہوئی ہیں باقی پیکنگ کے قومی عجائب گھروں میں محفوظ ہیں۔ تنگ لنگ کے عجائب گھر میں جب ہم پہنچے تو دوپہر ہو چکی تھی۔ انتظامیہ نے وفد کے اراکین کو سنگترے کا جوس، چائے اور تازہ پھل، سیب، ناشپاتیاں اور تربوز پیش کیا۔ ہم نے پیٹ بھر کر کھایا۔ بعض دوستوں نے کیک، پیسٹری اور سنڈوچ سے بھوک مٹائی۔ جب تر و تازہ ہو گئے تو میوزیم کے مختلف حصوں کی سیر کرائی گئی۔ ہم نے تین سو فٹ گہرے محل نما مقبرے کو بھی بغور دیکھا۔ تنگ لنگ کے عجائب گھر کو دیکھتے وقت چین کے سفیر مقیم پاکستان بھی ہمارے ساتھ تھے۔ انھوں نے شستہ انگریزی میں میوزیم کے مختلف حصوں کے بارے میں ہمیں بتایا۔ میوزیم کے ایک حصے میں قدیم چین کے جاگیرداری نظام کی تاریخ، مجسموں اور تصاویر کے ذریعے دکھائی گئی تھی۔ ایک تصویر میں دکھایا گیا کہ ایک بڑا جاگیردار عدالت لگائے بیٹھا ہے اور غریب کسان اپنے ہاتھوں سے اگائی ہوئی فصلیں اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے جاگیر دار کے حضور پیش کر رہے ہیں۔ جاگیردار کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ اس نے نہایت قیمتی کپڑے پہنے ہوتے تھے۔ اس کے ارد گرد کرسیاں پڑی تھیں۔



شہنشاہوں کے مقبرے سے واپسی پر سڑک کے دونوں طرف بڑے بڑے جانوروں کے مجسمے نصب ہیں۔ انکے نزدیک پاکستانی وفد کے اراکین کا گروپ فوٹو۔ تاج محمد لنگاہ، مسٹر سنجرانی ایم پی اے، عبدالوحید کٹپر، عبدالخالق، عنایت اللہ گنڈاپور، پاکستان میں چینی سفیر، نواب مظفر ملک کالاباغ۔

اور وہ ایک تخت نمانشست پر بڑے مزے سے براجمان تھا۔ کچھ غریب مزارع اور کسان اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے اور منت سماجت کر رہے تھے۔ جاگیرداروں کے ساتھ ظالم چمچے اور خوشامدی دربار میں بیٹھے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ دوسری تصویر میں کسانوں اور محنت کشوں کی فاقہ زدہ زندگی کا نقشہ کھینچا گیا تھا۔ ان غریبوں کے بچے ننگ دھڑنگ اور پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ یہ تصاویر اور مجسمے قدیم چین کے ظالمانہ نظام کی عکاسی کرتے ہیں اور عوامی جمہوریہ چین کے نظام کے مقابلے میں پرانے نظام کے بارے میں پوری سفاکانہ جزئیات کا اظہار کرتے ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ عجائب گھر میں گھومنے پھرنے کے بعد ہم پیکنگ کی طرف واپس روانہ ہوئے۔ تنگ لِنگ کا عجائب گھر بڑی شاہراہ سے ہٹ کر واقع ہے راستے میں چھوٹی سڑک پر بڑے بڑے جانوروں کے مجسمے نصب ہیں۔ یہ مجسمے اونٹ، ہاتھی، شیر، ریچھ اور دوسرے جانوروں کے ہیں۔ یہ پتھر کے مجسمے بھی تنگ لِنگ عجائب گھر کی کھدائی کے دوران دستیاب ہوئے۔ جنہیں سڑک کے کنارے نصب کر دیا گیا۔ خیال ہے کہ چین کے قدیم زمانہ کے شہنشاہوں نے اپنے رعب داب کے اظہار کے لیے اتنے بڑے مجسمے تیار کروائے تھے۔ اور اپنے مقبروں پر ان مجسموں کو نصب کرنا بھی شان وشوکت اور جاہ وجلال کا حصہ تھا۔ سوا دو بجے کے قریب ہم اپنے مہمان خانہ میں واپس آئے چونکہ اس سے قبل عجائب گھر میں تازہ پھل اور دوسری چیزیں کھا چکے تھے۔ اس لیے دوپہر کے کھانے سے چھٹی کی گئی۔ تھکاوٹ دور کرنے کے لیے تھوڑی دیر آرام کیا۔ اور تین بجے کے قریب عوامی کمیون یعنی مشترکہ کھیتی باڑی کے فارم پر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

اجتماعی کھیتی باڑی کا فارم

کمیون جانے سے پہلے جب ہم کھانے

کے کمرے میں چائے پینے کے لیے گئے تو وہاں شیخ محمد رشید صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے دیوارِ چین اور تِنگ لِنگ عجائب گھر کے واقعات کے بارے میں ہم سے پوچھا۔ شیخ صاحب گزشتہ سال کے دورے پر چین کے مختلف علاقوں میں تشریف لے جا چکے تھے۔ اور ہم سے کہیں زیادہ مشاہدات کر چکے تھے۔ انہوں نے تِنگ لِنگ کے شہنشاہوں کے اس طرزِ عمل کے بارے میں کہ وہ اپنے ساتھ کھانے پینے کی اشیاء کے علاوہ غلاموں کو بھی دفن کر لیتے تھے۔ تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ برصغیر کی تہذیب میں بھی رجعت پسندی کی ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ مگر چین کے قبائلی نظام میں شہنشاہوں کے صندوقوں میں غلاموں کو دفن کرنا تو رجعت پسندی کی انتہا ہے۔ ہم ان کے اس تبصرے پر خاصے لطف اندوز ہوتے۔ شیخ صاحب نے چائے پینے کے بعد کمیون کے بارے میں ہدایات دیں کہ پارٹی کے ترقی پسند نوجوانوں کو کمیون کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ وہ عملی تجربات کے لیے بہرہ مند ہو سکیں۔ ہمارا قافلہ تین بجے پیکنگ سے چل کر ۳۰ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے "شوئنگ چین" کمیون پہنچا۔ سب سے پہلے ہمیں کمیون کے ہیڈ کوارٹر کے دفاتر میں لے جایا گیا۔ دروازے کے باہر سینکڑوں کی تعداد میں مردوں، عورتوں اور بچوں نے ہمارا استقبال کیا۔ چیئرمین انقلابی کمیٹی نے ہیڈ کوارٹر کے باہر ہمارے وفد کے اراکین کو خوش آمدید کہا۔ سب سے پہلے وہ ہال میں لے گئے۔ یہاں کانفرنس کے کمرے کی طرح میزیں اور کرسیاں سجائی گئی تھیں۔ یہ ہال ۲۰، ۲۵ فٹ لمبا اور پندرہ فٹ کے قریب چوڑا تھا۔ دیواروں پر بڑے بڑے نقشے اور چارٹ لٹکے ہوئے تھے۔ چیئرمین انقلابی کمیٹی نے وفد کے اراکین کو کمیون کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کیا۔ ان کے ساتھ مسٹر لی ڈائریکٹر وزارتِ جنگلات و زراعت موجود تھے۔ چیئرمین انقلابی کمیٹی نے بتایا کہ

"سٹو ٹنگ چیئن" کمیون کے چالیس ہزار ممبر ہیں۔ اس کا رقبہ ۹۰ مربع کلومیٹر یعنی تقریباً ۵۵ مربع میل ہے اور ۳۶ ہزار ہیکٹر یعنی ۹۰ ہزار ایکڑ زمین اس کمیون کی ملکیت ہے۔ کمیون کے ممبران کو ۶ پیداواری بریگیڈ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان بریگیڈوں کو مزید ۶۲ پیداواری ٹیموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اگرچہ کمیون کی زیادہ پیداوار زراعت سے ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی کمیون میں جنگلات، باغات اگانے کے علاوہ مرغی خانہ، بطخ خانہ اور مچھلی کے تالاب کے فارم بھی بنائے گئے ہیں۔ پیداواری اجناس میں گندم کے علاوہ چاول، سبزیاں اور پھل شامل ہیں کمیون میں ایک ڈیری فارم بھی ہے۔ پھولوں کی نرسری، لکڑی کاٹنے کا کارخانہ، آٹا پیسنے کی مل اور ورکشاپیں بھی ہیں، جن میں زرعی آلات مرمت کرنے کی ورکشاپ، موٹر ورکشاپ اور دوسری مشینوں کو مرمت کرنے اور پرزے بنانے کا کام کیا جاتا ہے۔ کمیون میں کھاد اور کیڑے مارنے کی دواوں کے کارخانے موجود ہیں۔ انقلاب سے پہلے کمیون ایریا کی زمین سیم تھور زدہ تھی جگہ جگہ گڑھے پڑے ہوئے تھے اور بہت کم پیداوار ہوتی تھی۔ مگر آزادی کے بعد کسانوں کی بے پناہ کوشش سے پیداوار بتدریج بڑھتی رہی یہاں تک کہ پچھلے سال گندم کی پیداوار فی ہیکٹر آٹھ ہزار کلو تھی۔ یہ پیداوار انقلاب سے پہلے کے مقابلے میں دس گنا ہے۔ گندم کے علاوہ چائے، چاول اور دوسری اجناس کی پیداوار میں اسی تناسب سے زبردست اضافہ ہوا۔ کمیون سے ہر روز تقریباً ستر ہزار سیر سبزی، دس ہزار سیر دودھ مارکیٹ میں بھیجا جاتا ہے۔ اس طرح ہزاروں سیر گوشت اور مچھلی کے علاوہ ہزاروں انڈے، مرغیاں، بطخیں مارکیٹ میں بھیجی جاتی ہیں۔ یہاں یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ چین میں بطخ اعلیٰ ترین مرغوب غذا ہے۔ پیکنگ کی پکی ہوئی بطخ ساری دنیا میں مشہور ہے

اور پیکنگ ہوٹل میں فخر یہ طور پر پکائی جاتی ہے مگر ہمیں افسوس ہے کہ ہم پیکنگ کی پکی ہوئی بطخ نہ کھا سکے اور کام و دہن اس ذائقہ سے آشنا نہ ہو سکے،

کمیون اپنی علمی، ادبی اور ثقافتی روایات بھی قائم کر رہا ہے۔ یہاں چھ مڈل سکول اور ۲۹ پرائمری سکول ہیں۔ پورے چین کی طرح کمیون کے ہر فرد کے لیے تعلیم لازمی اور مفت ہے۔ جونیئر مڈل سکول سے اب سنٹر مڈل کی تعلیم رائج کی جا رہی ہے۔

صحت کے میدان میں سارے کمیون میں مکمل سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں۔ یہاں پر امدادِ باہمی اور خود کفالت کی بنیاد پر طبی امداد کے مرکز موجود ہیں۔ ہر ممبر سال میں ایک یُن یعنی پانچ روپے میڈیکل فنڈ میں جمع کراتا ہے۔ اس کے صلے میں اسے اور اس کے اہلِ خانہ کو مکمل طبی امداد مہیا کی جاتی ہے۔ یہاں پر یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ سارے چین میں صحت کی مفت سہولتیں مہیا ہیں۔ مگر کمیون میں ابتدائی اور فوری نوعیت کی طبی امداد خود کفالت کی بنیاد پر دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے اعلیٰ اور خصوصی طبی امداد کے مراکز بھی ہیں۔ جہاں عوام کو مفت طبی امداد دی جاتی ہے۔

پچھلے ۲۶ سال میں اگرچہ زندگی کے تمام شعبہ جات میں نمایاں کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں تاہم یہ ابھی ناکافی ہیں۔ چیئرمین انقلابی کمیٹی نے بتایا کہ ابھی ترقی کی منزلیں طے کرنا باقی ہیں۔ مثال کے طور پر کمیون میں مشینوں کی فراہمی اور ان کا فنی معیار کم ہے۔ کمیون میں ابھی چاول لگانے کی مشینیں اور فصل کاٹنے کی مشینیں ضرورت کے مطابق نہیں ہیں۔ مگر اگلے دو تین سال میں اس کمی کو پورا کر لیا جائے گا۔ اس وقت کمیون میں دو سو ٹریکٹر ہیں۔ لیکن یہ ناکافی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ زراعت کے شعبے میں کافی کوشش کے بعد سائنس اور فنی طریقے رائج کیے جا چکے ہیں۔ کمیون اور پیداواری بریگیڈ کی سطح تک معیار کافی بلند ہے۔ اس

سطح تک زراعت کے فنی ماہرین بھی اس علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔
دوسرے علاقوں سے نہیں بلوائے جاتے۔ صرف تربیت کے لیے یہاں کے
طالب علموں کو یونیورسٹی میں بھیجا جاتا ہے۔ خود اعتمادی اور خود کفالت کی بنیاد
پر دن رات محنت ومشقت کے ساتھ کمیون کے حالات کو بہتر بنایا جارہا ہے چیئرمین
نے بتایا اگرچہ کمیون کو بنے ہوتے ۱۱ سال کا طویل عرصہ گذر چکا ہے مگر ان کے مطابق
ابھی جدید زمانے کے حالات کے پیشِ نظر وہ ناتجربہ کار ہیں اور بہتر تجربہ
حاصل کرنے کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے
کہا کہ ہم اپنے غیر ملکی دوستوں سے بھی تجربات سیکھنا پسند کریں گے۔ انہوں نے
کہا مثلاً ہم اپنے قریبی دوست پاکستان سے بھی استفادہ کر سکتے ہیں جس کے ساتھ
ہماری دوستی کے رشتے بہت گہرے ہیں۔ آج کا پاکستانی وفد کا دورہ پاکستان
اور چین میں مزید استحکام اور گہرائی پیدا کرے گا۔ آج پاکستانی دوستوں کے
درمیان کمیون کے لوگ بہت خوش ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ہمارے وفد کے
اراکین سے سوالات پوچھنے کو کہا سب سے پہلے ڈاکٹر خالق صاحب نے وفد
کے اراکین کی طرف سے چیئرمین انقلابی کمیٹی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ پاکستانی
عوام نے کمیون کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا ہے۔ انہوں نے سوال پوچھا،
ان کے سوال کا جواب دیتے ہوئے چیئرمین نے کہا کہ ایک ہی کھیت پر
سال میں دو فصلیں یعنی گندم اور چاول اُگائی جاتی ہیں اس لحاظ سے
سال کی فی ہیکٹر اوسط پیداوار دس ہزار کلو یعنی تقریباً سو من فی ایکڑ ہو جاتی
ہے۔ اسکے بعد ڈائریکٹر جنرل فیڈرل سیکورٹی فورس مسعود محمود نے سوال کیا۔
سوال ۔ ۱۹۵۸ء سے اب تک پیداوار بتدریج بڑھتی جارہی ہے۔ کیا اسکا مطلب
یہ ہے کہ کارکنوں اور کسانوں کی آمدنی اور تنخواہیں بھی اسی تناسب سے بڑھتی رہی ہیں؟

جواب: چیئرمین کمیٹی۔ جہاں تک پیداوار کے ترقیاتی منصوبوں کا تعلق ہے ان کے فنڈ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جہاں تک فی کس اوسط آمدنی کا تعلق ہے ۵۸ء میں پچاس یوآن آمدنی تھی یعنی اڑھائی سو روپے فی کس ماہانہ جب کہ پچھلے سال یہ آمدنی ایک سو تیس یوآن ۶۵۰ روپے فی کس ماہانہ تک بڑھ گئی ہے۔

مگر یہ کہنا بجا ہوگا کہ پیداوار اور آمدن کا تناسب یکساں نہیں ہے۔ یعنی پیداوار جتنی بڑھی ہے اس کے مطابق آمدنی نہیں بڑھ سکی اس کی وجہ یہ ہے کہ ۵۸ء میں کمیون کی آمدنی کا تھوڑا حصہ ترقیاتی کاموں کے لیے جمع کیا تھا۔ کیونکہ اوسط آمدنی کم تھی اب جب کہ اوسط آمدنی زیادہ ہو گئی ہے۔ ترقیاتی فنڈز کے حصے میں بھی زیادہ رقم رکھی جاتی ہے تاکہ پیداوار بڑھانے کے لیے اعلیٰ سائنسی اور فنی اقدامات کیے جا سکیں گے۔ اگلا سوال وفد کے ایک رکن نے پوچھا۔

سوال: آپ کا تنخواہ دینے کا نظام کیا ہے؟ کیا تنخواہ گھنٹوں کی بنیاد پر یومیہ یا پیداواری پوائنٹوں کے لحاظ سے دی جاتی ہے؟

جواب۔ چیئرمین انقلابی کمیٹی: ہم سال کے بعد اپنا حساب کتاب مکمل کرتے ہیں ہر کارکن کے کام کے معاوضے کا تعین ورک پوائنٹس کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ ورک پوائنٹس کا حساب کتاب یوں ہے کہ دس پوائنٹس سب سے اعلیٰ کارکردگی کی مثال ہیں۔ جہاں تک پوائنٹس الاٹ کرنے کا تعلق ہے۔ اس کا انحصار۔ کام کی نوعیت اور اعلیٰ کارکردگی کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ پیداواری ٹیم کے راہنما اپنے ممبران کو اچھی طرح جانتے ہیں اور ممبران ایک دوسرے کے بارے میں بھی اچھی یا بری رائے رکھتے ہیں دراصل کسی کارکن کی کارکردگی کا انحصار باہمی تنقید، خود تنقیدی اور خود احتسابی پر ہے۔ اس طریقے سے جب سال کے آخر میں کسی کارکن کے ورک پوائنٹس کا تعین کر لیا جاتا ہے تو اس کے مطابق اس کو معاوضہ ملتا ہے

جو نقدی کی صورت میں ہوتا ہے ویسے تو ہر تیسرے یا چھٹے مہینے ضرورت کے مطابق حساب کتاب بنایا جاتا ہے اور سالانہ معاوضہ کا حصہ کا رکن کو ادا کیا جاتا ہے۔ سال کے آخر میں ورک پوائنٹس کا مکمل حساب کتاب ہونے کے بعد بقایا جات ادا کر دیئے جاتے ہیں۔

سوال؟ ڈاکٹر خالق، پچھلے سال پیداوار کی کیا شرح تھی؟

جواب؟ چیئرمین، پچھلے سال گندم کی پیداوار چار ہزار کلو فی ہیکٹر یعنی چالیس من فی ایکڑ تھی۔ چاول کی پیداوار چھ ہزار کلو فی ہیکٹر یعنی ۶۰ من فی ایکڑ تھی۔ حیران کن بات یہ ہے کہ کھیت پر سال میں دو فصلیں گندم اور چاول اگائی جاتی ہیں اس لحاظ سے سال کی فی ہیکٹر اوسط پیداوار دس ہزار کلو یعنی سو من فی ایکڑ ہو جاتی ہے۔

سوال؟ آپ نے سیم و تھور کی مشکلات پر قابو پانے کے لیے کونسے سائنسی ذرائع اختیار کیے ہیں؟ پاکستان میں یہ مسئلہ سنگین صورت میں موجود ہے۔

جواب:۔ چیئرمین انقلابی کمیٹی، اب ہمارے یہاں سیم و تھور بالکل نہیں ہے کیونکہ ہم نے ناہموار زمین کو ہموار کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے پانی کے ذخیرے کے بے شمار ایسے تالاب بناتے ہیں کہ جب بارش ہوتی ہے تو پانی ان تالابوں میں جمع ہو جاتا ہے اور بعد میں تعمیر شدہ زمین دوز نالیوں کے ذریعے یہ پانی دریاؤں کی طرف بہہ جاتا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں جب پچاس ملی میٹر بارش ہوئی تھی تو ہماری زمین اور فصلیں تباہ و برباد ہو گئیں تھیں۔ پچھلے سال دو سو ملی میٹر بارش ہوئی لیکن اس کے باوجود پانی کے نکاس کے اعلیٰ نظام کی وجہ سے فصلوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اس کے علاوہ انقلاب سے پہلے مختلف نوعیت کی فصلیں کاشت کی جاتی تھیں۔ اب ہم نے فصلوں کی مناسب اقسام کی کاشت

میں بھی نمایاں تبدیلی کی ہے۔ اس سے پہلے مکئی اور سویابین کاشت ہوتا تھا۔ اور اب اس جگہ چاول کی فصل اُگائی ہے۔ جس کو بارش سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ عبدالوحید کپٹر نے سوال کیا۔

سوال۔ پانی کے نکاس کا آپ کا کیسا نظام ہے؟

جواب، چیئرمین، فی الحال زمین میں کھلی نالیوں کے ذریعے پانی خارج کیا جاتا ہے۔ ہم یہ بھی کوشش کر رہے ہیں کہ فصلوں کو پانی صرف سپرے کے ذریعے دیا جائے۔

اب یاروں نے سوال کی گیند اچھالی جو چیئرمین نے فوراً کیچ کر لی۔

سوال: ہمارا یہ اندازہ ہے کہ آپ اپنی پیداوار سے اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد جو پس انداز کرتے ہیں وہ حکومت کو یا منڈی میں بیچتے ہیں کیا اس کے عوض حکومت سے آپ کسی قسم کی امداد حاصل کرتے ہیں۔؟

جواب: خود کفالت اور اپنی مدد آپ ہمارا اصول ہے۔ تاہم انقلاب کے بعد پیکنگ شہر کے گرد و نواح میں پانی کے ذخیرے کے بند اور تالاب بنائے گئے ہیں جن سے ہمارا کمیون استفادہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر سال پیکنگ یونیورسٹی سے طالب علم بغیر کسی معاوضہ کے ہماری فصلوں کی کاشت اور امداد کرنے کے لیے آتے ہیں۔ مگر پھر بھی ہم مکمل خود کفالت اختیار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، میرا دوسرا سوال تھا۔

حکومت کی طرف سے پانی بجلی اور دوسری سہولتیں فراہم کرنے کے عوض کیا حکومت کو کوئی ٹیکس یا قیمت ادا کی جاتی ہے؟

جواب: بجلی اور پانی کے لیے ہم معاوضہ یعنی قیمت دیتے ہیں۔ اگرچہ ہمیں بجلی فیکٹریوں کے مقابلہ میں سستی مہیا کی جاتی ہے۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ ہم حکومت کو بجلی پانی اور دوسری سہولتوں کے عوض صرف لاگت ادا کرتے ہیں۔ مگر کسی قسم

کا ٹیکس ادا نہیں کرتے۔ میرے بعد وفد کے ایک رکن نے کھاد کے استعمال کے بارے میں سوال کیا۔ اس کے جواب میں چیئرمین انقلابی کمیٹی نے کہا چونکہ ہمارے کمیون کی زمین کی سطح اوتھلی اور سیم زدہ ہے اس واسطے ہم ایک ہیکٹر میں ستر (۷۰) سیر کلر اور ستر (۷۰) سیر کیمیاوی کھاد استعمال کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سوالات وجوابات کا دور ختم ہو گیا اور چیئرمین انقلابی کمیٹی نے وفد کے اراکین کو گندم کی فصل کا نمائشی قطعہ ارضی دکھایا۔ ہم کمیون کے ہیڈ کوارٹر سے چند سو گز پیدل چل کر گندم کے اس کھیت میں پہنچے۔ یہ کھیت بڑے خوبصورت طریقے سے اگایا گیا تھا۔ فصل اگرچہ مکمل طور پر اُگ چکی تھی اور سٹے بھی نکل آئے تھے۔ مگر ابھی تین ہفتے تک کاٹنے کے قابل نہ تھی۔ خیال تھا کہ پندرہ جون تک فصل کاٹنے کے قابل ہو جائے گی۔ چیئرمین انقلابی کمیٹی نے ہمیں گھوم پھر کر کھیت اور فصل کے بارے میں ضروری معلومات مہیا کیں، انہوں نے بتایا کہ اس کھیت کے قریب ہی واقع بجلی کے ٹیوب ویل ہیں، پانی کھیت میں نصب شدہ پائپ لائنوں کے ذریعے فواروں کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ ایک تو اس سے پانی کم خرچ ہوتا ہے۔ پھر بارش کی طرح پانی دینے کا یہ طریقہ فصل کے لیے صحت مند بھی ہوتا ہے۔ چیئرمین نے ہمیں بتایا کہ اس کھیت کی پیداوار سات ہزار کلو فی ہیکٹر یعنی ۷۰ من فی ایکڑ ہے گندم کاٹنے کے فوراً بعد چاول کی پنیری لگا دی جاتی ہے اور اس کی اوسط پیداوار کوئی ساڑھے آٹھ سو کلو یعنی ۸۵ من فی ایکڑ ہے۔

اس لحاظ سے اس نمائشی کھیت کی سالانہ دو فصلوں کی پیداوار کی اوسط ساڑھے پندرہ ہزار کلو فی ایکڑ یعنی ایک سو پندرہ من فی ایکڑ ہے۔ جب چیئرمین انقلابی کمیٹی کھیت میں کھڑے تفصیلات بتا رہے تھے۔ تو میرے ساتھ ملک مظفر خان ایم این اے کالا باغ بھی کھڑے تھے۔ جب میں نے ان سے نمائشی کھیت کے بارے

میں رائے پوچھی تو انہوں نے ناک چڑھاتے ہوئے چیئرمین انقلابی کمیٹی کے اعداد وشمار پر شکوک وشبہات کا اظہار کیا انہوں نے یہ بھی کہا کہ کھیت کی پیداوار ہمارے مقابلے میں کوئی زیادہ نہیں ہے۔ مجھے ان کی سادہ لوحی پر ترس آیا کہ پاکستان کا چین کے ساتھ مقابلہ قطعی ناممکن ہے۔ کیونکہ زرعی پیداوار کا اوسط قومی ریکارڈ بہت کم ہے۔ اس لہلہاتے اور محنت کی عظمت کے عظیم شاہکار کھیت کے مشاہدے کے بعد چیئرمین انقلابی کمیٹی نے ہمیں پولٹری فارم دکھائے اور کمیون ممبران کے گھروں کو دیکھنے کی دعوت دی۔ ہم اس مقام سے دو میل کا فاصلہ طے کر کے پولٹری فارم پر پہنچ گئے۔ جن سڑکوں سے قافلہ گزر رہا تھا وہ کمیون کے ممبران نے اپنی مدد آپ کے تحت بنائی تھیں، جو بہت کشادہ صاف ستھری اور معیاری تھیں۔ ان سڑکوں کے دونوں طرف خوبصورت درخت اور پھلدار پودے کثیر تعداد میں اگائے گئے تھے۔ ہر طرف گھنے سائے، ٹھنڈی چھاؤں اور مہکتے لمحے ہمارے خیالات کی وادی کو آباد کر رہے تھے۔

پولٹری فارم میں مرغی اور بطخ کے انڈوں سے بچے پیدا کرنے کی مشین ہمیں دکھائی گئی اس کے بعد بطخ خانہ دکھایا گیا۔ مقامی کمیٹی کے چیئرمین نے تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ بطخ کے بچوں کو پچاس دن تک پالنے کے بعد چھ دن کے لیے خاص قسم کی مصنوعی خوراک دن میں چار مرتبہ زبردستی کھلائی جاتی ہے اس موقع پر ہمیں خوراک کھلا کر بھی دکھائی گئی۔ انہوں نے بتایا کہ جب بطخیں ساٹھ دن کی ہو جاتی ہیں۔ تو مارکیٹ میں بیچ دی جاتی ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں یہ خوبصورت سفید بطخیں کم از کم چار چار پانچ پانچ سیر کی ہوں گی۔ پولٹری فارم دکھانے کے بعد ہمیں قریب ہی واقع مچھلی کا بھی ایک تالاب دکھایا گیا۔ یہ تالاب کمیون کے دوسرے حصوں میں واقع تالابوں سے اگرچہ چھوٹا تھا تاہم اس میں بھی اعلیٰ النسل کی مچھلیاں پائی گئیں۔

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد کوئی دو فرلانگ پر واقع ایک گاؤں میں ہمیں لے جایا گیا۔ یہاں کمیون کے ممبران رہتے تھے۔ اراکین کی تین ٹولیاں بنا دی گئیں تاکہ ہم مختلف گھروں کو اچھی طرح دیکھ سکیں۔ ہماری ٹولی جس گھر گئی اس کا رقبہ دس مرلے ہوگا۔

اس کے چار کمرے تھے۔ پہلا کمرہ ڈرائینگ روم کی طرح کا تھا اور مشترکہ استعمال کے لیے تھا۔ اس میں سادہ سا فرنیچر پڑا تھا۔ بائیں طرف سونے کا کمرہ تھا۔ اس میں میاں بیوی کے علاوہ ان کے دو بچے لڑکا اور لڑکی بھی سوتے تھے۔ چین کی روایت کے مطابق سونے کے لیے پلنگ، یا چارپائیاں استعمال نہیں کی جاتیں۔ کمرے میں تین فٹ اونچا، کوئی دس فٹ لمبا تقریباً چھ فٹ چوڑا اینٹوں کا تھڑا بنا ہوا تھا جس پر سب سے نیچے چٹائی رکھی ہوئی تھی۔ اس پر دری تھی۔ پھر گدا سب سے اوپر سفید چادر بچھائی گئی تھی۔ اس تھڑے کے کونے میں تکیے، ہلکی پھلکی رضائیاں اور کمبل تہ کیے ہوئے پڑے تھے۔ اس تھڑے پر یہ مختصر سا خاندان شب بسری کرتا تھا، ان کے چار اور دو سالہ دو بچے بھی یہیں سوتے تھے۔ اس تھڑے کے علاوہ اس کمرے میں چھوٹی سی کھانے کی میز، چار کرسیاں، ایک لکھنے کا ڈیکس اور کرسی، ریڈیو، کتابیں رکھنے کی چھوٹی سی الماری موجود تھی۔ اس کمرے میں درمیان والے کمرے سے داخل ہونے والے دروازے کے علاوہ صحن کی طرف کھلنے والی بڑی کھڑکی بھی تھی۔ کمرے کے پچھلی طرف کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں تھا۔ کمرے کی لمبائی بارہ فٹ اور چوڑائی دس فٹ تھی۔ اب ہم ڈرائینگ روم سے دائیں طرف مڑے اس طرف دو کمرے تھے۔ ایک کمرہ سونے کے لیے تھا اور اس میں گھر کی مالکہ کی والدہ اور اس کی غیر شادی شدہ چھوٹی بہنیں رہتی تھیں۔ اس خاتون کے والد پیکنگ کی ایک فیکٹری میں ملازم تھے۔ وہاں رہنے کے لیے جگہ تو تھی مگر

وہ چھٹی لیکر گاؤں واپس آکر اپنی بیٹی کے گھر رہتا تھا۔ گھر کے میاں کی بوڑھی والدہ بھی یہیں رہائش پذیر تھیں۔ میاں بیوی کی مائیں گھر کے کام کاج میں مدد کرتی تھیں۔ ان کی کفالت ان کے بچے کرتے تھے۔ بیوی کی غیر شادی شدہ چھوٹی بہن بھی کمیون میں کام کرتی تھی۔ اس کمرے سے اگلا کمرہ سٹور کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے مگر کبھی کبھار اس کو سونے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کمروں کے علاوہ باہر کھلا صحن تھا اس میں دو درخت اور ایک ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا۔ صحن کافی صاف ستھرا تھا۔ فرش پکا تھا اور دیواریں بھی پکی اور چھ فٹ اونچی تھیں۔ صحن کے ایک اور کونے میں دو اور کمرے تھے۔ ایک باورچی خانہ تھا دوسرا کھانے پینے کی اشیاء رکھنے کے لیے سٹور کا کام دیتا تھا۔ باورچی خانہ میں ہم نے جھانک کر دیکھا تو وہاں گھر کی مالکہ کی والدہ جس کی عمر تقریباً ۶۰ سال ہو گی گھریلو کام کاج کر رہی تھی۔ باورچی خانہ بھی صاف ستھرا تھا۔ صحن والے دروازے کے باہر پانچ سات مرلے کا خالی پلاٹ تھا۔ یہ پلاٹ بھی مکان کے ساتھ اسی خاندان کی نجی ملکیت تھا اس پلاٹ میں سبزیاں وغیرہ کاشت کی گئی تھیں۔ اس پلاٹ کے کونے پر باہر کی طرف زمین دوز لیٹرین اور غسل خانہ بنا ہوا تھا۔ صحن اور سبزی کے پلاٹ میں آدھ درجن کے قریب مرغیاں اور چوزے پھر رہے تھے۔ یہ بھی اسی خاندان کی نجی ملکیت تھے جس وقت ہم اس گھر میں پہنچے تھے تو دروازے پر گھر کی مالکہ جو کہ تقریباً تیس سال کی عمر کی خاتون تھیں، نے ہمارا استقبال کیا۔ اس وقت گھر میں اس خاتون کے علاوہ اس کی بوڑھی ماں اور دو چھوٹے بچے موجود تھے۔ بچے اپنے صحن اور اس کے باہر گاؤں کے دوسرے بچوں سے کھیل کود رہے تھے اس خاتون نے نیلے رنگ کی کاٹن کی پتلون اور ربڑ کے مخصوص چینی جوتے اور ہلکے لسواری رنگ کی بشرٹ پہنی ہوئی تھی۔ ترجمان کی وساطت سے اس خاتون نے اپنے گھر کی تفصیلات بتائیں۔ ہمارے ایک سوال کے جواب میں اس نے بتایا

کہ یہ مکان اور پلاٹ ان کی نجی ملکیت ہے اور انہوں نے قیمتاً خریدا تھا۔ ایسا مکان خریدنے اور تیار کرنے میں دو ہزار یُن یعنی ۱۰ ہزار روپے خرچ آیا ہے یہ رقم میاں بیوی اور گھر کے دوسرے افراد نے مل کر بچت کی رقم سے ادا کی ہے اگر ضرورت پڑے تو مکان تعمیر کرنے کے لیے کمیون کی انتظامیہ یا حکومت کے دوسرے اعلیٰ عہدیداروں سے قرضہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ایک دوسرے سوال کے جواب میں اس خاتون نے بتایا کہ ان کے خاوند کی آمدن تقریباً ۱۰۰ یُن یعنی پانچ سو روپے ماہوار ہے۔ اس کی اپنی آمدن پچاس یُن یعنی اڑھائی سو روپے ماہوار ہے۔ اس کی چھوٹی بہن کی آمدن ۳۵ یُن یعنی ایک سو پچھتر روپے ماہوار اور اس کے والد کی آمدنی ایک سو یُن یعنی پانچ سو روپے کے برابر ہے۔ اس لحاظ سے سارے خاندان کی مجموعی آمدن ۲۸۵ یُن یعنی ۱۴۲۵ روپے ماہانہ ہے۔ گھر کے اخراجات چلانے کے لیے کام کرنے والے تمام افراد اپنے اخراجات کا حصہ ادا کرتے ہیں۔ جو بچت ہوتی ہے وہ ہر فرد اپنے بنک اکاؤنٹ میں اپنے نام سے جمع کراتا ہے۔ ضرورت کے تحت جمع شدہ رقم کو بنک سے نکلوا لیا جاتا ہے۔

بنک سال میں ایک یُن فی صد یعنی پانچ روپے منافع ادا کرتا ہے۔ اس آمدنی کے علاوہ کمیون کی طرف سے کھانے پینے کی اشیاء مقامی سٹوروں سے سستے داموں مہیا کی جاتی ہیں۔ جو اشیا کمیون میں تیار ہوتی ہیں۔ ان کی قیمت مارکیٹ سے کم ہوتی ہے۔ کھانے پینے کی سستی اشیاء خریدنے کی سہولت کے علاوہ جیسے اوپر کہا گیا ہے۔ تعلیم اور صحت کی مکمل مفت سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ اس گھرانے کی خاتون نے ہمیں بتایا کہ جب اس کی غیر شادی شدہ بہن شادی کرے گی تو وہ اپنے مکان کا بندوبست اپنی بچت یا کمیون کی امداد سے کرے گی اگرچہ

نوجوان جوڑے کو مالی امداد کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تاہم خاندان کے افراد کسی قسم کی امداد سے گریز نہیں کرتے۔ شادی بیاہ کی تقریبات بالکل سادہ نوعیت کی ہوتی ہیں جب نوجوان لڑکا اور لڑکی شادی کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو خاندان کے افراد اور عزیز و اقارب ان کے معاملہ میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتے۔ شادی کی تقریب صرف انقلابی کمیٹی کے مقامی دفتر میں ایک خصوصی رجسٹر پر دستخط کرنے سے مکمل ہوتی ہے۔ اس موقع پر اکثر دوست اور عزیز و اقارب بھی موجود ہوتے ہیں۔ دستخطوں کی تقریب کے بعد کمیون یا انقلابی کمیٹی کے اجتماعی مرکز میں سادہ اور مختصر کھانے پینے کی تقریب ہوتی ہے۔ مگر اس موقعہ پر ڈھول باجے، مرغے دنبے، بکریاں، بھینسیں اور تماشے پاکستان کیطرح کہیں بھی نہیں ہوتے نتیجۃً ان کا اس پر کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ دستخط کیے اور گھر کو واپس آ گئے۔ چھوٹی موٹی ثقافتی تقریب منعقد ہو گئی، سادہ سا کھانا بھی کھا لیا اور بعد میں آرام سے زندگی گزارنے لگے۔ اللہ اللہ خیر سلا چین میں جہیز جیسی لعنت کی کوئی رسم موجود نہیں ہے۔ یہ کمیون چین کے بعض دوسرے علاقوں کے مقابلے میں خوشحال تھا۔ دوسری جگہوں پر ممبران کی انفرادی آمدن شاید کم ہو مگر پھر بھی ایک خاندان کی آمدن اور دوسری بنیادی سہولتوں سے چین کے کسانوں کی خوشحالی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہمیں کمیون کو دیکھ کر محسوس ہوا کہ خاندانی تعلقات، رشتے اور جذبات و احساسات کی نکھری ہوئی فضا موجود ہے۔ اس گاؤں میں اس قسم کے دو سو مکانات تھے۔ ان میں تقریباً ۹۰۰ افراد رہتے تھے۔ اردگرد پھیلے ہوئے سرسبز کھیت ایک عجیب روح پرور منظر پیش کر رہے تھے۔ ساڑھے پانچ بجے کے قریب ہم یہاں سے فارغ ہوئے اور جب ہم جانے لگے تو تمام گاؤں کے مرد عورتیں اور بچے کاروں کے اردگرد جمع ہو گئے اور انہوں نے شدتِ جذبات سے تالیاں بجا کر ہمیں الوداع کہا۔ ہماری

گاڑیوں کا قافلہ آدھ گھنٹے کے بعد پیکنگ شہر میں داخل ہو گیا۔ حسب دستور جب ہماری گاڑیاں پونے چھ بجے کے قریب فرینڈشپ سٹور سے گزریں تو ہمارے وفد کے خوشحال اراکین کے قدم رک گئے۔ وہ خرید و فروخت کے لیے سٹور میں چلے گئے۔

شام کو ½۸ بجے وزیر اعظم اور بیگم بھٹو سمیت چین کے وزیر اعظم ہوا کوفنگ نے وفد کے سینئر اراکین کو بھی کھانے پر بلایا تھا۔ ابھی کھانے میں تھوڑا سا وقت تھا۔ میں نے اپنے ترجمان سے فرمائش کی کہ ہم چین کے کسی خرید و فروخت کے بڑے سٹور کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ میرے ساتھ محمد بخش مجاہد اور حنیف نارو بھی تھے واضح رہے کہ چین کے قیام کے دوران حنیف نارو صاحب مستقل طور پر میری اور مجاہد صاحب کی کار میں گھومتے رہے۔ جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے ساتھ ٹھہرنے والے مسٹر نصراللہ سنجرانی ایم پی اے بلوچستان شاید غیر دلچسپ اور بور شخصیت کے مالک تھے وہ نہ تو گفتگو کرتے اور نہ اپنے علاوہ کسی دوسرے انسان میں دلچسپی لیتے، حنیف نارو صاحب اکثر وقت ہمارے ہی کمرے میں گزارتے تھے اور صرف سوتے وقت اپنے کمرہ نمبر ۱۰۴ اور گیسٹ ہاؤس نمبر ۶ میں جاتے۔ سنجرانی صاحب کی بوریت کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ گزشتہ رات گیارہ بجے حنیف نارو صاحب کے اصرار پر میں اس خیال سے ان کے کمرے میں گیا کہ سنجرانی صاحب سے چین اور کوریا کے بارے میں گپ شپ لگ سکے گی۔ کیونکہ سنجرانی صاحب ۱۹۷۵ء میں پارلیمانی وفد کے ساتھ چین اور کوریا کا دورہ کر چکے تھے۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو سنجرانی صاحب جاگ رہے تھے۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور بے حس و حرکت لیٹے رہے اور ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ہم دونوں نے طنز و مزاح اور قہقہے لگانے کی کافی مشق کی مگر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نہ پھیل سکی۔ اس حالت میں چین اور کوریا

کے متعلق مزید گفتگو کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہماری گاڑی میں نارو صاحب اس لیے سفر کرتے تھے کہ ان کو مجاہد صاحب سے محبت ہو گئی تھی۔ میں نے کئی بار نارو صاحب کو کمرہ بدلنے کو کہا مگر مجاہد صاحب نے میری موجودگی میں نارو صاحب کے ساتھ کمرے میں ٹھہرنے سے انکار کر دیا۔ مجاہد صاحب بڑی مشکل سے اس بات پہ رضامند ہوئے کہ اگر نارو صاحب کو ہمارے ساتھ ٹھہرنے کی خواہش زیادہ ہی ستاتی ہے تو وہ کمرے میں تیسرا بستر لگا کر سو سکتے ہیں۔ مگر اس کی اجازت پرٹوکول نہیں دیتا تھا۔ نتیجۃً معاملہ جوں کا توں رہا اور نارو صاحب نے ہماری کار میں تیسری نشست پر قبضہ جما لیا۔ نارو صاحب کے ہمارے ساتھ نتھی ہونے کی ایک اور دلچسپ وجہ بھی تھی۔ وہ یہ کہ ان کی ترجمان خاتون ان کے چٹپٹے سوالات کا جواب دینے سے قاصر رہتی تھی۔ اس لیے وہ ہمارے نوجوان ترجمان کا دماغ چاٹنے کے لیے اس طرف رجوع کرنے پر مجبور رہتے۔

نارو صاحب نے ترجمان سے شادی بیاہ محبت نفرت، جھگڑا، طلاق، جرائم، مذہب، ثقافت، جنس اور دوسرے ہزاروں اوٹ پٹانگ سوالات پوچھے اور ہمارے ترجمان نے جن کی عمر تیس سال تھی، نہایت شستہ انگریزی زبان میں پوری اہلیت کے ساتھ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ایک ایک سوال کا تفصیلی جواب دیا۔ بلا مبالغہ ہمارے ترجمان مسٹر چو، اعلیٰ انسان ہیں اور اپنے ملک اور پارٹی کی نمائندگی کرنے میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ بہرحال ہمارے اصرار پر مسٹر چو ہمیں چین کا ایک سات منزلہ خرید و فروخت کا بڑا اسٹور دکھانے کے لیے لے گئے۔ یہ سٹور چینی عوام کی خرید و فروخت کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس کا رقبہ ہزاروں مربع فٹ ہو گا۔ ہر منزل پر سینکڑوں کی تعداد میں چین کے محنت کش چیزیں خرید رہے تھے۔ ہم چونکہ صرف چیزوں کی قیمتیں اور عام آدمیوں کی خرید و

فروخت کی عادات دیکھنے آئے تھے اس لیے جلدی سے ہم نے تمام منزلوں پر گھوم کر جائزہ لیا۔ سٹور میں ضروریاتِ زندگی کی تمام چیزیں فروخت ہو رہی تھیں ان چیزوں کی قیمتیں فرینڈ شپ سٹور جو خصوصی طور پہ غیر ملکی مہمانوں کے لیے ہے، سے مختلف نہیں تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ چند ایک اشیاء کی کوالٹی کا فرق ہو۔ اس سٹور میں تمام منزلوں پہ ہزاروں کی تعداد میں مزدور اور عام چینی عوام خرید و فروخت کر رہے تھے۔ اس سے عوام کی خوشحالی کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ عوام کے کپڑے تقریباً ایک جیسے اور صاف ستھرے تھے۔ زیادہ تر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اور جوڑے خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ اوپر کی منزل پہ ہم نے ماؤزے تنگ طرز کی یونیفارم کا بھاؤ پوچھا۔ مجاہد صاحب اس یونیفارم کو خریدنا چاہتے تھے۔ سیل گرل نے اس کی قیمت چودہ یوّن یعنی صرف ستر روپے بتائی۔ اتفاق سے مجاہد صاحب کے ماپ کی یونیفارم دستیاب نہ ہو سکی شاپ اسسٹنٹ نے ہمیں کہا کہ اگلے روز آ کر یونیفارم لے لیں۔ میں نے موقعہ غنیمت جانتے ہوئے مرد شاپ اسسٹنٹ سے چند ایک سوالات پوچھ ڈالے۔ جن کے جواب میں پتہ چلا کہ شاپ اسسٹنٹ کی تنخواہ نوّے یوّن یعنی چار سو پچاس روپے ہے۔ اس آدمی کی عمر پچاس سال کے قریب تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کی بیوی دوسری جگہ کام کرتی ہے اور ساٹھ یوّن یعنی ۳۰۰ روپے ماہانہ لیتی ہے۔ ان کے پانچ بچے، دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے اور یہ شادی شدہ ہیں اور اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ اور علیحدہ رہتے ہیں۔ ایک چھوٹا لڑکا اور لڑکی سکول جاتے ہیں۔ میرے سوال کے جواب میں شاپ اسسٹنٹ نے بتایا کہ وہ دونوں میاں بیوی آمدن کے لحاظ سے خوشحال ہیں اور ان کی زندگی پُر سکون ہے۔

میں نے جب ان سے یہ سوال پوچھا کہ آپ خوش ہیں، تو خوشی

اور مسرت سے اس کا چہرہ گلاب کی طرح کھل گیا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ اور جسم ہلاتے ہوئے کہا کہ "نہایت خوش ہیں" اس نے اس بات کا بھی اعتراف کیا کہ ان کی خوشی عظیم چیئرمین ماؤ کی قیادت اور چین کی کمیونسٹ پارٹی کی ہمدردانہ شفقت کی مرہونِ منّت ہے۔ پاس ہی کھڑی نوجوان اسسٹنٹ لڑکی کی تنخواہ کے بارے میں میں نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اسے ۳۵ یُن یعنی پونے دو سو روپے ماہوار ملتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ لڑکی کو پندرہ یُن کیوں ملتے ہیں؟ کیا یہاں عورتوں کی تنخواہ مردوں سے کم ہے؟ اس مرد نے مجھے بتایا کہ مردوں اور عورتوں کی تنخواہ برابر ہے۔ چونکہ اس لڑکی نے حال ہی میں کام شروع کیا ہے۔ اس لیے سینارٹی اور کام کی نوعیت کے لحاظ سے اس کی تنخواہ دوسروں سے کم ہے۔ اس روز ہم اس سٹور سے گھوم پھر کر واپس آ گئے اور دوسرے روز چند ایک چیزیں خریدنے کے لیے سٹور پہ آئے۔ مجاہد صاحب کے ماپ کی وردی آچکی تھی جو انہوں نے خرید لی۔ حنیف نارو صاحب نے اپنے چھوٹے بچے کے لیے سکول کی یونیفارم کا کپڑا خریدا۔ یہ چین کی مقبول نیلے رنگ کی سوتی زین تھی۔ وہ اپنے نوکر کے لیے بھی خریدنا چاہتے تھے۔ جو سکول بھی جاتا تھا۔ مگر شاپ اسسٹنٹ نے ترجمان کی وساطت سے مزید بارہ گز زین دینے سے معذرت چاہی اور بتایا کہ "چین کے قانون کے مطابق چھ گز سے زائد سوتی کپڑا نہیں بیچ سکتے۔ البتہ دوسرا کپڑا حسبِ منشا مرضی ہو خرید لیا جائے" اس کی وجہ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ چین میں کاٹن کم پیدا ہوتا ہے اور خود کفالت کے اصولوں پہ ہر فرد کو سال میں صرف چھ گز سوتی کپڑا ملتا ہے۔ سوتی کپڑے کے علاوہ دوسرے مصنوعی ریشے، ریان، نائیلون اور ریشم وغیرہ کے کپڑوں پہ کوئی پابندی نہیں۔ جب ہمارے ترجمان نے شاپ اسسٹنٹ کو بتایا کہ ہم چین کی حکومت کے مہمان ہیں اور ساتھ انہوں نے وزارت

خارجہ کے افسر کی حیثیت سے ایک چٹ بھی لکھ کر دی تو کہیں جا کر ہم بارہ گز زین حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ہمیں بتایا گیا کہ کاٹن کے علاوہ چند دوسری چیزیں بھی، جن کی ابھی ملک میں پیداوار کم ہے مثلاً چینی، گھی، اس قسم کا کنٹرول ہے۔ واضح رہے کہ چینی عوام اس پابندی کا مکمل احترام کرتے ہیں اور منظور شدہ مقدار کے علاوہ کپڑا یا دوسری چیزیں بالکل نہیں خریدتے۔ اور مارکیٹ میں کسی قسم کی بلیک یا چور بازاری کی لعنت موجود نہیں ہے۔ جب اگلے روز ہم سٹور میں آئے تو تعجب ہوا کہ وفد کے خوشحال اراکین اس روز بھی یہاں پہنچ چکے تھے اور سازوسامان کے بڑے بڑے پیکٹ بغلوں میں دبائے اپنی گاڑیوں کی طرف جا رہے تھے۔

شام کو سوا سات بجے ہمارا قافلہ پیپلز ہال میں وزیرِ اعظم چین کے خصوصی کھانے پر آیا اس کھانے میں پاکستانی وفد کے اراکین میں سے پچیس کے قریب افراد تھے اور اتنے افراد چین کے ہوں گے۔ یہ کھانا چونکہ غیر رسمی تھا اسلیے ہمیں یونیفارم پہننے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم سادہ سوٹ میں دعوت میں آئے یہ کھانا پیپلز ہال کے استقبالیہ کمرے کے پہلو میں بائیں طرف ایک چھوٹے سے ڈائننگ ہال میں دیا گیا تھا۔ وزیرِ اعظم بھٹو اور بیگم بھٹو، وزیرِ اعظم چین پونے آٹھ بجے کھانے کے کمرے میں تشریف لائے۔ ہال میں بالکل خاموشی اور سنجیدگی کا ماحول تھا۔ کوئی آرکسٹرا وغیرہ نہیں تھا۔ سب سے لمبی بڑی میز پر وزیرِ اعظم پاکستان، بیگم بھٹو، وزیرِ اعظم چین، پاکستان کے مرکزی وزراء اور دوسرے سینئر اراکین بیٹھے تھے۔ اس کے علاوہ چار اور میزیں تھیں جن پر صوبائی وزراء، ایم این اے، ایم پی اے پارٹی کے راہنما، وزیرِ اعظم کے ذاتی عملہ کے افسران ان کے مقابل چینی راہنما اور افسران تشریف رکھتے تھے۔ یہ کھانا نہایت پُر لطف اور لذیذ تھا کھانے میں ابتدائی ڈشوں کے علاوہ گرم اور سرد کھانے کے کورس حسبِ دستور مکمل کیے گئے۔

ہمارے خیال میں کھانے کے تمام دور ہو چکے تھے۔ مگر یکدم کھانا تقسیم کرنے والے کارکنوں نے ہماری میز پہ دو بڑی بڑی تانبے کی کیتلیاں لاکر رکھ دیں۔ جن میں پانی تھا۔ اس کے بعد ان کیتلیوں کے اردگرد آٹھ دس چھوٹی پلیٹیں لگا دیں ان پلیٹوں میں علیحدہ علیحدہ باریک کاٹی ہوئی مچھلی، مرغی، دُنبے اور گائے کا گوشت، سالم انڈے، ٹماٹر وغیرہ رکھے گئے تھے۔ ان تمام چیزوں کو دیکھ کر ہمیں عجیب احساس ہوا کہ شاید یہ باریک باریک کاٹا ہوا گوشت کچا کھایا جائے گا۔ ہم نے سن رکھا تھا کہ چین میں بلی، مینڈک، سانپ اور گھوڑے کا کچا گوشت کھایا جاتا ہے۔ اب تک ہم نے ان چیزوں کا گوشت نہیں کھایا تھا۔ اس لیے ہماری آنکھوں کے گرد اندھیرا سا چھا گیا اور سمجھے کہ بس آج یاروں کی باری آئی اور کچا گوشت کھانا پڑ گیا ابھی میں اس جذباتی کیفیت سے گزر رہی رہا تھا کہ کارکن نے اس کیتلی کے نچلے حصے میں ماچس کی تیلی لگا کر آگ جلائی۔ آگ جلنے سے پتہ چلا کہ کیتلیوں کے نیچے سپرٹ لمپ ہیں۔ آگ جلنے کے دس منٹ بعد کیتلی میں جب پانی اُبلنے لگا تو کارکن نے اس کے اردگرد رکھی ہوئی تمام پلیٹوں میں رکھا ہُوا مختلف اقسام کا گوشت کیتلی میں ڈال دیا۔ اس کے بعد ایک درجن انڈے توڑ کر اس میں ڈال دیئے اس کے پورے دو منٹ بعد یخنی تیار ہو گئی۔

کارکنوں نے بڑے پیالوں میں کالی مرچ اور نمک چھڑکنے کے بعد کیتلی سے یخنی نکالی اور پیالے ہماری طرف بڑھا دیئے۔ جب ہم نے یہ یخنی پی تو حیرت کی انتہا نہ رہی کہ آج تک اتنا لذیذ کھانا کہیں بھی نصیب نہ ہو سکا تھا اور یہ سارے دورے میں ایک یادگار کھانا تھا۔ ابھی ہم اس یخنی سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ کارکنوں نے اس کیتلی کے اردگرد آٹھ دس پلیٹوں میں مختلف اقسام کی سبزیاں لاکر رکھ دیں اور ان کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا اور یہ سبزیاں بھی جب یخنی کی

طرح پک گئیں تو نہایت لذیذ اور ناقابلِ فراموش ذائقہ ہمارے کام و دہن
میں چھوڑ گئیں۔ آخر میں آئس کریم اور شہد جیسے تربوز سے خاطر مدارت کی گئی۔
اس طرح دس بجے کے قریب کھانا ختم ہوا اور ہم اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر
مہمان خانہ میں واپس آئے۔ میں نے مجاہد صاحب سے مختصر گپ شپ لگائی
چونکہ ہمارا آج کا دن خاصا مصروف گزرا تھا۔ ہم کافی تھک چکے تھے لہٰذا جلدی سو
گئے۔

۲۹-۵-۷۶ صبح آٹھ بجے حسبِ دستور سیر کرنے کے بعد ناشتہ کیا۔ دس بجے ہمارا قافلہ زراعت کی نمائش دیکھنے کے لئے روانہ ہوا۔ اس قافلہ میں بھی صوبائی وزراء، ممبران اسمبلی، پارٹی عہدہ دار اور دوسرے اراکین شامل تھے ہمارا قافلہ صبح دس بجے نمائش ہال پہنچا۔ یہ ہال بھی پیپلز ہال اور چین کی دوسری جدید عمارتوں کی طرح ۱۹۵۸ء میں بنا تھا اور زراعت کے شعبے کی نمائش کے لئے وقف کر دیا گیا۔ نمائش کے ڈائریکٹر جو مقامی انقلابی کمیٹی کے چیئرمین بھی ہیں، بڑے دروازے پر ہمارا استقبال کرنے کے لئے موجود تھے۔ وہ ہمیں ہال کے اندر لے گئے۔ پہلے کمرے میں چیئرمین ماؤ کی بڑی بڑی تصویریں آویزاں تھیں اور ان کے اقوال دیواروں پر جلی حروف میں لکھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد ہمیں ہال کے مختلف حصوں سے متعارف کرایا گیا۔ اس ہال میں ہماری توجہ کا مرکز چین کا مشہور ماڈل "تاچئی" تھا۔ یہ فارم بے شمار افراد نے دیکھا ہے مگر مختصر قیام کی وجہ سے ہم اسے بہ چشم خود نہ دیکھ سکے۔ تاہم زرعی نمائش میں اس کا ماڈل تھا جس سے ہمیں فارم کی تفصیلات بتائی گئیں۔ ان تفصیلات کے مطابق یہ فارم صرف ۵۶ ہکٹر یعنی ۱۴۰ ایکڑ کا ہے۔ اس کا رقبہ دو مربعہ کلومیٹر ہے۔ یہاں پر ۸۳ خاندان اور چار سو پچاس چینی رہتے ہیں۔ واضح رہے کہ ہم نے گذشتہ روز جو کمیون دیکھا تھا اس کا رقبہ ۹۰ ہزار ایکڑ تھا اور وہ بہت بڑا بلدیاتی زرعی یونٹ ہے اور تاچئی اس کے مقابلہ میں چھوٹا کمیون ہے۔ مگر یہ کمیون پہاڑی علاقے پر واقع ہے۔ انقلاب سے پہلے یہاں کے لوگ بھوک سے مرتے تھے اور یہاں کچھ کاشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انقلاب کے بعد خود کفالت اور اپنی مدد آپ کی بنیاد پر اس کمیون میں اتنی انقلابی تبدیلیاں آئیں کہ چین میں یہ سب سے زیادہ قابلِ تعریف فارم ہے چیئرمین ماؤ کا ایک معقولہ ہے "تاچئی جاؤ اور تاچئی سے سیکھو" چین کے وسیع و عریض

ملک میں سینکڑوں ہزاروں چھوٹے بڑے کمیون یعنی زرعی آبادی کے یونٹوں نے تاچیٔی کے عظیم انسانوں کی کوششوں کو مشعل راہ بنایا یہ کمیون سطح سمندر سے ایک ہزار میٹر یعنی تقریباً ۳۱۲۵ فٹ اونچائی پر واقع ہے۔ انقلاب سے پہلے ایک سو چالیس ایکڑ زمین کے چار ہزار سات سو چھوٹے چھوٹے قطعات تھے انقلاب کے بعد ایک ہزار پانچ سو بڑے قطعات بنا دیئے گئے ہیں۔ ۱۹۵۸ء سے پہلے دس سال کے عرصہ میں نو سال خشک سالی کے تھے یہاں پینے تک کا پانی میسر نہیں آتا تھا۔ مگر اب اس کمیون میں پانی کا اتنا ذخیرہ ہے کہ اگر خشک سالی آجائے تو کمیون کی پیداوار میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ موسم کے منفی اثرات پر مکمل قابو پا لیا گیا ہے۔ اسی۸۰ فی صد زمین بالکل ہموار اور قابلِ کاشت بنا دی گئی ہے۔ اس فارم کا ۷۰ فیصد رقبہ زرعی مشینری سے کاشت کیا جاتا ہے۔ انقلاب سے پہلے یہاں کے لوگ غاروں میں رہتے تھے، اب یہاں ہر فرد کے پاس رہنے کو مکان ہے۔ اوسطاً ہر فرد کو ڈیڑھ کمرہ ملا ہوا ہے۔ ہر گھر میں اضافی گندم اور خوراک موجود ہے۔ گندم کی پیداوار ۱۹۵۵ء کے مقابلے میں پونا ٹن ہیکٹر سے آٹھ ٹن فی ہیکٹر تک بڑھ گئی ہے۔ فصل کو سیراب کرنے کے لئے بارش کا پانی پہاڑی کے درمیان بڑے بڑے گڑھوں، تالابوں اور کھڈوں میں محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ ان تالابوں سے نہریں اور چھوٹی نالیاں نکال کر آبپاشی کا ایک مؤثر نظام بنایا گیا ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اس فارم کے کھیت پہاڑی کی ڈھلوانوں پر ہیں تاہم نہریں اور نالیاں اس انداز سے بنائی گئی ہیں کہ تمام قطعات کو پانی آسانی سے جا سکتا ہے۔ فارم کی مختلف جگہوں کو ایک دوسرے سے ملانے کے لئے نیم پختہ اور کچی سڑکیں بنائی گئی ہیں یہاں تک کہ ڈھلوانوں پر واقع پلاٹوں کو کاشت کرنے کے لئے بھی چھوٹی سڑکیں اور راستے بنائے گئے ہیں۔ یہاں خشک سالی آتی رہی ہے۔ ۱۹۷۳ء میں خاص طور پر شدید ترین

خشک سالی آئی تھی مگر تالابوں میں جمع شدہ پانی کی وجہ سے خشک سالی پر قابو پا لیا گیا اور فصل کی پیداوار میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ تصویروں میں یہ دکھایا گیا ہے کہ خشک سالی کے دوران لوگ دور دراز علاقوں سے مٹکوں اور تانبے کے برتنوں میں پانی بھر کر لا رہے ہیں اور کھیتوں کو دے رہے ہیں۔ اکثر پانی کی کمی ان تالابوں سے پوری کی جاتی ہے مگر کہیں کہیں بجلی سے چلنے والے کنوئیں اور ٹیوب ویل بھی ہیں جن سے پانی کی کمی پوری کی جاتی ہے۔ فارم پر بجلی بہت عرصہ پہلے سے آچکی ہے۔ پرائمری سکول اور ہائی سکول اور ایک ڈسپنسری بھی یہاں موجود ہے۔ ابتدائی ایّام میں حکومت نے ٹریکٹر، مشینری اور دوسری سہولتیں مہیّا کی تھیں مگر اس وقت یہ فارم مکمل طور پر خود کفیل ہے اور کوئی چیز بھی حکومت سے نہیں منگوائی جاتی۔ تاچیئی کمیون کے اراکین حکومت کو پانی بجلی کے معمولی سے خرچہ کے علاوہ کچھ ادا نہیں کرتے بلکہ خشک سالی اور دوسرے حالات میں حکومت اس کمیون کی مدد کرتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ اس کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اس کمیون کا نام "تاچیئی" گاؤں کے نام پر ہے یہاں کے لوگوں نے جس جرأت و بہادری سے کام کیا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بڑے بڑے زرعی فارموں کا تعارف کرانے سے پہلے "تاچیئی" کا نام ضرور لیا جاتا ہے چین میں ایک اتنے بڑے فارم جسمیں ۱۸ مواضع ہیں، وہاں تاچیئی کو مثال بنا کر کام شروع کیا گیا۔ یہ بڑا زرعی فارم مغرب کے پہاڑی علاقے سے مشرق کے میدانی علاقے تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں کی آبادی ۱۶ لاکھ ہے اور ۶ لاکھ ہیکٹر یعنی ۱۵ لاکھ ایکڑ زمین کا رقبہ قابلِ کاشت ہے۔ اس کے پانی جمع کرنے کے ذخیرے یا تالاب ۱۶۲ ہیں۔ زیادہ تر یہ تالاب مقامی لوگوں نے بنائے ہیں۔ کہیں کہیں صوبائی اور مرکزی حکومت نے انکا ہاتھ بٹایا ہے۔ اس میں ۳۲ ہزار نالیاں ہیں، ۱۰ ہزار بجلی سے چلنے والے کنوئیں ہیں جن کی اوسط گہرائی ۱۵۰ میٹر یعنی ۴۷۰ فٹ ہے۔ تالابوں سے پانی حاصل کرنے کا انتظام

اس سے الگ ہے۔ ان کی نالیوں سے ۸۰ فیصدی زمین براہِ راست سیراب کی جاتی ہے اور باقی زمین کو زرعی مشینری سے سیراب کیا جاتا ہے۔ اس علاقہ میں کپاس اور گندم کاشت کی جاتی ہے۔ کمیون کے کارخانے بھی اپنے ہیں۔ یہاں گندم کی اوسط پیداوار ساڑھے چھ ٹن فی ہکٹر یعنی تقریباً ۳۵ من فی ایکڑ ہے یہاں مکئی بھی کاشت کی جاتی ہے۔ کپاس کی اوسط پیداوار سات ہزار کلو فی ہکٹر ہے ایک کلو ایک سیر ایک چھٹانک ہے اور ایک ہکٹر اڑھائی ایکڑ کے برابر ہے اس طرح اس کی فی ایکڑ پیداوار ۷۰ من ہے۔ اس کے بعد "یوشو" کمیون کے بارے میں تفصیلات بتائی گئیں۔ اس میں ۲۸ مواضعات ہیں۔ اس کی آبادی دس لاکھ کے قریب ہے۔ اس کی زمین ساڑھے پینتالیس لاکھ میو ہے۔ ایک میو ۱۶ مرلے کے برابر ہے یعنی ۴ لاکھ ۵۰ ہزار ایکڑ ہے۔ یہ زمین اچھی نہیں ہے۔ اس واسطے یہاں سال میں صرف ایک فصل مکئی یا گندم کاشت کی جاتی ہے۔ گندم کی اوسط پیداوار دوسرے کمیونوں سے نسبتاً کم ہے اور چالیس من فی ایکڑ تک ہے پچھلے چند سالوں میں یہاں پانی کے بے شمار ذخیرے یا تالاب بنائے گئے ہیں ان میں چار بڑے تالاب اور ایک سو اسی ۱۸۰ پانی نکالنے کے پمپ ہیں کھیت ہموار کئے گئے ہیں۔ جنگلات وغیرہ بھی اُگائے گئے ہیں۔

چین کے مشرقی علاقوں میں زمین اوتھلی ہے۔ انقلاب سے پہلے یہ زمین سیم زدہ تھی۔ ہر سال سیلاب بھی تباہیاں پھیلا جاتا تھا۔ انقلاب کے بعد ایک بڑی نہر کھودی گئی اور پانی کا ذخیرہ کرنے کے تالاب کا بند تعمیر کر دیا گیا۔ سیلاب کے پانی کی گذرگاہیں تبدیل کر کے تالاب اور بند کی طرف موڑ دی گئیں جس کی وجہ سے علاقہ سیلاب جیسی آفت سے بچ گیا اور ۲۶ ہزار ہکٹر یعنی ۶۵ ہزار ایکڑ زمین زیرِ کاشت لائی گئی۔ چھ ہزار ہکٹر یعنی ۱۵ ہزار ایکڑ زمین میں پانی کے تالاب اور بند تعمیر کئے گئے۔ اس طرح سیلاب کو روک دیا گیا اور اس کی تباہ کاریوں سے نجات مل گئی۔ اس سے قبل چار ہزار ہکٹر یعنی

دس ہزار ایکڑ زمین ہر وقت سیلاب کے پانی میں ڈوبی رہتی تھی اب یہ زمین کاشت کے قابل بنا دی گئی ہے اور یہ چینی عوام کی بے پناہ کوششوں کا نتیجہ ہے ۱۹۷۴ء میں اس آفت زدہ علاقے سے تین لاکھ ۶۰ ہزار ٹن گیہوں پیدا کیا گیا۔

جب ہم زرعی نمائش دیکھ رہے تھے تو ہال میں گھومتے ہوئے ہمیں مختلف مواضع کے بارے میں ہر سٹال پر موجود نوجوان لڑکیاں تفصیلات سے آگاہ کر رہی تھیں۔ یہ لڑکیاں کمیونسٹ پارٹی کی ممبر تھیں، جن علاقوں کے بارے میں بتا رہی تھیں۔ ان پر انہیں مکمل عبور تھا۔ نمائش دیکھتے ہوئے جب ہم ایک اسٹال پر آئے، یہاں شنگائی کے علاقے کی زراعت کی ترقی کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ واضح رہے کہ ہر سٹال پر بڑی بڑی تصویروں کے علاوہ بجلی کی چھوٹی چھوٹی مشینیں لگی ہوئی تھیں اور بٹن دبا کر ہر علاقے کی تفصیلات، نقشے اور تیر کے نشانوں سے ہمیں بتائی جاتی تھیں۔ شنگائی کے علاقے میں آٹھ (۸) مواضعات شامل ہیں، ان کی آبادی ۲۰ لاکھ افراد پر مشتمل ہے۔ ۱۹۷۴ء میں اس علاقہ کی گندم کی اوسط پیداوار دس ٹن فی ہکٹر ۱۱۲ من فی ایکڑ تھی۔ یہاں سال میں ایک زمین پر تین فصلیں، دو چاول اور ایک گندم کی کاشت کی جاتی ہیں۔ آٹھ مواضع میں سے ۳ میں گندم کی اوسط پیداوار ۱۲ ٹن فی ہکٹر یعنی تقریباً ۱۳۵ من فی ایکڑ تک ہے۔ یہ غالباً ریکارڈ پیداوار ہے۔ چاول کی پہلی کاشت مارچ کے آخر میں کی جاتی ہے جو ۹۰ سے ۱۰۰ دن تک تیار ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اس زمین میں دوسری چاول کی فصل بو دی جاتی ہے، اسے تیار ہونے میں ۱۰۰ دن لگتے ہیں۔ بعد میں اس پر گندم کی فصل کاشت کر دی جاتی ہے۔ یہاں پر چاول کی پیداوار ایک بریگیڈ نے ۱۸ ٹن فی ہکٹر یعنی ۲۰۰ من فی ایکڑ تک بھی حاصل کی ہے۔ جو بلا مبالغہ حیرت انگیز حد تک زیادہ ہے۔

مرکزی چین کے مواضع میں صورتِ حال کچھ کمزور ہے۔ کیونکہ انقلاب سے پہلے یہاں بہت غربت تھی، مسلسل خشک سالی رہتی تھی اور جب دریاؤں میں پانی آتا تھا

تو سیلاب آجاتا تھا اور تمام علاقہ غرق ہو جاتا تھا۔ یہاں ۶۰ فیصد علاقہ پہاڑی تھا اس لئے جب بارشیں ہوتی تھیں اور پانی پہاڑوں سے ہوتا ہوا میدانی علاقے میں داخل ہوتا تھا تو اس کی تیز رفتاری تباہیاں مچا دیتی تھی اور فصلیں ڈوب جاتی تھیں ۔ دیہات بھی زیرِ آب آجاتے تھے اور زبردست تباہی مچ جاتی تھی۔ انقلاب کے بعد تین دریاؤں کے راستے موڑ دیئے گئے اور انکی بپھرتی طوفانی لہروں کو مکمل طور پر قابو میں کر لیا گیا اس کارنامے کو سرانجام دینے کے لئے ڈیڑھ لاکھ جیالے کارکن قرب و جوار کے علاقوں سے اکٹھے ہوئے اور پہاڑوں کو کاٹ کر دریاؤں کے رُخ کو تبدیل کر دیا گیا۔ ان دریاؤں سے درجنوں نہریں نکالی گئیں اور ان کے پانی کو کھیتی باڑی کے لئے استعمال کیا گیا۔ یہاں پر تصویروں اور سلائڈز کے ذریعے اس علاقے کا انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد کا منظر دکھایا گیا۔ ان تصویروں میں پہاڑوں کو کاٹتے مزدور، دریاؤں کا رُخ بدلنے اور نہریں کھودنے کے مناظر دکھائے گئے۔ اب اس علاقے میں دریاؤں کے پانی کو جمع کرنے کے لئے ڈیم بنا دیئے گئے ہیں۔ اور اس پانی سے بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ یہاں پر سات لاکھ دس ہزار چینی کسان نہایت خوشحال زندگی گزار رہے ہیں یہ آبادی اکیس چھوٹے بڑے کمیونوں پر مشتمل ہے۔ یہاں تین ہزار ہیکٹر پہاڑی زمین کو بھی ہموار زرعی زمین کی طرح بنا دیا گیا ہے۔ زراعت کے علاوہ یہاں چھوٹے بڑے کارخانے بھی قائم ہو چکے ہیں۔

اس وقت تک ہم نمائش کے اس حصّہ میں گھوم پھر رہے تھے جہاں چین کی زراعت کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔ اب تھوڑی دیر کے لئے چیئرمین انقلابی کمیٹی ہمیں استقبالیہ کمرے میں لے گئے۔ یہاں چائے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہمیں سوالات پوچھنے کی دعوت بھی دی۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ کمیون میں برگیڈ اور پیداواری ٹیمیں انتخاب سے چُنی جاتی ہیں تین سال

کے لئے نمائندے منتخب کئے جاتے ہیں۔ اگر برگیڈ کے نمائندے نااہلی یا بدعنوانی کا ارتکاب کریں تو عوام کے ووٹ سے ان کو اتارا جاسکتا ہے ان کی جگہ نیا نمائندہ منتخب کر لیا جاتا ہے۔ ویسے ایسا کرنے کی بہت کم نوبت آتی ہے۔ کیونکہ نمائندوں کو ہٹانے کی بجائے سمجھا بجھا کر راہ راست پر لایا جاتا ہے۔

برگیڈ اور پیداواری ٹیموں کے نمائندوں سے کیمون کے نمائندے چنے جاتے ہیں۔ کیمون سے اوپر مواضعات یا ضلعوں کے نمائندوں کا چناؤ ہوتا ہے۔ ایک دوسرے سوال کے جواب میں چیئرمین انقلابی کمیٹی نے اپنے اختیارات کے بارے میں بتایا کہ "چیئرمین کیمون کے ماتحت کئی انقلابی کمیٹیاں کام کرتی ہیں اور ان کی کارکردگی اجتماعی فیصلوں پر مبنی ہے یعنی ان کے انتظامی امور کے بارے میں فیصلے اجتماعی طور پر کئے جاتے ہیں۔ کیمون کمیٹی کمیونسٹ پارٹی کے تابع ہوتی ہے۔ کیونکہ پارٹی کو سب سے اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ عام طور پر انقلابی کمیٹی کا چیئرمین کیمون کا سربراہ بھی ہوتا ہے۔ انقلابی کمیٹی کا ہر ممبر پارٹی کا ممبر بھی ہوتا ہے اور اس کے لئے لازمی ہے کہ وہ پارٹی لائن کو سمجھنے اور اس پر عمل درآمد کرانے میں مکمل مہارت رکھتا ہو"۔ ایک اور سوال کے جواب میں کہ "سوشلسٹ چین میں ہر فرد پارٹی کا ممبر کیوں نہیں"۔ چیئرمین انقلابی کمیٹی نے بتایا کیونکہ سوشلسٹ معاشرہ میں بھی ابھی ذہناً طبقات موجود ہیں اس لئے ہر فرد کو پارٹی کا ممبر نہیں بنایا جاسکتا۔

تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد ہم نمائش کے دوسرے حصے کو دیکھنے گئے اس حصے میں چین کے آبپاشی نظام اور پانی ذخیرہ کرنے کی تفصیلات بتائی گئیں۔ آبپاشی کے نظام سے متعارف کراتے ہوئے ترجمان نے بتایا کہ چین کی ترقی اور خوشحالی میں پانی کے وسائل کو صحیح طریقے سے استعمال کرنے کا بڑا ہاتھ ہے۔ انہوں نے بتایا کہ چین پانی کے ذخائر سے مالا مال ہے۔ مگر قدیم زمانے میں ان ذخائر کو صحیح طور پر استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔

تاہم چینی محنت کشوں نے ہمیشہ جد وجہد کی ہے۔ سب سے پہلے نہریں مختلف صوبوں میں دو ہزار سال پہلے کھودی گئیں۔ انقلاب کے بعد کمیونسٹ پارٹی اور چیرمین ماؤ نے پانی کو ذخیرہ کرنے پر زبردست توجہ دی اور کئی مقامات پر چیئرمین ماؤ نے تالابوں اور پانی کے ذخیروں کے مراکز کی تعمیر میں خود حصہ لیا اور موقعہ پر ہدایات دیں۔ اس وقت چین میں سات ہزار چھوٹے بڑے پانی کے ذخیروں کے تالاب تعمیر کئے جا چکے ہیں۔ اور ۱۵ لاکھ بجلی کے ٹیوب ویل کام کر رہے ہیں۔ ایک لاکھ ۳۰ ہزار کلومیٹر یعنی ۸۰ ہزار میل لمبے بند دریاؤں، ندی نالوں اور پانی کے ڈیموں پر باندھے جا چکے ہیں۔ اس کے علاوہ سات سو دریاؤں کو بند باندھ کر پالتو جانوروں کی طرح مطیع بنا دیا گیا ہے یعنی ان کی خونیں اور طوفانی لہروں پر نہ صرف مکمل طور پر قابو پا لیا گیا ہے بلکہ ان کے پانی کو زراعت کے لئے استعمال میں لانے کی کامیاب کوششیں کی گئی ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان دریاؤں پر کنٹرول کی وجہ سے سیلاب، خشک سالی اور دوسری آفات کی مضر رسانی ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ جس کے نتیجے میں سالہا سال سے کوئی سیلاب نہیں آیا۔ اب یہاں نہایت کامیاب فصلیں اُگائی جا رہی ہیں۔ چیر مین انقلابی کمیٹی نے بتایا کہ آبپاشی کے اس وسیع و عریض نظام کو قائم کرنے کے لئے ستر لاکھ کلومیٹر چھوٹی بڑی نہریں نکالی جا چکی ہیں یہ نہریں اونچے پہاڑوں پر بھی کھودی گئی ہیں جن کے ذریعے پگھلی ہوئی برف اور چشموں کا پانی کمیون تک لے جایا گیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ صرف ثقافتی انقلاب کے دوران سات ہزار پانی کے کھالے اور نالیاں کھودی گئیں اس دوران "سرخ پرچم" نہر بھی کھودی گئی جس کی لمبائی پندرہ ہزار کلومیٹر یعنی ۹½ ہزار میل ہے۔ ان انقلابی تبدیلیوں سے چین کا زرعی نظام یکسر تبدیل کیا جا چکا ہے۔ عوامی کمیون، اپنی مدد آپ اور خود انحصاری کے اصولوں کی بنیاد پر چین میں قابلِ کاشت زمین میں پچاس فیصدی اور گندم کی اوسط پیداوار میں دس فیصدی اضافہ ہوا ہے۔ صرف

پیکنگ کے گردونواح میں پانی کے ذخیرے کے تالاب اور بجلی کے ٹیوب ویلوں کی تعداد میں انقلاب کے بعد زبردست اضافہ ہوا۔ اس سے پہلے ٹیوب ویل نہ ہونے کے برابر تھے۔ شہر کے اردگرد دو بڑے پانی کے تالاب بنائے گئے ہیں تاکہ شہر کی پانی کی ضروریات پوری کرنے کے ساتھ گردونواح کی زرعی ضروریات کے لئے بھی پانی فراہم کیا جا سکے۔ ان بڑے دو تالابوں کی تعمیر میں خود چیئرمین ماؤ نے حصہ لیا اور موقع پر ہدایات دیں۔"

ایک سوال کے جواب میں چیئرمین انقلابی کمیٹی نے بتایا کہ چین میں لفٹ آبپاشی کا کوئی نظام نہیں ہے۔ ایک اور ضلع کی مثال دیتے ہوئے چیئرمین انقلابی کمیٹی نے تیر کے نشانات سے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ اس علاقے کی زمین میدانی نہیں تھی۔ یہاں تمام پہاڑیاں تھیں مگر عوام نے بے پناہ انقلابی جذبے کا ثبوت دیتے ہوئے تمام پہاڑیوں کو ہموار کر کے میدانی علاقے میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس علاقے کی سابقہ اور موجودہ کیفیت بھی تصویروں اور چارٹ کے ذریعے سمجھائی گئی۔ یہاں ہزاروں کی تعداد میں کسان مزدور پہاڑوں کو گراتے ہوئے اور زمین کو ہموار کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ زمین کی ہمواری کے بعد عوام نے ٹیوب ویل، بڑے بڑے تالاب اور نہریں کھودیں۔ دریاؤں کے رخ کو بھی تبدیل کر دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں گندم اور زراعت کی دوسری اجناس میں بے پناہ اضافہ ہوا اور وافر تعداد میں گندم قریب کے علاقوں کو فروخت کی جانے لگی۔ جب کہ انقلاب سے پہلے یہاں کے لوگوں کو خوراک بھی میسر نہیں آتی تھی اور انہیں کئی کئی روز فاقہ کرنا پڑتا تھا۔

چیانگ چو پمپ سٹیشن

دریاؤں کے قدرتی رخ موڑنے، بڑے بڑے پانی کے ذخیروں کے تالاب بنانے اور نہروں اور ندی نالوں کا جال بچھانے کے علاوہ چین میں مختلف جگہوں پر بڑے بڑے

پمپ سٹیشن قائم کئے گئے ہیں" چیانگ ٹو کا پمپ سٹیشن ان میں سے ایک ہے ۔ ثقافتی انقلاب کے دوران دریاؤں کے پانی کا رُخ بدلنے اور پانی کو زراعت کے لئے استعمال کرنے اور جہاز رانی کے نظام کو بہتر بنانے کے لئے ایسے بڑے بڑے پمپ سٹیشن بنائے گئے ہیں ۔" چیانگ ٹو" پمپ سٹیشن سے دس لاکھ ہکٹر یعنی ۲۵ لاکھ ایکڑ زمین کو سیراب کیا جاتا ہے ۔ اس کے پانی کے نکاس کا نظام تین ہزار مربع میٹر میں پھیلا ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ اس سے مقامی ضروریات کے لئے تین ہزار کلو واٹ بجلی بھی پیدا کی جاتی ہے ۔ اس پمپ سٹیشن کے علاوہ بے شمار بڑے بڑے ڈیم اور بیراج ہیں جو پانی سے بڑھ کر ملکی ضروریات پوری کرنے کے لئے بجلی پیدا کرتے ہیں یہ ڈیم اور بیراج بھی تصویروں، چارٹ اور بجلی کے تیر کے نشانوں سے ہمیں دکھائے گئے ۔ اس کے بعد نمائش کا دور ختم ہوا ۔ ہمارے بہت سے ساتھی زرعی نمائش سے اتنے متاثر تھے کہ وہ بے شمار سوالات پوچھنے کے لئے تیاری کر رہے تھے کہ ہمارے وفد کے ایک سینئر رکن بار بار یہی کہے جا رہے تھے " ہم نے سب کچھ سمجھ لیا ہے" ۔ یہ رکن دوسرے مقامات پر بھی ایسے رویے کا مظاہرہ کرتے رہے تھے غالباً ان کی سمجھ میں سب کچھ آگیا ہوگا ۔ مگر چین کے وسیع و عریض ملک اور تمام دنیا میں ایک سورج کی طرح نشانِ منزل بن جانے والے چین کے بارے میں ہمارے ذہن میں ہزاروں سوالات ابھی کلبلا رہے تھے لیکن انکی شانِ بے نیازی نے ہمیں نمائش سے باہر آنے پر مجبور کر دیا ۔ ہم بادلِ نخواستہ باہر آئے اور اپنی گاڑیوں میں بیٹھ گئے ۔ ہمارا قافلہ مہمان خانوں کی جانب رواں ہوا میرے ذہن میں عظیم چین کے زرعی نظام کی کامیابی حیرت انگیز ترقی اور خود کفالت کے بارے میں بہت سی جھلکیاں تیر رہی تھیں میں سوچ رہا تھا کہ وہ چینی جن کو افیونی اور کاہل کہا جاتا تھا آج سوشلسٹ نظام کے بعد اوجِ ثریا کو چھونے لگے ہیں تمام قوم ایک آہنی عزم کی مالک بن گئی ہے اور جاگیرداریاں ختم کر کے یہاں اجتماعی کھیتی باڑی

کے تحت سائنسی اصولوں کے تابع جو گراں قدر کارنامے سرانجام دیئے گئے ہیں اور جتنے کم عرصہ میں دیئے گئے ہیں واقعی عقل انکو دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے تباہیاں مچاتے ہوئے سرکش دریاؤں کو جس جرأت تدبّر اور مشترکہ کوششوں سے نکیل ڈال دی گئی ہے اور زحمت کو عوام کے لئے رحمت بنا دیا گیا ہے۔ لامحالہ تاریخ میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ میرے ذہن میں ایک ہی جملہ بار بار گردش کر رہا تھا "چین اور چینی عوام عظیم ہی نہیں بلکہ عظیم تر ہیں اور ماؤ کی قیادت میں یہاں خوشیوں، مسرتوں اور سکون کی سنہری کرنیں ہر وادی میں روشن ہو چکی ہیں اور نحوست کے اندھیرے اس دھرتی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکے ہیں"۔ چین کی عظمت کے بارے میں میرے خیالات میں فکر کی قندیلیں جل رہی تھیں کہ اچانک ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ گاڑی رکی۔ راستے میں وفد کے ایک سینئر رکن فرینڈشپ سٹور میں جلدی سے داخل ہو گئے اور خریداری کرنے لگے۔ یہ وہی صاحب تھے جو زرعی نمائش میں "ہم سب کچھ سمجھ گئے ہیں" کا جملہ دہراتے نہیں تھکتے تھے۔ خیر یہ خریداری کے "انقلابی کام" میں مگن ہوئے اور ہم مہمان خانہ میں ایک بجے کے قریب کھانا کھانے کے لئے ڈائننگ ہال میں چلے گئے۔ کھانے کے کمرے میں سارے دوست جمع تھے ہم جس میز پر بیٹھے تھے وہاں شیخ رشید، مسٹر اور بیگم حفیظ پیرزادہ کے علاوہ انقلابی شخصیت محمد بخش مجاہد بھی بیٹھے تھے کہ پیرزادہ صاحب اور شیخ رشید صاحب کے درمیان بوسکی کی قمیضوں کی خریداری سے متعلق خوشگوار نوک جھونک ہوئی۔ مجاہد صاحب نے موقع غنیمت جانتے ہوئے بلوچستان کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا رونا، رونا شروع کر دیا۔ یہ دلچسپ گفتگو جاری تھی کہ کھانے کے دوران شیخ محمد رشید نے اصرار کیا کہ انہیں "فرینڈشپ سٹور" سے چند چیزیں خریدنی ہیں لہٰذا میں ان کے ساتھ جاؤں۔ چنانچہ کھانا کھانے کے بعد ہم بھی فرینڈشپ سٹور گئے۔ یہاں شیخ صاحب نے چند ایک ریشمی کپڑے خریدے

اور اس کے ساتھ ایک اعلیٰ کوالٹی کا چینی خوبصورت پانچ فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا قالین تین سو پچاس روپے میں خریدا۔ اگرچہ اس وقت سٹور میں وفد کے تمام اراکین خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اگلے روز ملک واپس آجانا تھا اور وفد کے خوشحال اراکین اس نازک موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی تاک میں تھے اور بھاری اور قیمتی خریداریاں ہو رہی تھیں۔ میں دوسرے اراکین کی طرف خاص توجہ نہ دے سکا کیونکہ میں شیخ صاحب کو خریداری کے لئے یہاں لایا تھا۔ اور پھر میری زیادہ تر دلچسپی کا مرکز شیخ صاحب کا وہ قالین تھا جو انہوں نے خریدا تھا۔ ہم اس سٹور سے فارغ ہو کر کوئی اڑھائی بجے مہمان خانہ میں واپس آئے تھوڑی دیر آرام کیا اور تین بجے کے قریب ہوائی حملے سے بچاؤ کی زمین دوز سرنگیں دیکھنے چلے گئے۔

ہوائی حملے سے بچاؤ کی زمین دوز سرنگیں

ہمارا قافلہ پیکنگ شہر کی بڑی بڑی شاہراہوں سے گزرتا ہوا اندرونِ شہر داخل ہوا۔ شہر کے اس حصے کی سڑکیں کافی کشادہ اور صاف ستھری تھیں مگر آس پاس کے ماحول سے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ہم پرانی آبادی کے علاقوں میں گھوم رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ہماری گاڑیاں سڑک سے ہٹ کر ایک ریلوے سٹیشن نما احاطے کے پاس رکیں ہم کاروں سے اترے تو ایک چھوٹے سے دروازے کی پچھلی طرف ایک چھوٹی سی گلی میں ہمیں لے جایا گیا۔ اس گلی سے ہم ایک دوکان میں داخل ہوئے۔ یہ دوکان ریڈی میڈ کپڑوں کی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ ہمارے قافلے کے کچھ دوست دوکان میں خریداری کے شوق سے داخل ہوئے ہیں مگر جونہی ہم دوکان میں داخل ہوئے تو گائیڈ نے دوکاندار سے چینی زبان میں کچھ کہا۔ اس دوکاندار نے پردے کے پیچھے لگے ہوا ایک بجلی کا بٹن دبایا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے دوکان کے فرش کا ایک بہت بڑا حصہ زمین کے اندر دھنس گیا اور اس راستے سے زمین دوز

سیڑھیاں نظر آنے لگیں۔ ان سیڑھیوں سے ہم کئی فٹ نیچے سرنگ میں اتر گئے۔ یہ سرنگ "تاشان" سٹریٹ کی ہوائی حملے سے بچاؤ کی سرنگ تھی۔ ہمارے قافلے کے دو حصے ہو گئے تھے۔ پہلے حصّے کے ساتھی سرنگ کے اندر جا چکے تھے اور ہمیں گائیڈ کی وساطت سے پوچھنا پڑا کہ ہمارے دوسرے دوست کس سمت میں گئے ہیں۔ ہم جب نیچے اترے تو دیکھا کہ جہاں ہم ہیں اس راستے کے دائیں بائیں آگے پیچھے کئی سرنگیں ہیں جو مختلف سمتوں کو جاتی تھیں۔ یہ سرنگیں تقریباً ۴ فٹ چوڑی اور سات فٹ اونچی تھیں۔ ان میں تمام جدید سہولتیں موجود ہیں۔ بجلی کی ٹیوبیں، میوزک، غسل خانے لٹرین، سٹور، دوکانیں وغیرہ سب کچھ تھا۔ ہم جب سرنگوں میں گھوم پھر رہے تھے تو میوزک بج رہا تھا۔ ہوائی حملے کے دوران شہری آبادی کو ڈر اور خوف سے بچانے کے لئے جو سہولتیں مہیا کی گئی ہیں، میوزک اسی کا حصہ ہے۔ سرنگوں کے اندر کوئی چھ انچ چوڑا پائپ لگا ہوا تھا۔ اس سے تازہ ہوا اندر آ رہی تھی یہ پائپ سرنگ کے اندر آکسیجن اور تازہ ہوا پھیلانے کے لئے لگایا گیا تھا، ہر پچاس ساٹھ فٹ کے فاصلے پر سرنگ سے ذرا ہٹ کر چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے۔ جہاں بیٹھنے کے علاوہ سامان بھی رکھا جا سکتا تھا ہم دو تین سیڑھیوں سے اتر کر دوسری سرنگ کی طرف بھی گئے جس سے یہ پتہ چلا کہ یہ سرنگیں دو تین منزلوں کی بنائی گئی ہیں۔ ہمیں کوئی پون گھنٹہ تک ارد گرد آگے پیچھے پھیلی ہوئی سرنگیں دکھائی گئیں۔ اس کے بعد وفد کے اراکین کو زمین دوز بڑے ہال کمرے میں لایا گیا جہاں پہلے سے کرسیاں، میزیں، چائے، بسکٹ اور پھل سجے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر ان چیزوں سے لطف اندوز ہوئے پھر ہوائی حملے سے بچاؤ کی کمیٹی کے چیئرمین نے بجلی کا بٹن دبایا اور نقشے اور چارٹ سے ہمیں تفصیلات بتائیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہ ہوائی حملے سے بچاؤ کی سرنگیں تاشان کے عوام کی امداد سے اپنی مدد آپ کے تحت، غیر ملکی دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے

لئے ۱۹۶۹ء میں بننی شروع ہوئی تھیں۔ ان سرنگوں کے قریب واقع پچاس دو کانیں، ہوٹل اور دوسرے اداروں سے جو اس گلی میں واقع ہیں، اندر جانے کے راستے ہیں، جیسے ایک راستے کے ذریعے ہم سرنگوں میں داخل ہوئے تھے۔ اگرچہ پچاس دوکانوں کے اندر سے ان سرنگوں میں داخل ہوا جا سکتا ہے۔ مگر بعض دوکانوں، ہوٹلوں، اور بڑے اداروں میں ایک سے زیادہ داخل ہونے کے راستے ہیں اور اس طرح مجموعی طور پر انڈر گراؤنڈ سرنگوں میں ایک دوسری جگہ منتقل ہونے کے لئے ۹۰ راستے ہیں یہ راستے "تاشان لان" گلی کی سرنگوں کے علاوہ پیکنگ شہر کے دوسرے علاقے کی سرنگوں سے بھی ملے ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے شہر کی تمام سرنگیں بذات خود ایک علیحدہ شہر ہیں ہوائی حملے کے وقت چند لمحوں میں عوام اپنی اپنی گلی کے راستوں سے سرنگوں کے اندر داخل ہو سکتے ہیں اور ایک وقت میں چالیس لاکھ عوام آسانی سے سما سکتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر زیادہ لوگ بھی یہاں پناہ لے سکتے ہیں۔ ابھی کچھ علاقوں میں ایسی سرنگیں زیر تعمیر بھی ہیں، ایک سوال کے جواب میں چیئرمین ہوائی حملہ کمیٹی نے بتایا کہ "اگرچہ ان سرنگوں میں جدید سہولتیں مثلاً ٹیلی فون، بجلی، لاؤڈ سپیکر، باورچی خانے، سٹور، غسل خانے اور لٹرین موجود ہیں اور ہنگامی حالات میں کئی دن تک لوگ یہاں پناہ لے سکتے ہیں تاہم ہوائی حملے سے بچاؤ کی سرنگوں کا اصل مقصد ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔ ہوائی حملے کے ختم ہونے کے بعد لازمی ہے کہ لوگ سرنگوں سے باہر نکل کر اپنے اپنے کام کاج میں مصروف ہو جائیں لیکن اگر جنگ کے زمانے میں عوام کو بہت خطرناک ہوائی حملے یا ایٹم بم کے حملے سے بچاؤ کی ضرورت پڑے تو ایسے انتظامات موجود ہیں کہ لوگوں کو ان سرنگوں سے نکال کر شہر سے دور محفوظ مقامات پر پہنچایا جا سکے۔" یہ سرنگیں ایٹمی توانائی کے اثرات سے مکمل طور پر محفوظ ہیں۔ ان سرنگوں کی تعمیر کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے کمیٹی کے چیئرمین نے ہمیں بتایا

کہ "تا شان لان" گلی (یہ ایک علاقے کا نام ہے) کی پینتالیس دو کانوں، ریستوران، اور دوسرے اداروں میں اٹھارہ سو کے قریب شاپ اسسٹنٹ کام کرتے ہیں۔ جن میں اکثریت عورتوں کی ہے۔ ان کارکنوں نے بلامعاوضہ اور اپنے کام کے بعد فارغ وقت میں یہ سرنگیں تعمیر کی ہیں۔ حکومت نے انہیں بھاری مشینری سیمنٹ اور اینٹیں وغیرہ مہیا کیں۔ سرنگوں کا انتظامی کنٹرول "تا شان لان" کے عوام کی مقامی کمیٹی کے پاس ہے۔" میرے ایک سوال کے جواب میں کہ "کیا امن کے زمانے میں بھی ان سرنگوں کو پیداواری مقاصد کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے"، چیئرمین کمیٹی نے بتایا کہ "یہ سرنگیں دوہرے مقصد کے لئے بنائی گئی ہیں۔ یہاں کی ورکشاپس، چھوٹی فیکٹریاں اور سٹور استعمال میں لائے جاسکتے ہیں اور اس وقت بھی اس گلی کی تمام دکانوں اور زمین دوز سرنگوں کو سٹور یا دوسرے سودمند مقاصد کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے۔" ایک اور سوال کے جواب میں چیئرمین کمیٹی نے ہمیں بتایا کہ "ان سرنگوں کے اندر کا نظام جس میں بجلی، ٹیلی فون، تازہ ہوا، پانی اور دوسری تمام سہولتیں شامل ہیں، خود کفالت کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔ جنگ کے زمانہ میں اگر شہر کا نظام معطل ہو جائے تو زمین دوز سرنگوں کا نظام کام کرتا رہے گا۔" ایک اور سوال کے جواب میں کہ "ہوائی حملے کے دوران لوگوں میں بھگدڑ مچ جائے تو ان سرنگوں کے چند دروازوں سے داخل ہونے کی صورت میں کیا حفاظتی تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔" چیئرمین انقلابی کمیٹی نے بتایا کہ "اس مقصد کے لئے عوام کی تنظیم کے ذریعے تربیت کی گئی ہے اور ہر گلی محلہ میں عوام کے ایسے سِل موجود ہیں جو ہوائی حملہ سے بچاؤ کے بارے میں لوگوں کی تربیت کرتے ہیں اور ریہرسل کراتے ہیں لہذا بھگدڑ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" یہ سرنگیں دیکھتے ہمیں شام کے تقریباً پانچ بج گئے اور ہم جس دکان سے اندر داخل ہوئے تھے اسی سے باہر نکل کر اپنی گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔

ہمارے قافلے کے لوگ اب مختلف سمتوں میں اپنی دلچسپی کی چیزیں دیکھنے چلے گئے مگر سات بجے تک فارغ ہو گئے کیونکہ وزیرِ اعظم پاکستان کا واپسی کھانا وزیرِ اعظم چین کے اعزاز میں دیا جانا تھا۔ میرے ساتھ حنیف نارو اور محمد بخش صاحب تھے ہم کئی روز سے اپنے گائیڈ سے کہہ رہے تھے کہ وہ ہمیں پیکنگ شہر میں آزادانہ گھومنے کا موقع فراہم کریں تاکہ معاشرتی زندگی کو قریب سے دیکھ سکیں۔ ہم اپنے گائیڈ کی معیت میں باقی لوگوں سے علیحدہ ہو کر شہر کے مختلف علاقوں میں گئے۔ یہاں ہم نے سبزی گوشت اور دوسری معمولی نوعیت کی دوکانیں دیکھیں۔ سبزیاں بہت سستی تھیں۔ گوشت دس روپے سیر تھا۔ مچھلی بھی کافی سستی تھی اور چینی عوام ہماری طرح خرید و فروخت کر رہے تھے۔ یہاں سے ہم پیکنگ کے بڑے ریلوے سٹیشن کو دیکھنے گئے۔ ہمیں اشتیاق تھا کہ پیکنگ میں جو زمین دوز ریلوے لائن بن رہی تھی اس کی بھی ایک جھلک دیکھی جائے۔ یہ ریلوے لائن ابھی ادھوری ہے۔ ہم نے دو ایک سٹیشنوں پر زمین دوز لائن کو تعمیر ہوتے دیکھا۔ گائیڈ نے بتایا کہ یہ ریلوے لائن جب مکمل ہو جائے گی تو ہوائی حملے سے بچاؤ کی سرنگوں کی طرح زمین دوز شہر کا حصہ بن جائے گی۔ ہنگامی حالات میں عوام کے تحفظ کے لئے استعمال کی جا سکے گی۔ پیکنگ میں پرانے شہر میں لاہور شہر کی طرح کے بڑے دروازے بھی ہیں جن کو فنِ تعمیر کے نمونے کی حیثیت سے محفوظ کیا گیا ہے۔ ان دروازوں کے ارد گرد پرانے زمانے کی دیواریں تھیں جو گرا دی گئی ہیں۔ یہ دروازے دو تین منزلے ہیں اور فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ شہر کے مختلف علاقوں میں چکر لگانے کے بعد جب ہم اپنے مہمان خانے کی طرف واپس آ رہے تھے تو میرا ذہن زمین دوز سرنگوں سے متعلق بے شمار سوالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ جب ہم نے پیکنگ شہر کو پہلی نظر دیکھا تھا اور یہاں کے پرانے مکانات اور جدید فلیٹ نظر آئے تھے تو میرا تاثر تھا کہ غالباً چین کے اقتصادی حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ دار الخلافہ

پیکنگ میں پرانے مکانات کو گرا کر جدید مکانات بنائے جائیں. تاہم جب ہم نے زمین دوز سرنگیں دیکھیں اور یہ سنا کہ سارا پیکنگ شہر ہوائی حملے کے وقت ان زمین دوز سرنگوں میں سما سکتا ہے تو ہمیں اپنی اس سوچ پر ہنسی آئی۔ جو ملک اپنے عوام کے دفاع کے لئے اتنا بڑا کارنامہ سرانجام دے سکتا ہے اور عوام کے سیاسی شعور، تنظیم اور اعلیٰ قیادت، علم، ادب، ثقافت، زراعت اور صنعت و دفاع اور خارجہ پالیسی میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے لئے پیکنگ شہر میں جدید عمارتیں بنانا معمولی سی بات ہے۔ وجہ صرف یہ ہے ترجیحات مختلف ہیں سرمایہ داری نظام میں ظاہری طور پر تصنّع کو اہمیت دی جاتی ہے مگر اندرونی طور پر معاشرہ کی بنیادیں نہایت کھوکھلی ہوتی ہیں اور تمام پالیسیاں چند افراد کے فائدے کے لئے بنائی جاتی ہیں جب کہ سوشلسٹ نظام میں قومی اداروں میں استحکام کو ترجیح دی جاتی ہے اور اس میں ملکی دفاع، زرعی اور صنعتی پیداوار اور محنت کشوں کے بنیادی حقوق کا تحفّظ مقدّم سمجھا جاتا ہے۔ چین کی سادگی اس کے اندرونی استحکام اور نظام کی کامیابی کی دلیل ہے۔ ہم چھ بجے اپنے مہمان خانوں میں واپس آئے، تھوڑی دیر آرام کیا اور پارٹی کی وردی پہنی اور سات بجے وزیرِ اعظم بھٹو کی طرف سے وزیرِ اعظم ہواکوفنگ کے اعزاز میں دی جانے والی ضیافت میں جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

ضیافت

جب سوا سات بجے شام ہم پیپلز ہال کے بڑے دروازے سے کھانا کھانے کے لئے داخل ہو رہے تھے تو وزیرِ اعظم بھٹو اور پاکستانی وفد کے اراکین اس وقت چینی رہنماؤں سے مذاکرات ختم کر کے باہر نکل رہے تھے۔ یہاں سے وہ کپڑے بدلنے کے لئے اپنے مہمان خانوں میں چلے گئے۔ ہم استقبالیہ سے اوپر کی منزل پر کھانے کے ہال کمرے میں آئے۔ یہاں ایک کونے میں پاکستانی وفد کے اراکین اور پاکستانی سفارتخانے کے عملے کے علاوہ چین کے طالب علم،

سیاسی کارکن، رہنما کھانے سے پہلے اورنج جوس، کوکاکولا اور دوسرے مشروبات سے دل بہلا رہے تھے۔ یہاں دوستوں سے میں نے کوریا اور چین کے بارے میں مجموعی تاثرات پوچھے۔ لاہور کے ایک صحافی نے کوریا اور چین کی بے پناہ ترقی، خوشحالی اور کامیابیوں کے بارے میں ہم سے بالکل اتفاق نہیں کیا اس کے مقابلے میں انہوں نے جاپان کی ترقی کو سراہا مگر جب اس نظام کی برائیوں کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے موضوع بدل دیا۔ آٹھ بجے کے قریب پراٹوکول کے افسروں نے ہمیں اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ چند لمحوں کے بعد وزیرِ اعظم پاکستان، بیگم بھٹو اور وزیرِ اعظم چین، کھانے کے کمروں میں داخل ہوئے۔ یکدم ہال میں ٹیلی ویژن کی روشنیاں جگمگانے لگیں اور کیمرے حرکت میں آگئے۔ ٹیلی ویژن کے علاوہ ہال میں نصب خوبصورت رنگ برنگی روشنیاں بھی جگمگانے لگیں۔ جب دونوں وزرائے اعظم اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو آرکسٹرا نے پاکستان اور چین کا ترانہ بجایا اور ضیافت کا آغاز ہوا۔

چونکہ یہ ضیافت پاکستان کے وزیرِ اعظم کی طرف سے دی گئی تھی۔ اسمیں پاکستانی اور انگریزی کھانے تھے۔ سب سے پہلے سوپ پیش کیا گیا، پھر سیخ پر بھنے ہوئے دنبے کے تکے اور بھنی ہوئی مچھلی دی گئی اس کے بعد پاکستانی کھانوں میں بریانی، چکن قورما، مٹن قورما، مٹن کڑاہی اور دوسرے لذیز کھانے پیش کئے گئے۔ ان کھانوں میں مقابلتاً مرچیں کم تھیں۔ میرے پاس بیٹھے چینی دوستوں نے گلہ کیا کہ یہ اصل پاکستانی کھانا نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں مرچیں کم ہیں۔ یہ انگریزی کھانوں سے ملتا جلتا ہے۔ کھانے کے آخر میں فرنی، پاکستانی سیب اور کنو دیئے گئے۔ کھانے کی میز پر پاکستانی مہمانوں کے علاوہ چینی میزبانوں میں وزارتِ تعلیم کی اعلیٰ عہدیدار اور ماہرِ تعلیم خاتون بھی بیٹھی تھیں۔ ان کا نام مادام تو پنگ تھا یہ وزارتِ تعلیم کے جنرل آفس میں وائس چیئرمین کے عہدے پر فائز تھیں۔ یہ خاتون گذشتہ سال پاکستان کی وزارتِ تعلیم کے دعوت نامے پر پاکستان تشریف لا چکی تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا "چین نے

انقلاب کے بعد اعلیٰ تعلیمی نظام نافذ کیا ہے اور آپ کو پاکستان جانے کا اتفاق ہوا ہے
پاکستانی تعلیمی نظام اور چین کے نظام کے بارے میں اپنی تجزیاتی رائے دے سکیں
گی"۔ مادام تو پنگ نے فراخ دلی سے تکلف برتتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے دورے
کے دوران چھوٹے بڑے شہروں اور دیہات میں کالج اور سکولوں کو میں نے دیکھا ہے
انہوں نے رائے دی کہ پاکستان تعلیم کے شعبے میں خود انحصاری خود کفالت اور خود
اعتمادی کی بنیاد پر آگے بڑھ رہا ہے"۔

ہماری میز پہ دوسرے چینی میزبان چائنا یونیورسٹی، جسکا ہم پیچھے ذکر کر کے آئے ہیں،
کے طالب علم رہنما جس کا نام جونگ چنگ لنگ ہے بیٹھا تھا۔ یہ طالب علم لیڈر اس
وقت یونیورسٹی میں گریجوئیشن کرنے کے بعد انتظامی شعبے میں لیڈر کے عہدے پر فائز
ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ نوجوان ' طالب علم راہنما نہیں ہے بلکہ یونیورسٹی کے سٹاف میں
طالب علموں کی تنظیم کے سلسلے میں لیڈر کے عہدے پر فائز ہے۔ یعنی وہ طالبعموں
کی تنظیم کی راہنمائی کرتا ہے۔ یہ نوجوان بڑا ذہین اور اعلیٰ قیادت کی صلاحیتوں کا لگتا
تھا۔ میرے بس کی بات نہیں تھی ورنہ میں اس طالب علم کو دعوت دیتا کہ وہ پاکستان
کا دورہ کرے اور ہمارے تعلیمی اداروں میں پاکستانی نوجوانوں کو چین کے سیاسی،
سماجی اور تعلیمی نظام کے بارے میں لکچر دے۔ تاہم میں نے اپنی دلی خواہش
پوری کرنے کے لئے اس نوجوان کو پاکستان آنے کی دعوت دی۔ اس نوجوان
نے بتایا کہ گذشتہ شب اس نے چین کے وزیر تعلیم کی طرف سے پاکستان کے
وزیر تعلیم کے اعزاز میں دیئے گئے عشائیہ میں شرکت کی تھی۔ وہاں وزیر تعلیم پاکستان
نے بتایا کہ ہم پاکستان میں چین کے تعلیمی نظام کو رائج کرنے کے تجربات
کر رہے ہیں۔

ہمارے ساتھ میز پہ تیسرے چینی میزبان مسٹر ین چیاؤ ہوا بیٹھے تھے یہ صاحب

ماہرِ اقتصادیات ہیں اور وزارتِ اقتصادیات میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ ان سے میں نے سوشلسٹ معیشت کے نظام کے مختلف اقتصادی پہلوؤں پر کئی ایک سوالات پوچھے جن کا انہوں نے بڑی تفصیل اور گہرائی سے جواب دیا۔ جب میں نے ان سے تیسری دُنیا کے ممالک اور پاکستان کے اقتصادی مسائل کے بارے میں رائے پُوچھی تو انہوں نے خاموشی اختیار کر لی اور کہا کہ "میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔"

چینی میز بانوں سے ہم نے۔ پاکستان اور چین کی دوستی پر بھی کئی ایک باتیں کیں۔ انہوں نے خاصی گرمجوشی کا اظہار کیا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے ان سے کہا کہ "پاکستان کے عوام چیئرمین ماؤ اور چینی عوام کی بے پناہ عزت کرتے ہیں" ہمارے میز بانوں نے جواباً کہا کہ "چینی عوام بھی بھٹو صاحب اور پاکستانی عوام کا احترام کرتے ہیں"۔ میں نے اپنے میزبان ماہرِ اقتصادیات مسٹر ین چیاؤ ہوا سے جب یہ کہا کہ ہمارے وزیرِ اعظم چین میں کئی مرتبہ آچکے ہیں۔ تو انہوں نے فوراً جواب دیا کہ "وزیرِ اعظم بھٹو نویں مرتبہ چین میں آئے ہیں"۔ ان کی اس حاضر جوابی سے اندازہ ہوا کہ موصوف پاکستان کے اقتصادی اور سیاسی مسائل پر اتنا ہی عبور رکھتے ہوں گے جتنا وہ بھٹو صاحب کے چین کے دوروں کے بارے میں رکھتے ہیں۔

کھانے کے کورس ختم ہونے کے بعد وزیرِ اعظم پاکستان تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے اور اپنے اس غیر ملکی دورے کی سب سے بہترین تقریر کی۔ اس میں انہوں نے تیسری دنیا کے ممالک کے حقوق کے بارے میں پاکستانی مؤقف کی وضاحت کی اور جو سامراجی ممالک نے تیسری دنیا کے غریب ممالک میں لوٹ مچا رکھی ہے اس کی پُرزور مذمت کی اور تیسری دنیا کے ممالک کو اقتصادی کانفرنس بلانے کی دعوتِ فکر دی۔ وزیرِ اعظم بھٹو اپنے دورے

کے دوران پہلے بھی کانفرنس کے بارے میں، تیسری دُنیا کے ممالک کو دعوتِ فکر دے چکے تھے مگر اس تقریر میں انہوں نے تیسری دنیا کے ساتھ ہونے والی معاشی ناانصافیوں کے بارے میں کھل کر بات کی۔ انہوں نے عوامی جمہوریہ کوریا کی حکومت کی طرف سے مشترکہ اعلامیہ میں اس کانفرنس کی حمایت کا بھی ذکر کیا۔ انہوں نے چین اور پاکستان کے تعلقات اور دونوں ملکوں کے عوام کے ایک دوسرے کے بارے میں خلوص اور محبت کا ذکر نہایت جذباتی انداز میں کیا۔ انہوں نے تیسری دنیا کے ممالک، خاص طور پر فلسطینی عوام کے حقوق۔ انگولا، موزمبیق، رہوڈیشیا اور جنوبی افریقہ کے عوام کی آزادی کی تحریکوں کی بھرپور حمایت کی۔ اسرائیل اور اس کی ہمنوا طاقتوں کے وحشیانہ مظالم کا ذکر بھی کیا اور تیسری دنیا کے ممالک کے اتحاد اور یک جہتی پر زور دیا۔ وزیرِ اعظم بھٹو نے پاکستان اور بنگلہ دیش کے خوشگوار تعلقات کا بھی حوالہ دیا۔ پاکستان اور بھارت کے تعلقات میں خوشگوار تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ بھارت کے ساتھ تعلقات صرف اصولوں کی بنیاد پر بہتر ہو سکتے ہیں۔ ان اصولوں میں کشمیری عوام کا حقِ خود ارادیت سرِ فہرست ہے۔

اب چین کے وزیرِ اعظم مسٹر ہواکو فنگ تقریر کرنے کھڑے ہوئے انہوں نے وزیرِ اعظم بھٹو کی تقریر کے جواب میں فلسطین اور دوسرے افریقی عوام کی آزادی کی تحریکوں کی بھرپور حمایت کا اعلان کیا اور جب چین کے وزیرِ اعظم نے یہ کہا کہ چین کی حکومت اور عوام کشمیر کے حقِ خود ارادیت کی مکمل اور پُر زور حمایت کرتے ہیں۔ تو ہال میں موجود پاکستانی اور چینی عوام نے بھرپور لمبی تالیاں بجائیں۔ یہانتک کہ کئی منٹ تک ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔ اس لمحے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کشمیری عوام کے مسئلے پر پاکستانی اور چینی عوام کے دل ایک ساتھ دھڑکتے ہیں۔ وزیرِ اعظم چین جب تقریر کر کے بیٹھے تو ایک مرتبہ پھر ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ انہوں نے

پاکستانی مہمانوں کی میزوں پر پاکستان کے عوام کی خوشحالی اور ترقی کے ٹوسٹ پیش کیا۔ واضح رہے کہ اس سے قبل وزیر اعظم بھٹو اپنی تقریر ختم کرنے کے بعد چینی میزبانوں سے چین کی ترقی اور خوشحالی کے لئے ٹوسٹ پیش کر چکے تھے۔ تقریب کے آخر میں کافی اور پھل پیش کئے گئے۔ اس کے بعد دونوں وزرائے اعظم اٹھ کھڑے ہوئے آرکسٹرا نے ایک مرتبہ پھر دونوں ملکوں کے ترانے بجائے اور تقریباً دس بجکر بیس منٹ پر ہم اپنے کمروں میں آ گئے۔ اپنے کمرے میں واپس آکر ہم نے دیکھا کہ چین کی حکومت کی طرف سے ہمارے کمرے میں پاکستانی دوستوں کے لئے تحائف رکھے ہوئے تھے۔ مجھے ایک خوبصورت میز پوش جس پر کشیدہ کاری کی گئی تھی ملا۔ اس کے ساتھ کھانے کی میز کے چھ رومال اور چین کا خوبصورت گلدان بھی تھا۔ مجاہد صاحب اور میں ابھی اپنے کمرے میں بیٹھے ہی تھے کہ پروٹوکول کے آفیسر نے ہمیں سامان باندھنے کی ہدایت کی۔ کیونکہ صبح آٹھ بجے سے پہلے سامان جانا تھا۔ رات گئے تک ہم اپنا سامان باندھنے میں مصروف رہے اور پھر سو گئے۔

چین کے بارے میں مزید معلومات

اس تصنیف میں صرف وہ واقعات اور معلومات فراہم کی گئی ہیں جن کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور مشاہدہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں جو معلومات چین میں قیام کے دوران میرے علم میں آئی ہیں وہ بھی قارئین کرام کے سامنے پیش کی جا رہی ہیں اس تصنیف کا موضوع تاریخ یا مکمل سیاسی، سماجی، اقتصادی ڈھانچہ پر تحقیق نہیں ہے تاہم قارئین کرام کو کچھ اعداد و شمار جن سے چین کا قریب سے مطالعہ کیا جا سکے بتانا ضروری ہیں۔ ذیل میں چند اہم باتیں تفصیلاً لکھی جاتی ہیں۔

جغرافیائی کیفیت

چین کا رقبہ ۳۶ لاکھ ۵۰ ہزار مربع میل ہے جو سارے یورپ کے برِاعظم کے برابر ہے۔ چین کی آبادی دنیا

کے تمام ممالک سے زیادہ ہے اور یہ تقریباً ۸۰ کروڑ کے برابر ہے، جغرافیائی لحاظ سے چین کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک حصّہ مشرقی چین ہے جہاں میدانی علاقہ اور چھوٹی پہاڑیاں ہیں اور آب و ہوا مقابلتاً خشک مرطوب ہے۔ دوسرے علاقے کو مغربی چین یا وسطی چین کہتے ہیں جو اونچے میدانی اور پہاڑی علاقوں پر مشتمل ہے مشرقی چین گنجان آبادی کا علاقہ ہے اور مغربی چین میں آبادی اتنی گنجان نہیں ہے۔

مشرقی چین روائتی طور پر چھوٹے مالکوں اور کسانوں کا علاقہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس کے چار حصے ہیں پہلے حصے کو پرانے زمانے میں منچوریا کہتے تھے اب شمالی مشرقی چین کہتے ہیں اور یہ علاقہ بہت زرخیز اور سرسبز و شاداب ہے۔ دوسرے حصّے کو "پیلے دریاؤں کا علاقہ" کہتے ہیں۔ اس میدانی علاقے میں دریا اپنی مٹی بہاکر جو ساتھ لاتے ہیں، اس سے خاصا سرسبز اور زرخیز ہو گیا ہے۔ یوں اس کو "دریاؤں کی مٹی کا علاقہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس میں ہُو پائی شان تنگ اور آنھ وپائی کے تین صوبے شامل ہیں۔ تیسرے حصّے میں شان سی اور شنسی کے اونچے میدانی علاقے شامل ہیں۔ اسمیں سخت مٹی کے ٹیلے ہیں جیسے پاکستان میں پوٹھوہار کے علاقے میں واقع ہیں۔ یہ علاقہ کھردری سطح کا ہے۔ دریاؤں میں سیلاب کی وجہ سے سطح ناہموار ہو گئی ہے۔ چوتھا حصّہ جنوبی چین کہلاتا ہے۔ جو چنگ لِنگ پہاڑوں کے جنوب سے شروع ہوتا ہے اور پیلے دریاؤں کے ساتھ ساتھ ہوتا ہوا یانگ سی دریا تک چلا جاتا ہے۔ اس میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے سلسلے موجود ہیں۔ مغربی چین میں قدیم چین کی قومیں رہتی ہیں اس میں دنیا کے بلند ترین پہاڑوں کے سلسلے واقع ہیں۔ اس کو بھی چار حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا حصّہ تبت شنگائی کا پلیٹو کہلاتا ہے۔ یعنی یہ علاقہ سمندر سے اونچا ہے مگر ہموار ہے۔

دوسرا حصہ: اس کو "زی چوآن کی چوٹیوں کا علاقہ" کہتے ہیں۔ جو جنوب مشرق میں پھیلا ہوا ہے اور ہمالیہ کے پہاڑوں کے پہلو تک چلا جاتا ہے۔

تیسرا حصہ: یہ ینگ کنگ کا میدانی علاقہ کہلاتا ہے۔

چوتھے حصے کو صحرائے گوبی کہتے ہیں۔ ملک کے بہت بڑے وسیع ہونے کے سبب اس کی آب و ہوا مختلف علاقوں میں مختلف ہے اور بدلتی رہتی ہے۔ مثلاً جنوبی علاقے میں خاص گرمی پڑتی ہے مگر مون سون کی ہوائیں یہاں بہت بارشیں برساتی ہیں جبکہ شمال اور شمال مغرب کے علاقوں میں انتہائی سردی ہوتی ہے اور نیم مرطوب آب و ہوا ہے۔

چین کی ۹۰ فیصد سے زیادہ آبادی "ہان" نسل یعنی اصلاً چینی نسل پر مشتمل ہے باقی دس فیصدی پچاس قسم کی مختلف نسلیں ہیں۔ ان میں تبتی، منگول، ہیوای من اور یوای گوہرز قابل ذکر ہیں۔ ان نسلوں میں یوای گوہرز اور ہیوای من مسلمان ہیں۔ ۱۹۵۷ء کے اعداد و شمار کے مطابق چین میں ڈیڑھ کروڑ مسلمان تھے۔ لیکن غیر سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اسوقت چین میں تین کروڑ کے لگ بھگ مسلمان موجود ہیں۔ ہیوای من نسل کے افراد سارے چین میں پھیلے ہوئے ہیں جبکہ یوای گوہرز سنگ کنگ جو کہ گلگت کی سرحدوں سے جا ملتا ہے، اس میں زیادہ تر آباد ہیں۔

تاریخی پس منظر

چین کی تہذیب ہزاروں سال پرانی ہے۔ اور اس کا تحریری ریکارڈ دو ہزار سال قبل تک کا موجود ہے۔ اس دوران سینکڑوں کی تعداد میں خاندان حکمرانی کر چکے ہیں۔ آخری حکمران خاندان چنگ تھا۔ جس کا ۱۹۱۱ء میں تختہ الٹ دیا گیا تھا اور بورژوا ڈیموکریٹک حکومت قائم کر دی گئی تھی۔ چین کی تاریخ کا ایک خصوصی پہلو یہ ہے کہ۔ وہاں اکثر و بیشتر کسانوں کی بغاوتیں ہوتی رہی ہیں اور تقریباً ہر حکمران خاندان کے زوال کا سبب کسانوں کی یہ تحریکیں بنتی رہی ہیں۔ تاریخ میں پہلی

بغاوت کسانوں نے گیارھویں صدی میں کی تھی ۔ کسانوں کی یہ بغاوتیں چین کی انقلابی روایات کا حصّہ تصور کی جاتی ہیں ۔

انیسویں صدی کے اوائل میں برطانوی سامراج نے چین کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی اور یہاں پر افیون کے کاروبار کی آڑ میں کسانوں اور غریبوں کا بھرپور استحصال کیا۔ جس کے خلاف ۱۸۳۹ء سے ۱۸۴۲ء تک چینی عوام نے جو سامراج کے خلاف جدوجہد کی۔ اس کو جدید چین کی آزادی اور خودمختاری کی جنگوں کا نقطۂ آغاز کہا جاسکتا ہے۔ ان جنگوں کو "افیون کے خلاف جنگیں" کہتے ہیں۔ اسی طریقے سے ۱۸۵۱ء میں کسانوں نے بغاوت کی جس کو "تائی پینگ بغاوت" کہتے ہیں۔ ۱۹۰۰ء میں ایک اور بغاوت ہوئی جس کو "باکرز تحریک" کہا جاتا ہے ۔ اور ۱۹۱۱ میں ایک کسان بغاوت ہوئی جسے "ڈوچنگ بغاوت" کہتے ہیں ۔ یہ ساری بغاوتیں یا تو سامراجی حملوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تھیں یا انہیں ملک کے اندر جاگیرداری نظام کے خلاف آزادی کی جدوجہد سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ مئی ۱۹۱۱ء میں چنگ خاندان کے شہنشاہ نے عوام کی طرف سے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کے مطالبے کے زبردست دباؤ کی وجہ سے آخرکار ہتھیار ڈال دیئے اور سن یات سن جنہوں نے عوامی تحریک کی قیادت کی تھی، ملک کے پہلے منتخب صدر بنے۔ مگر چونکہ ملک میں جاگیرداری، افسر شاہی اور فوج نے سن یات سن کے جمہوری نظریات کی سخت مخالفت کی جس سے ملک میں شدید سیاسی بحران پیدا ہوگیا۔ اس بحران سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جاپان نے ۱۹۳۱ء میں منچوریا پر قبضہ کر لیا اور شمالی چین پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ اسی دوران مزدوروں، کسانوں اور فوج کے دستوں میں قومی اور انقلابی جذبہ پروان چڑھا۔ قبل ازیں ۱۹۲۱ء میں چین کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی جاچکی تھی۔ شروع شروع میں کمیونسٹ پارٹی نے سن یات سن کی قوم پرست حکومت سے بھرپور تعاون کیا۔ مگر ۱۹۲۷ء میں سن یات سن کے انتقال

کے بعد چین کی قوم پرست حکومت، جس کا صدر مقام کن تن تھا، پر چیانگ کائی شیک کا قبضہ ہوگیا۔ چیانگ کائی شیک کی حکومت نے کمیونسٹ پارٹی سے مکمل لاتعلقی اختیار کرلی اور ۱۹۲۸ء میں کمیونسٹ پارٹی کے بیشمار اہم اراکین کو پھانسی پر لٹکا دیا اور شنگھائی میں بہت سی مزدوروں کی ہڑتالوں اور تحریکوں کو کچل دیا۔ اس کے بعد کئی سال تک چیانگ کائی شیک کمیونسٹ پارٹی اور مزدوروں اور کسانوں کو مسلسل دباتے رہے اور ظلم و تشدد کا بازار گرم رکھا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر کمیونسٹ پارٹی نے کوانگ سی صوبہ میں اپنا مرکز قائم کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ سامراج کے پالتو چیانگ کی بربریت کو ختم کرنے اور ملک کو معاشی و سیاسی آزادی دلانے کے لئے ۳۶-۱۹۳۴ء میں مشہور لانگ مارچ کرنا پڑی اور چیرمین ماؤ اور ان کے ساتھیوں نے دو سال کے عرصہ میں بارہ ہزار پانچ سو کلومیٹر یعنی سات ہزار ۸ سو ساڑھے بارہ میل کا فاصلہ طے کرلیا۔ لانگ مارچ کے دوران پہاڑ دل دریاؤں اور بالائی علاقوں سے گزرتے ہوئے لاکھوں انسان قربان ہوگئے۔ ایک طرف انقلابی فوجی دستوں کو طوفانِ باد و برف کا مقابلہ کرنا پڑتا اور دوسری طرف مکار دشمن کی بے پناہ قوت سے ٹکرانا پڑتا۔ جب انقلابی دستے شن سی صوبے تک پہنچے تو یہاں ینان کے علاقے میں چیرمین ماؤ کی قیادت میں کمیونسٹ پارٹی نے اپنا مرکز قائم کرلیا۔ اندرونِ چین چیانگ کائی شیک اور کمیونسٹ پارٹی کے درمیان جب خانہ جنگی نے شدت اختیار کی تو جاپانی سامراج نے چین کے خلاف شدید حملے شروع کردیئے۔ ادھر لانگ مارچ کی زبردست جدوجہد کے نتیجے میں چیانگ کائی شیک کی حکومت حد درجہ کمزور ہوچکی تھی کہ ۱۹۳۷ء میں جاپان نے سارے چین پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ اسکے سامراجی عزائم کی وجہ سے چینی عوام کا چیانگ کائی شیک پر دباؤ بڑھنے لگا اور یہ مطالبہ زور پکڑنے لگا کہ وہ کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ

مل کر جاپان کے خلاف متحدہ محاذ بنائے. چنانچہ ۱۹۳۷ء میں چیانگ کائی شیک کی کومنتانگ فوجوں اور کمیونسٹ پارٹی کا متحدہ محاذ وجود میں آیا جس نے جاپان سے سخت ترین جنگ لڑی. کمیونسٹ پارٹی نے گوریلا جنگ کے تحت جاپانی فوجوں کو پے در پے شکستیں دیں جس کے نتیجے میں وسط چین کا بہت بڑا علاقہ جس کی آبادی ۹ کروڑ تھی کمیونسٹ پارٹی کے مکمل قبضہ میں آگیا۔ پارٹی نے یہاں متبادل حکومت قائم کر کے اس علاقہ میں دور رس اقتصادی اور سماجی اصلاحات نافذ کر دیں چیانگ کائی شیک اور کمیونسٹ پارٹی کا متحدہ محاذ ۱۹۴۵ء تک قائم رہا. چینی حریت پسندوں کے آگے جاپانی فوج ہتھیار ڈال کر پسپائی اختیار کرنے لگی. کومنتانگ فوجوں نے بھی منچوریا اور تائی وان کے علاقوں کا جاپانی سامراج سے دوبارہ قبضہ حاصل کر لیا. اس کے فوراً بعد چیانگ کائی شیک کی فوجوں اور چیئرمین ماؤ کی قیادت میں کمیونسٹ پارٹی کے درمیان دوبارہ خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ ۱۹۴۸ء خزاں کے موسم میں چیانگ کائی شیک کی فوجوں کو کمیونسٹوں کے ہاتھوں منچوریا، شمالی چین اور مشرقی چین میں ذلت آمیز شکست ہوئی۔ ۱۹۴۹ء میں سرخ فوج نے ینگ سی دریا کو عبور کر کے تقریباً سارے چین پر قبضہ کر لیا۔ یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء کو چیئرمین ماؤ نے "عوامی جمہوریہ چین" کے قیام کا اعلان کر دیا اور ان پٹھوؤں نے ذلت آمیز شکست کھانے کے بعد امریکی سامراج کے سائے میں تائیوان کے جزیرہ میں بھاگ کر پناہ لی۔ ۱۹۴۹ء کے انقلاب کے بعد چین کی عوامی حکومت کو ترقی پذیر اور غریب زرعی ملک کو جدید سوشلسٹ ریاست میں تبدیل کرنے کا مشکل ترین مسئلہ درپیش ہوا. یہ کام سرانجام دینے کے لئے نہ صرف وسیع قومی تعمیر کے کام کی ضرورت تھی بلکہ ہر چینی فرد کو فلسفی اور نظریاتی لحاظ سے مکمل تبدیل کرنے کی بھی ضرورت تھی. سب سے پہلے حکومت نے ساری زمین قومی ملکیت میں لیکر دُور رس زرعی اصلاحات کیں اور آہستہ آہستہ اجتماعیت کے اصولوں پر مبنی زرعی نظام کی بنیاد

رکھی گئی۔ اسی طریقے سے بتدریج صنعتی شعبے میں انقلابی تبدیلیاں لائی گئیں اور نجی ملکیت سے صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ ۱۹۵۵ء اور اس کے قریب کے سالوں میں چین کے سوویت یونین کے ساتھ سیاسی تعلقات ناخوشگوار ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکہ کی پالیسیوں کی وجہ سے چین کو بین الاقوامی برادری سے مکمل طور پہ علیحدہ کرنے کی سازشیں بھی عروج پر پہنچیں۔ امریکہ کے بدنامِ زمانہ میکارتھی نے کوریا، ویت نام اور مشرقِ بعید کے دوسرے ممالک میں ننگی جارحیت کے ذریعے چین کی فوجی اور بین الاقوامی ذمہ داریوں میں اضافہ کیا۔ امریکہ کے وزیرِ خارجہ جان فوسٹر ڈیلس نے بھی چین دشمنی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ان حالات میں چیئرمین ماؤزے تنگ اور ان کی پارٹی کو اپنی اقتصادی اور سیاسی پالیسیوں میں زبردست تبدیلیاں لانی پڑیں۔ ۱۹۵۸ء اور ۱۹۵۹ء میں چیئرمین ماؤ نے "عظیم جست لگا کر آگے بڑھنے" کا فلسفہ پیش کیا۔ اس کے مطابق خود اعتمادی، خود کفالت، خود انحصاری کے اصولوں پہ قومی معیشت کی تعمیر اور زراعت کے شعبے میں ترقی اور منصوبہ بندی پر زور دیا گیا۔ لاکھوں کی تعداد میں پڑھے لکھے نوجوان دیہاتوں میں چلے گئے اور چیئرمین ماؤ کی ہدایات کے مطابق زراعت کی ترقی اور سیاسی و سماجی اور اقتصادی مسائل کو حل کرنے میں ممد ثابت ہوئے۔ "عظیم جست لگا کر آگے بڑھنے" کی تحریک کے تین سال بعد تک چین میں مزید اقتصادی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ ان سالوں میں موسم کی خرابی کی وجہ سے فصلوں کو شدید نقصان پہنچا۔ رجعت پسندوں نے اس کی ذمہ داری نئی اقتصادی پالیسیوں پر ڈالنے کے لئے پارٹی اور حکومت کے اندر تنقید شروع کر دی اور اس بات کی وکالت کی کہ قومی اقتصادیات کو بحال کرنے کے سلسلے میں خود اعتمادی اور خود انحصاری اور عوامی امداد کے مقابلے میں زیادہ تنخواہیں اور مراعات کے فلسفے کو اپنایا جائے۔ اس دھڑے کی رجعت پسند

پالیسیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ملک میں شدید ردِ عمل ہوا اور ان عناصر کا مقابلہ کرنے کے لئے اور پارٹی کے جذبے کو برقرار رکھنے کے لئے ۱۹۶۶ء میں ثقافتی انقلاب کا آغاز ہوا۔

۱۹۶۶ء کے ثقافتی انقلاب کا پس منظر نام نہاد مالی اور مادی سہولتوں کی مخالفت سے عبارت نہیں تھا۔ بلکہ یہ جدوجہد سرمایہ داری نظام کی بحالی کے خلاف اور ترمیم پسند رجحانات کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں تھی۔ دوسرے دھڑے رہنمائی لیاؤشاؤچی جیسے رجعت پسند کر رہے تھے چین کے فلسفی نکتہ نگاہ سے انقلاب کی بہت اہمیت تھی۔ اسکا تعلق ان تحریکوں سے تھا جو ۱۹۴۹ء کے بعد انقلاب کے جذبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے سلسلے میں جاری تھیں۔ درحقیقت جدید چین میں عوام کی خدمت کے جذبے کو انقلاب کے عمل میں سب سے زیادہ فوقیت دینے کا نقطۂ نظر ثقافتی انقلاب کے دوران زیادہ ابھر کر سامنے آیا۔ چیئرمین ماؤ کے فلسفے کے مطابق چین کے انقلاب کو جاری رکھنے، پارٹی اور حکومت کے افراد کو افسر شاہی، ترمیم پسندی جیسے رجحانات سے بچانے کے لئے ثقافتی انقلاب جیسی تحریکوں کا بار بار وجود میں آنا لازمی ہے۔ ان کی رائے ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو کمیونسٹ پارٹی اور ان کے اراکین عوام سے کٹ جائیں گے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ گذشتہ مارچ میں چین میں تن سیاؤ پنگ نائب وزیرِ اعظم کے خلاف جو مظاہرے ہوئے یہ انقلاب کا حصہ تھے۔ ثقافتی انقلاب ایک سیاسی جدوجہد کا عمل تھا۔ اس دوران حقیقت میں پارٹی اور حکومت کا اقتدار عوام کے اقتدارِ اعلیٰ اور کڑی تنقید کا مرہونِ منت تھا۔

اس دوران جب عوام کی جدوجہد کنٹرول سے باہر جانے لگی تو کمیونسٹ پارٹی کے فوجی شعبہ یعنی پیپلز لبریشن آرمی جو کہ سیاسی ادارہ ہے، کی مداخلت ضروری محسوس کی گئی۔ اصل میں اس دوران عوامی فوج واحد منظم ادارہ تھا۔ جس کی کارکردگی میں انتظامی امور کو بحال کرنے میں مدد ملی۔ کیونکہ لیاؤشاؤچی کے دھڑے نے پارٹی کے بنیادی اصولوں

سے انحراف کیا تھا اور بے شمار لوگوں کی پارٹی میں وفاداریاں مشکوک ہوگئی تھیں۔ اس لئے پارٹی کے انقلابی کردار کو نکھارنے کے لئے بھی اقدامات کئے گئے۔ چیئرمین ماؤ کے قول کے مطابق سیاست کی رہنمائی مقدم ہے۔ ۱۹۶۹ء میں پارٹی کی نویں کانگرس بلائی گئی اور پارٹی کی اتھارٹی اور نظم وضبط بحال کیا گیا۔ ایک رائے کے مطابق پارٹی اور عوامی فوج کے تضادات کی وجہ سے جو سیاسی بحران پیدا ہوا وہ ۱۹۷۱ء میں لِن پیاؤ کے ہٹائے جانے سے دُور ہوا۔ یہ جدوجہد بھی ۱۹۶۶ء کے ثقافتی انقلاب کی کڑی تھی۔ ۱۹۷۱ء کے بعد پارٹی اور حکومت کا ڈھانچہ مکمل طور پر بحال کر دیا گیا۔ اب ملک کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی شعبہ جات میں پارٹی کا مکمل اثر و رسوخ اور کنٹرول ہے۔ ۱۹۷۳ء میں پارٹی کی دسویں کانگرس منعقد ہوئی اور ۱۹۷۵ء میں چوتھی قومی عوامی کانگرس کا اجلاس منعقد ہوا۔ ان دو اجلاسوں میں پارٹی اور ملک کے نئے آئین منظور کئے گئے ہیں اور جدید مضبوط انقلابی سیاسی اور سماجی نظام کی بنیادیں مستحکم بنا دی گئی ہیں۔

چوتھی عوامی کانگرس کا اجلاس پیکنگ میں ۱۳ جنوری ۱۹۷۵ء سے ۱۷ جنوری تک ہوا۔ اس اجلاس کے ایجنڈے میں نئے آئین کے مسودے کی منظوری، حکومت کے معاملات پر رپورٹ، حکومت اور پارٹی کے اعلیٰ عہدوں کا انتخاب اور تقرریاں شامل تھیں اس کانگرس نے ۲۱۸ کمیونسٹ پارٹی کے ممبران پر مشتمل مرکزی کمیٹی کا چناؤ کیا۔ کانگرس کے چیئرمین عظیم چینی رہنما مارشل چوتہہ تھے اور (ان کا ۶ جولائی ۱۹۷۶ء کو انتقال ہو چکا ہے) اس کے سیکرٹری جنرل وُوتہہ تھے۔ کانگرس ہال میں چیئرمین ماؤ کا قدِ آدم فوٹو لٹکا ہوا تھا۔ مارشل چوتہہ کے ساتھ سٹیج پر دوسرے رہنما اس ترتیب میں بیٹھے تھے۔ (۱) چو این لائی (۲) وانگ ہوانگ (۳) لوای پی چِن ینگ (۴) تن ہیاؤ پنگ (۵) چنگ چنگ چیؤ (۶) چنگ چنگ (۷) سوشی ہی یو (۸) ہوا کو فنگ (۹) چن ینگ کوائی (۱۰) لی شین نن (۱۱) لی تھہ سنگ (۱۲) یو دین ین (۱۳) وُو کوائی سین

(۱۴) سُو چیو ہوا (۱۵) نی چیہ فو۔ چیئرمین چو تہہ نے کانگرس کا افتتاح کیا۔ کامریڈ چینگ چن چیؤ نے سنٹرل کمیٹی اور پارٹی کی طرف سے آئین پر رپورٹ پیش کی۔ وزیرِ اعظم چُو این لائی نے سٹیٹ کونسل کی طرف سے حکومتی امور پر رپورٹ پڑھی۔ مسٹر چو این لائی کے علاوہ ۱۲ نائب وزرائے اعظم کا انتخاب کیا گیا جن میں نمبر ا پر تن سیاؤ پنگ تھے اور نمبر ۶ پر ہوا کو فنگ تھے۔ اس کے علاوہ ۲۹ دوسرے وزراء کا سٹیٹ کونسل کے لئے انتخاب کیا گیا۔ اس کانگرس کے چھ مہینے بعد ہی ستمبر، اکتوبر میں پہلے نائب وزیرِ اعظم تن سیاؤ پنگ کے نظریات کے بارے میں پارٹی میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ مسٹر چو این لائی ۸ جنوری ۱۹۷۶ء کو انتقال کر گئے۔ ان کی جگہ تن سیاؤ پنگ قائم مقام وزیرِ اعظم بنے مگر اس دوران پیکنگ اور ملک کے دوسرے حصوں میں تن سیاؤ پنگ کے رجعت پسندانہ اور ترمیم پسندانہ خیالات کے خلاف بے پناہ مظاہرے ہوئے۔ جن کا اوپر تفصیلاً ذکر کیا جا چکا ہے۔ ان مظاہروں کے نتیجے میں چیئرمین ماؤ کی ہدایات پر مرکزی کمیٹی نے تن سیاؤ پنگ کو سینئر نائب وزیرِ اعظم جو اس وقت قائم مقام وزیرِ اعظم کی حیثیت سے کام کر رہے تھے عوام کے مطالبات اور خواہشات کے پیشِ نظر پارٹی اور حکومت کے تمام عہدوں سے معزول کر دیا۔ اس کے ساتھ دوسرے ساتھیوں کو جن میں ایک وزیرِ تعلیم چُو چنگ سِن تھے، عہدوں سے ہٹا دیا گیا۔ ان پر الزام تھا کہ یہ سرمایہ داری نظام کی بحالی، ترمیم پسندانہ رجحانات کا پرچار اور ثقافتی انقلاب کے نتائج کو اپنے ذاتی مقاصد کی خاطر استعمال کر رہے ہیں۔ ان کی نام نہاد اقتصادی پالیساں جن کے تحت مزدوروں کو زیادہ تنخواہیں اور مراعات کا فلسفہ پیش کیا گیا تھا، ترمیم پسندی قرار دیا گیا۔ تن سیاؤ پنگ کو ہٹانے کے بعد مرکزی کمیٹی نے مسٹر ہوا کو فنگ کو جو اس سے قبل چو این لائی کے بعد ساتویں پوزیشن پر تھے، چین کا وزیرِ اعظم مقرر کیا۔ ان سیاسی تبدیلیوں کے بعد چین کی قیادت تا دمِ تحریر کچھ یوں ہے۔ چین کی کمیونسٹ پارٹی کی دسویں مرکزی کمیٹی کے چیئرمین ماؤزے تنگ

ہیں اس کے علاوہ چار وائس چیئرمین ہیں (۱) ہواکو فنگ (۲) وانگ ہوانگ وین، (۳) یہہ چین ینگ (۴) لی ہی تھہ شنگ

پولیٹکل بیورو کے مندرجہ ذیل ممبران ہیں :-

(۱) ماؤزے تنگ (۲) ورنگ ہنگ وین (یہ وائس چیئرمین بھی ہیں) (۳) وی کواچنگ (۴) یہہ چین ینگ (یہ وائس چیئرمین بھی ہیں) (۵) لیاؤ چوچنگ (۶) مادام چیانگ چنگ (۷) چوتہہ (انتقال کر چکے ہیں) (۸) سوشی یو (۹) ہواکو فنگ (یہ وزیر اعظم بھی ہیں) (۱۰) چی تنگ کوائی (۱۱) ڈوتہہ (یہ چوتھی عوامی قومی کانگریس کے سیکرٹری جنرل بھی ہیں) (۱۲) وانگ تنگ لنگ (۱۳) چن ینگ کوائی (۱۴) چن سی لئن (۱۵) لی سیئن نن (۱۶) لی تہہ شنگ (یہ وائس چیئرمین بھی ہیں) (۱۷) چنگ چن چیاؤ (۱۸) یو وین ین۔

پولیٹکل بیورو کے متبادل ممبران کے نام یہ ہیں :-

(۱) مادام ڈوکوائی سیئن (۲) سوچن ہوا (۳) نی چیہ فو (۴) سیف الدین۔

پولیٹکل بیورو کی سٹینڈنگ کمیٹی کے ممبران کے اسمائے گرامی یہ ہیں :-

(۱) ماؤزے تنگ (۲) وانگ ہنگ وین (۳) یہہ چین ینگ (۴) چوتہہ (مر چکے ہیں، ان کی جگہ ڈوتہہ آ چکے ہیں) (۵) ہواکو فنگ (۶) لی تہہ شنگ (یہ وائس چیئرمین بھی ہیں) (۷) چنگ چن چیاؤ۔

چوتھی قومی عوامی کانگریس کے چیئرمین چوتہہ تھے جن کا انتقال ہو چکا ہے۔ مارشل چوتہہ کے علاوہ اس کانگریس کے (۲۰) وائس چیئرمین ہیں، اور کانگریس کے سیکرٹری ڈوتہہ ہیں۔

عوامی جمہوریہ چین کی سٹیٹ کونسل (کابینہ) کے اراکین کی کل تعداد ۴۰ ہے، ان میں وزیر اعظم کے علاوہ دس نائب وزیر اعظم اور ۲۹ وزرا شامل ہیں

جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں :۔

(۱) وزیرِ اعظم ہواکوفنگ

نائب وزراے اعظم یہ ہیں :۔

(۱) یچنگ چن چیاؤ (۲) لی سین نن (۳) چن سی لین (۴) چی تنگ کوائی (۵) چن ینگ کوائی (۶) مادام وُوکوائی سین (۷) وانگ چن (۸) یوچیو لی (۹) گومو اور (۱۰) سن چین

وزراء کے نام یہ ہیں :۔

(۱) وزیرِ خارجہ چیاؤکوآن ہوا

(۲) وزیرِ دفاع یہہ چین ینگ

(۳) منصوبہ بندی کے وزیر یوچیاؤلی

(۴) وزیر برائے کیشن بھاری تعمیرات، گومو

(۵) وزیرِ قومی سیکورٹی یہ عہدہ ابھی تک وزیرِ اعظم ہواکوفنگ کے پاس ہے۔

(۶) غیر ملکی تجارت کے وزیر لی چنگ

(۷) وزیر برائے بیرونی اقتصادی امور، فانگ یِ

(۸) وزیر برائے زراعت و جنگلات شافنگ

(۹) وزیر برائے صنعت معدنیات چن چیاؤکن

(۱۰) بھاری مشینری کی صنعت کی پہلی وزارت کے وزیر لی شیاؤچنگ

(۱۱) بھاری مشینری کی صنعت کی دوسری وزارت کے وزیر لیاؤسی یاؤ

(۱۲) بھاری مشینری کی صنعت کی تیسری وزارت کے وزیر لی چی تائی

(۱۳) بھاری مشینری کی صنعت کی چوتھی وزارت کے وزیر وانگ چنگ

(۱۴) بھاری مشینری کی صنعت کی پانچویں وزارت کے وزیر لی چنگ فان

(۱۵) بھاری مشینری کی صنعت کی چھٹی وزارت کے وزیر چن چنگ

(۱۶) بھاری مشینری کی صنعت کی ساتویں وزارت کے وزیر وانگ یلنگ

(۱۷) کوئلے کی صنعت کے وزیر، سُوچن چنگ

(۱۸) پٹرول اور کیمیکل کے وزیر کانگ سی ہن

(۱۹) پن بجلی اور پانی کی ذخیرہ اندوزی کے وزیر، مادام چئن چنگ ینگ

(۲۰) ہلکی صنعت کے وزیر چئن چیہ کوانگ

(۲۱) ریلوے کے وزیر وانگ لی

(۲۲) مواصلات کے وزیر یہہ فیائی

(۲۳) ڈاک خانہ اور تار کے نظام کے وزیر چنگ فوینگ

(۲۴) وزیرِ خزانہ چنگ چنگ فو

(۲۵) کامرس کے وزیر فان زُو یُو

(۲۶) ثقافت کے وزیر یُوہوئی ینگ

(۲۷) وزیرِ تعلیم تن سیاڈینگ کے ساتھی چُوچنگ سن

(۲۸) وزیرِ صحت مادام لیاڈ لیاڈپنگ

(۲۹) وزیر برائے کمیشن سپورٹس اور فزیکل کلچر چوانگ سی تنگ

چین کا حکومتی ڈھانچہ

نیشنل پیپلز کانگریس

چین کی کیمونسٹ پارٹی کی قیادت میں سب سے بڑا ادارہ نیشنل پیپلز کانگریس ہے جو مختلف صوبوں، خود مختار علاقوں مرکزی حکومت کے ماتحت مونسپل کمیٹیوں اور عوامی فوج کے منتخب نمائندوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ جب بھی ضروری ہوتا ہے خاص خاص محبِ وطن شخصیات کو خصوصی دعوت ناموں کے ذریعے نیشنل پیپلز کانگریس کے اجلاس میں

بلایا جاسکتا ہے۔ اس ادارے کا انتخاب ۵ سال کے لئے ہوتا ہے مگر غیر معمولی حالات میں اس کی مدت اور میعاد بڑھائی جاسکتی ہے نیشنل پیپلز کانگرس کا اجلاس سال میں ایک دفعہ لازمی ہوتا ہے مگر اس کی میعاد میں کمی اور اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

نیشنل پیپلز کانگریس کے اختیارات اور فرائض میں آئین میں ترمیم، قانون سازی، وزیر اعظم اور سٹیٹ کونسل کے دوسرے وزراء کی تقرری اور ان کو ہٹانے سے متعلق احکام جاری کرے (جو کہ کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی سفارش کے مطابق ہوتے ہیں)، اس کے علاوہ قومی اقتصادی منصوبہ بندی کی منظوری بجٹ اور قومی اخراجات کے حساب کتاب کی آخری منظوری اور دوسرے ایسے فرائض جو کانگریس فیصلہ کرے انہیں سرانجام دینا شامل ہے۔ اس ادارہ کے کل اراکین کی کل تعداد ۲۱۸ ہے۔

نیشنل پیپلز کانگریس کی سٹینڈنگ کمیٹی اس کا مستقل ادارہ ہے (جس کے سات ممبر ہیں)، سٹینڈنگ کمیٹی کے فرائض اور اختیارات حسب ذیل ہیں

نیشنل پیپلز کانگریس کے اجلاس طلب کرنا، قوانین کی وضاحت کرنا نئے قوانین مرتب کرنا، غیر ممالک میں چینی سفارتی نمائندوں کا تقرر کرنا، اور انہیں واپس بلانا، چین میں غیر ملکی سفارتی نمائندوں کی اسناد تقرری وصول کرنا، غیر ممالک کے ساتھ چین کے معاہدے منظور اور منسوخ کرنا اور ایسے اختیارات استعمال کرنا جن کی نیشنل پیپلز کانگریس گاہے بگاہے اس ادارہ کو اختیارات تفویض کرے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ سٹینڈنگ کمیٹی چیئرمین، وائس چیئرمین اور دوسرے ممبران پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ تمام ممبران منتخب ہوتے ہیں، مگر کسی بھی وقت نیشنل پیپلز کانگریس ان کو ہٹا سکتی ہے اور ان کی جگہ دوسرے ممبران کو لاسکتی ہے۔

وزارتی کونسل یا کابینہ

وزارتی کونسل کے اراکین کے نام پچھلے صفحات میں لکھے جا چکے ہیں، وزارتی کونسل مرکزی حکومت ہے اور نیشنل پیپلز کانگریس اور اس کی سٹینڈنگ کمیٹی کے سامنے براہِ راست جواب دہ ہے۔ وزارتی کونسل وزیرِ اعظم اور نائب وزرائے اعظم، وزراء اور کمیشنز کے سربراہان جو نائب وزرا عہدہ کے برابر ہوتے ہیں پر مشتمل ہوتی ہے۔

وزارتی کونسل کے اختیارات اور فرائض مندرجہ ذیل ہیں :۔

انتظامی امور کے بارے میں احکامات کو ترتیب دینا اور آئین و قوانین کے مطابق اپنے فیصلے اور احکامات جاری کرنا، تمام ملک میں وزارتوں، کمیشنز، علاقائی صوبائی اور مقامی حکومتی اداروں کے اتحاد اور انتظامی امور کو قیادت مہیا کرنا، قومی اقتصادی پلان اور قومی بجٹ کو ترتیب دینا اور اس پر عمل درآمد کرانا، تمام دوسرے انتظامی امور جو کہ نیشنل پیپلز کانگریس اور اس کی سٹینڈنگ کمیٹی وزارتی کونسل کو تفویض کرے، ان پر عمل درآمد کرنا شامل ہے

لوکل پیپلز کانگریس اور لوکل انقلابی کمیٹیاں

چین کے ہر صوبہ میں لوکل پیپلز کانگریس قائم ہیں۔ اس کے علاوہ ان کمیٹیوں جو مرکزی حکومت کے ماتحت ہیں اور جن کو صوبائی درجہ حاصل ہے، میں بھی لوکل پیپلز کانگریس قائم ہیں، ان کا انتخاب ۵ سال کے لئے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ضلعوں، شہروں اور تحصیلوں کی پیپلز کانگریس تین سال کے لئے منتخب ہوتی ہیں۔ دیہی علاقے کے عوامی کمیون اور چھوٹے علاقوں کی پیپلز کانگریس کا انتخاب دو سال کے لئے کیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ مختلف سطحوں پر مقامی انقلابی کمیٹیاں قائم ہیں جو لوکل پیپلز کانگریس کے مستقل ادارے کی حیثیت رکھتی ہیں اور مقامی بلدیاتی اداروں کے فرائض بھی سرانجام دیتی ہیں مقامی انقلابی کمیٹیاں چیئرمین وائس چیئرمین اور دوسرے ممبران پر مشتمل ہوتی ہیں ان کمیٹیوں کا باقاعدہ انتخاب ہوتا ہے۔ مگر مقامی پیپلز کانگریس ان کمیٹیوں کے اراکین کو ہٹا کر دوسرے افراد کو انتخاب کے ذریعے آگے لاسکتی ہے، بشرطیکہ اس سے اوپر کی سطح کی پیپلز کانگریس اس کی منظوری دے، مقامی انقلابی کمیٹی اپنی سطح کی پیپلز کانگریس اور اس کے اونچی سطح کے حکومتی ادارے کو مکمل طور پر جواب دہ ہوتی ہے۔ لوکل پیپلز کانگریس اور مقامی انقلابی کمیٹیاں مرکزی حکومت کے قوانین پر عملدرآمد کرانے کے علاوہ مقامی تعمیرات کے پروگراموں اور انقلابی اصولوں کی تکمیل کے فرائض سرانجام دیتی ہیں۔ مقامی اقتصادی منصوبہ بندی اور بجٹ کے فرائض بھی ان کمیٹیوں کے ذمہ ہوتے ہیں، نیز نچلی سطح پر عوام کے ہر قسم کے تحفظ یعنی انصاف فراہم کرنا، سماجی برائیوں کی سرکوبی، پولیس کے فرائض اور انقلابی عمل جاری رکھنا بھی ان کمیٹیوں کے فرائض میں شامل ہے

خود مختار علاقوں کے حکومتی ادارے

چین میں صوبوں کے علاوہ کچھ علاقے ایسے ہیں جن کو خود مختار بلدیاتی یونٹوں کا درجہ حاصل ہے۔ ان علاقوں میں اقلیتیں مقیم ہیں جن کو مرکزی قوانین سے ہٹ کر مزید اختیارات اور آزادی دی گئی ہے۔ ان علاقوں میں نیشنل پیپلز کانگریس اور مقامی انقلابی کمیٹیوں کے ادارے موجود ہیں۔ یہ ادارے چین کے آئین اور قوانین کے مطابق ایسے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ مرکزی حکومت پوری تندہی سے ان خود مختار علاقوں کے ثقافتی اقلیتی اور قومیتی حقوق کا تحفظ کرتی ہے

اوران کی اپنی خواہشات کے مطابق سوشلسٹ انقلاب اور تعمیری کاموں میں مدد دیتی ہے

عدالتی اور قانون پر عملدرآمد کے ادارے

یہ وضاحت کرنی ضروری ہے کہ چین میں جرائم اور مقدمہ بازی جیسے سنگین مسائل نہیں ہیں، تاہم معمولی نوعیت کے حادثوں اور جھگڑوں کے تصفیے کے لئے عدالتی نظام قائم ہے۔ مگر یہ نظام ہماری طرح کا نہیں ہے۔ ہر سطح پر عوامی عدالتیں قائم ہیں جہاں وکلاء کا پتہ بھی نہیں ہے، ہر فرد کو مقامی انقلابی کمیٹی کی وساطت سے مکمل انصاف مہیّا کیا جاتا ہے۔ اس کی تفصیلات بعد میں بیان کی جائیں گی۔ یہاں صرف اس ڈھانچے کو بیان کیا جاتا ہے۔

سب سے اوپر پیپلز سپریم کورٹ ہے جو ملک کا سب سے بڑا ادارہ ہے نچلی سطح پر مقامی پیپلز کورٹس اور پیپلز عدالتیں مقامی پیپلز کانگریس اور اس کے ادارے پیپلز انقلابی کمیٹی کے سامنے جواب دہ ہیں۔ پیپلز کورٹس کے صدر کا انتخاب اور اس کو اپنے عہدہ سے ہٹانا مقامی انقلابی کمیٹی کے اختیار میں ہوتا ہے۔ ان عدالتوں میں مقدمات پیش کرنے اور قانون پر عمل درآمد کرانے کے فرائض مقامی پبلک سیکورٹی کا محکمہ سرانجام دیتا ہے۔ یہ ادارہ پیپلز کورٹس سے جُداگانہ ہوتا ہے، مگر اس کا تعلق پیپلز کورٹس ہی سے ہے۔ یہ ادارہ بھی مکمل طور پر لوکل پیپلز کانگریس اور مقامی انقلابی کمیٹی کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔ چین کے عدالتی نظام کا خصوصی پہلو یہ ہے کہ مقدمات کے تصفیے اور پیروی کے سلسلے میں عوامی رجحانات اور خواہشات کا مکمل احترام کیا جاتا ہے۔ ایسے سنگین معاملات میں جہاں انقلاب دشمن نوعیت کے جرائم کا ارتکاب ہو، ضروری ہوتا ہے کہ

عوام کی رائے لی جائے اور بحث و تمحیص اور تنقید و خود تنقیدی کے مراحل طے کرنے کے بعد مناسب فیصلہ صادر کیا جاتا ہے۔

چین کا سیاسی ڈھانچہ

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، چین کا حکومتی ڈھانچہ کمیونسٹ پارٹی کے سیاسی ڈھانچے کے ماتحت ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کے چیئرمین کے علاوہ پانچ وائس چیئرمین ہیں، اس کے بعد ۱۸ ممبران پر مشتمل پولیٹیکل بیورو ہے، جس کے چار متبادل ممبران بھی ہیں۔ اس پولیٹیکل بیورو کی ایک سٹینڈنگ کمیٹی ہے جس کے کل ممبروں کی تعداد سات ہے۔ اس سیاسی ڈھانچہ کا سب سے بڑا ادارہ کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی ہے، جو چیئرمین، وائس چیئرمین، پولیٹیکل بیورو کے ممبران اور سٹینڈنگ کمیٹی کے ممبران کو منتخب کرنے کی مجاز ہے۔ مرکزی کمیٹی کئی سو افراد پر مشتمل ہے۔ نیشنل پیپلز کانگریس بھی مرکزی کمیٹی کے ماتحت ہے۔ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے بعد صوبائی کمیٹیاں قائم ہیں، پھر علاقائی کمیٹیاں آتی ہیں۔ بڑے شہروں میں بھی پارٹی کی کمیٹیاں موجود ہیں۔ ان شہروں میں نچلی سطح پر سٹریٹ کمیٹیاں بھی قائم ہیں، دیہات میں کمیون کمیٹیاں کام کرتی ہیں، فیکٹریوں میں بھی پارٹی کی کمیٹیاں علیحدہ قائم ہیں۔ پارٹی کی ان کمیٹیوں کے مختلف سطح پر مرکزی کمیٹی کی ہدایت کے مطابق خصوصی سیاسی اور تنظیمی فرائض ہیں۔ ان فرائض میں کمیونسٹ پارٹی کی رکن سازی بھی شامل ہے۔ واضح رہے کہ چین میں ۸۰ کروڑ کی آبادی میں سے صرف نو کروڑ کے قریب کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ اراکین ہیں۔ باقی افراد اگرچہ پارٹی کے ممبر بن سکتے ہیں مگر اس کے لئے سخت مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ کوئی بھی شخص اس وقت تک پارٹی کا ممبر نہیں بن سکتا جب نچلی سطح پر عوام میں اپنا کردار، عمل، سیاسی شعور، اور قیادت کی صلاحیتوں کا مظاہرہ نہ کر چکا ہو۔ اگرچہ کمیونسٹ پارٹی کے اراکین

کی تعداد تین کروڑ کے قریب ہے، مگر ملک میں حکومتی اور انتظامی عہدے صرف پارٹی ممبران کو دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً وزراء، پیپلز کانگریس کے ممبران انقلابی کمیٹیوں کے عہدہ داران اور ممبران، پیپلز کورٹس کے صدر، پبلک سیکورٹی کے افراد کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہوتے ہیں، اور دوسرے چھوٹے بڑے سرکاری عہدے بھی پارٹی ممبران کے پاس ہیں۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ پورے چین میں جو افراد کمیونسٹ پارٹی کے ممبر نہیں ہیں ان پر کوئی پابندی نہیں کہ وہ لازمی طور پر پارٹی کے ممبر بنیں، تاہم سرکاری عہدوں پر کوئی بھی ایسا فرد جو پارٹی کارکن نہیں ہے، فائز نہیں ہو سکتا، لیکن تمام بنیادی حقوق، روزگار، تعلیم، رہائش اور دوسری سہولتیں ہر شہری کا بنیادی حق ہیں اور ہر شہری کو یہ سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں، خواہ وہ پارٹی کا ممبر ہو یا نہ ہو۔

اس کتاب کا یہ موضوع نہیں ہے کہ چین کی شخصیتوں کے
کے بارے میں تفصیل سے لکھا جائے۔ لیکن چین کی شخصیتیں
اتنی اہم ہیں کہ جب میں چین میں تھا تو میرے دل
میں خواہش پیدا ہوئی کہ ان کے بارے میں کچھ معلومات
حاصل کی جائیں۔ اس سلسلے میں جو کچھ معلومات
میسّر ہوئیں انہیں قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

چین کی اہم شخصیات

چیئرمین ماؤزے تنگ

یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ چیئرمین ماؤ ایک عہد ساز شخصیت ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر سب سے عظیم زندہ شخصیت ہیں۔ ان کی سوانح عمری اور کارہائے نمایاں بیان کرنے کے لئے ایک علیحدہ تصنیف کی ضرورت ہے۔ یہاں صرف ان کا مختصر تعارف کرایا جاتا ہے۔

چیئرمین ماؤ کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے چیئرمین ہیں اور انہیں چین میں ایک دیوتا کا درجہ حاصل ہے۔ ماؤ چین کی عوامی فوج کے سپریم کمانڈر بھی ہیں۔

چیئرمین ماؤ ۱۸۹۳ کو صوبہ ہونان کے شاؤ شان گاؤں میں ایک غریب کسان گھرانے میں پیدا ہوئے جس کے پاس صرف ۲½ ایکڑ زمین تھی۔ ان کے والد کا نام ماؤ شین شنگ اور والدہ کا نام وین چی مئی تھا۔ ماؤ کے دو چھوٹے بھائی بھی تھے۔ جن میں سے ایک کا نام ماؤ تسے من تھا۔ جب ۱۹۲۵ء میں ماؤ کسان تحریک کے تربیتی ادارے کے ڈائریکٹر تھے تو لسے من یہاں پڑھتا تھا۔ دوسرے بھائی کے بارے میں معلومات فراہم نہیں ہوسکیں۔ ماؤ جب چھ سال کے تھے تو کھیتوں پر کام کرتے تھے۔ ۸ سال کی عمر میں گاؤں کے پرائمری سکول میں داخل ہوئے۔ انہیں بچپن ہی سے بہادری اور قوم پرستی کی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا، مذہبی کتابوں سے خاص شغف نہیں تھا۔ والدہ کافی مذہبی تھیں البتہ والد دولت پرست اور سخت گیر تھے۔ جن سے ان کی اکثر جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ پرائمری سکول کی تعلیم کے بعد متعدد سکولوں میں تعلیم حاصل کی مگر کہیں استقرار نصیب نہ ہوا۔ آخر کار ۱۹۱۲ء میں ایک نارمل سکول میں داخل ہوئے جہاں سے ۱۹۱۸ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ ماؤ کے پاس یونیورسٹی کی باقاعدہ کوئی ڈگری نہیں تھی، انہوں نے "اپنی تعلیم خود" کے اصولوں کی بنیاد پر

بے شمار لائبریریوں میں ورق گردانی کی اور دنیا بھر کے سنجیدہ علوم وفنون کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس دوران بین الاقوامی ترقی پسند تحریکوں، خاص طور پر روس کی سوشلسٹ تحریک کا بھی گہرا جائزہ لیا۔ انہیں عورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، جب وہ ۱۴ سال کے تھے تو ان کے والدین نے ایک ۲۰ سالہ لڑکی سے ان کا نکاح کر دیا مگر رخصتی نہ ہوئی یوں معاملہ ادھورا رہ گیا۔ آخری درس گاہ سے ماؤ تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ماؤ کو اپنی ماں سے گہری محبت تھی۔ اس کے بعد وہ گھر جانے سے کترانے لگے اور ان کے لئے اپنے گھر میں کوئی دلچسپی نہ رہی۔

۱۹۱۸ء میں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مختلف شہروں میں ایسی مٹرگشت شروع کر دی کہ پھر گھر واپس نہ لوٹ سکے۔ اسی گوچہ گردی کے عالم میں وہ پیکنگ پہنچ گئے۔ یہاں ان کی سابقہ اسکول کے اخلاقیات کے استاد 'یانگ چانگ چی' سے ملاقات ہو گئی۔ چی ان دنوں پیکنگ نیشنل یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ سکول کے زمانے میں ماؤ ان سے بہت متاثر تھے۔ مسلسل بیکاری کی وجہ سے ماؤ کی حالت بہت خستہ ہو گئی تھی اور وہ نوکری کی تلاش میں تھے۔ یانگ چانگ چی کی وساطت سے انہیں اسسٹنٹ لائبریرین کی ملازمت مل گئی۔ لائبریری میں کتابوں کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ان کو معروف چینی انقلابی دانشوروں سے بھی ملنے کا موقع ملا۔ اس طرح ان کے انقلابی نظریات میں پختگی آگئی۔ اسی دور میں ان کی ملاقات چی کی خوبصورت لڑکی مس یانگ کائی ہوئی' سے ہوئی۔ دونوں بہت جلد محبت کے لازوال رشتے میں بندھ گئے۔ ۱۹۲۰ء میں دونوں کی شادی ہو گئی۔ اگرچہ ماؤ نے شادی کے واقعہ کے سوا اپنی بیوی کے بارے میں کچھ نہیں کہا، تاہم تحقیق سے ثابت ہے کہ چینی انقلاب کی جدوجہد کے دوران یہ خاتون پارٹی کی نہایت سرگرم رکن تھیں، اور جن دنوں ماؤ ہونان میں کسانوں کی تحریک کی قیادت کر رہے تھے وہاں کے نوجوان، ماؤ اور ہوئی کو ایک مثالی انقلابی جوڑا

سمجھتے تھے۔ بدقسمتی سے ۱۹۳۰ء میں کومنتانگ نے یانگ کائی ہوئی کو قتل کردیا۔ اس واقعہ نے ماؤ پر گہرے اثرات چھوڑے، لیکن وہ اپنی دھن میں مگن رہے۔ اس کے بعد انہوں نے دوسری شادی کی۔ یہ خاتون ۱۹۳۹ء میں انقلابی جدوجہد کے دوران ماؤ کو چھوڑ کر روس بھاگ گئی۔ ۱۹۳۹ء میں ماؤ نے اپنی موجودہ بیوی مادام چیانگ چنگ سے شادی کی جو تادمِ تحریر چین کی پانچ اہم شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔

سکول کی تعلیم کے آخری ایام میں ماؤ نے ایک اپنی نوجوانوں کی قوم پرست تنظیم بنائی تھی اور دوسرے ترقی پسند گروپوں سے بھی رابطہ قائم کیا۔ اس دورہ میں انہوں نے روس سے آیا ہوا کمیونسٹ لٹریچر پڑھا۔ انہوں نے کمیونسٹ مینی فسٹو، طبقاتی جدوجہد اور "سوشلزم کی تاریخ" نامی کتابوں کو گہری نظر سے پڑھا۔ اور روس میں رونما ہونے والے انقلابی واقعات کا تجزیہ کیا۔ جب مئی ۱۹۲۱ء کو سنگھائی میں کمیونسٹ پارٹی چین کا پہلا اجلاس ہوا تو اس میں ماؤ ہونان صوبے کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں انہیں کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا رکن چن لیا گیا۔

ماؤ کمیونسٹ پارٹی میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ کومنتانگ کی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ انہیں ۱۹۲۴ء میں کومنتانگ کی سنٹرل کمیٹی کا رکن منتخب کیا گیا آپ اس کے کسان محاذ کے سربراہ کی حیثیت سے خاصے سرگرم رہے۔ ۱۹۲۵ء میں کسان تربیتی ادارے کے ڈائریکٹر بھی مقرر ہوئے۔ یہاں چو این لائی (مرحوم) بطور لکچرار کام کرتے تھے۔ ماؤ نے کومنتانگ کی انقلاب دشمن کارروائیوں کے باعث بعد میں کومنتانگ کو خیرباد کہہ دیا۔ ۱۹۲۷ء میں جب آزاد علاقوں پر ان کا قبضہ ہوا تو ریڈ آرمی (سرخ فوج) کا قیام عمل میں آیا اور ماؤ کو ان کی صلاحیتوں کی بنا پر کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میسر آئی۔ آپ چین کی کمیونسٹ پارٹی کے بنیادی اراکین میں ہیں۔

کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد ۱۹۲۱ء میں رکھی گئی تھی۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۷ء تک چیئرمین ماؤ چین میں انقلابی قوتوں کو متحد کرنے میں کوشاں رہے، اس کے ساتھ ساتھ ملک بھر میں کسانوں کی تحریکوں میں حصہ لیتے رہے۔ اگرچہ ماؤ کی ابتدائی زندگی ایک سکول ٹیچر کی حیثیت سے گزری، لیکن وہ بچپن ہی سے انقلابی ذہن رکھتے تھے۔ انہوں نے سکول ٹیچری کے دوران بھی طبقاتی تضاد کا مطالعہ کیا، اور چین کے نظام کے نقائص کو پرکھنے کے لئے تجزیئے کرتے رہے۔ ماؤ کو عالمی انقلابی تحریکوں سے بھی شدید ذہنی لگاؤ تھا۔ خاص طور پر انقلابِ روس کے بعد ان کے دل میں یہ خواہش مچل رہی تھی کہ چین کے مظلوم کسانوں، ہاریوں اور مزدوروں کو بھی استحصال سے نجات دلائی جائے، اور یہاں بھی معاشی انصاف ہو۔

۱۹۲۷ء میں چیئرمین ماؤ نے مزدوروں اور کسانوں پر مشتمل "سُرخ فوج" کی بنیاد رکھی اور اس کی تنظیم کے لئے سخت ترین جدوجہد کی۔ "سُرخ فوج" کی مدد سے ماؤ نے چین کے دیہی علاقوں میں روسی طرز کے آزاد علاقے قائم کر دیئے، اور انہیں انقلابی خطوط پر جدوجہد جاری رکھی۔

۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۶ء کے عرصہ کے دوران عہد ساز لانگ مارچ کی، یہ لانگ مارچ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں اس وقت کی انقلابی حکومت کے ہیڈکوارٹر کیانگ سی سے شروع ہوئی اور ۱۲ ہزار پانچ سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ۱۹۳۶ء میں صوبہ نیان میں اختتام پذیر ہوئی۔ ۱۹۳۷ء میں جب جاپان نے چین پر جارحیت کی اور منچوریا کا علاقہ ہتھیالیا، تو چیئرمین ماؤ نے اپنی فراست سے کام لیتے ہوئے چیانگ کائی شیک سے متحدہ محاذ بنایا تاکہ جاپان کو ملک سے باہر نکالا جا سکے۔ "سُرخ فوج" کی اعلیٰ جنگی اور گوریلا صلاحیتوں کی وجہ سے ۱۹۴۵ء میں جاپان کو ذلّت آمیز شکست ہوئی۔ اس کے بعد چین میں "سُرخ فوج"، اور

سامراجی ایجنٹ چیانگ کائی شیک کی فوجوں کے درمیان خانہ جنگی شدت اختیار کرگئی ۱۹۴۹ء میں چیانگ کائی شیک کو ایسی شرمناک شکست کا سامنا کرنا پڑا کہ اس کے سامراجی آقا بھی "سُرخ فوج" کے سامنے اُسے ٹھہرنے میں مدد نہ دے سکے۔ اور اس نے بھاگ کر فارموسا کے جزیرہ میں پناہ لی۔ یُوں سارے چین پر کمیونسٹوں کا قبضہ ہوگیا اور یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء کو "چین" عوامی جمہوریہ بن گیا۔

"عوامی جمہوریہ چین" کے قیام کے بعد ماؤ عوامی مرکزی حکومت کے چیئرمین منتخب ہوئے، یہ عہدہ ۱۹۵۴ء کے عام انتخابات اور مستقل آئین کے منظور ہونے کے بعد "چیئرمین عوامی جمہوریہ چین" میں تبدیل کر دیا گیا۔ ۱۹۵۹ء میں اپنی بے پناہ ادبی اور تنظیمی مصروفیات کی وجہ سے چیئرمین عوامی جمہوریہ چین کا عہدہ ماؤزے تُنگ نے لیاؤ شاؤچی کے حوالے کر دیا اور خود صرف چیئرمین مرکزی کمیٹی کمیونسٹ پارٹی چین کے عہدہ پر فائز رہے۔ اس دوران چین میں زبردست صنعتی، ثقافتی اور زرعی ترقی ہوئی اور ہر شعبہ میں قیادت اور چیئرمین ماؤ کے فلسفہ کی وجہ سے استحکام پیدا ہونے لگا کہ بین الاقوامی سطح پر چین کے خلاف زبردست سازشیں شروع ہوگئیں۔ کئی مرتبہ ماؤزے تُنگ کی بیماری اور صحت کی بے بنیاد افواہیں بھی پھیلائی گئیں۔ ان افواہوں کی تردید کے لئے چیئرمین ماؤ بے شمار دفعہ عوامی اجتماعات سے خطاب کرتے اور مزدوروں، کسانوں میں گھل مِل کر باتیں کرتے ہوئے دیکھے گئے۔

۱۹۶۰ اور اس کے فوراً بعد چین کی کمیونسٹ پارٹی میں اندرونی جدوجہد شروع ہوگئی۔ جس میں لیاؤ شاؤچی رجعت پسند اور ترمیم پسند عناصر کی قیادت کرنے لگے جب کہ ماؤزے تُنگ انقلابی لائن کی قیادت کر رہے تھے۔ پارٹی کی اندر کی جدوجہد اس وقت

اپنی انتہا کو پہنچی جب ۱۹۶۶ء میں ماؤزے تنگ نے عظیم ثقافتی انقلاب کی تحریک شروع کی اور لیاؤ شاؤچی اور ان کے رجعت پسند ٹولے کو عوام کی حمایت سے بے نقاب کیا ثقافتی انقلاب ۱۹۶۹ء تک جاری رہا۔ اور لیاؤ شاؤچی اور ان کے اور ان کے ٹولے کو مکمّل شکست ہوئی۔ اس جدوجہد کے دوران چین میں نظریاتی اور ثقافتی محاذوں پر زبردست تبدیلیاں آئیں۔ طالب علموں کی قیادت میں ایک ریڈ گارڈ قائم کی گئی جس کے دستے گاؤں گاؤں شہر شہر پہنچے اور عوام کو چیئرمین ماؤ کی انقلابی لائن اور لیاؤ شاؤچی کی رجعت پسند اور ترمیم پسند لائن میں امتیاز کرنا بتایا۔ اس عرصہ میں پارٹی کاڈر جو سست، افسر شاہی پسند اور ترمیم پسند ہو چکا تھا، یا تو منظر سے ہٹا دیا گیا یا انہوں نے اپنی اصلاح کر لی۔ چین کی دیہی تعمیر و ترقی، خوشحالی اور انقلابی جذبے کے نئے منصوبے بنائے گئے، جن سے ملکی اقتصادیات، دفاع اور نظریاتی سرحدوں کو زبردست تقویت پہنچی۔

ثقافتی انقلاب کی کامیابی کے بعد انقلاب دشمن عناصر نے سازش کے نئے منصوبے بنائے۔ لیاؤ شاؤچی کو ہٹانے کے بعد چیئرمین ماؤ نے لن پیاؤ کو پہلا وائس چیئرمین اور جانشین مقرر کیا، خود دوبارہ چیئرمین عوامی جمہوریہ کا عہدہ سنبھال لیا مگر ترمیم پسند اور رجعت پسند ٹولے نے اب لن پیاؤ کے ساتھ الحاق کیا۔ ستمبر ۱۹۷۱ء میں چیئرمین ماؤ کے قریب ترین ساتھی لن پیاؤ نے ماؤ کے قتل کا منصوبہ تیار کیا مگر چند گھنٹے قبل یہ سازش بے نقاب ہو گئی۔ نتیجتہً لن پیاؤ کا بھی لیاؤ شاؤچی جیسا حشر ہوا اور اسے عوام کی خواہشات کے مطابق تمام عہدوں سے ہٹا دیا گیا۔

۱۹۷۱ء کے بعد ضعیف العمری کے باعث چیئرمین ماؤ نے حفظِ ماتقدم کے طور پر اپنی مصروفیات کم کر دیں۔ تاہم چین میں آنے والی اہم شخصیتوں اور سربراہانِ

مملکت کو چیئرمین ماؤ خود ملتے رہے ہیں۔ جولائی ۱۹۷۱ء میں پاکستان سے ڈاکٹر ہنری کیسنگر نے چین کا خفیہ دورہ کیا اور چیئرمین ماؤ سے اہم اور طویل ملاقات کی جس کے نتیجے میں وہ ان کے مرید بن گئے۔ بعد میں مسٹر نکسن نے امریکہ کے صدر کی حیثیت سے اور مسندِ صدارت سے اترنے کے بعد چین کا دورہ کیا اور چیئرمین ماؤ سے طویل ملاقات کی۔ مسٹر نکسن کے صدارت سے علیحدہ ہونے کے بعد کئی مرتبہ ڈاکٹر کیسنگر چین آئے، صدر فورڈ نے بھی چین کا دورہ کیا اور چیئرمین ماؤ سے طویل مذاکرات کئے مگر اکتوبر ۱۹۷۰ء کی پیکنگ کی ریلی کے بعد چیئرمین ماؤ نے عوامی اجتماعات سے خطاب نہیں کیا۔ اگست ۱۹۷۳ء میں کمیونسٹ پارٹی کی دسویں قومی کانگریس کے اجلاس میں ماؤ نے شرکت کی اور سنٹرل کمیٹی کے دوبارہ چیئرمین منتخب ہوئے۔ جنوری ۱۹۷۵ میں چین کا جو تازہ ترین آئین کا مسودہ منظور ہوا ہے، اس کی رو سے چیئرمین ماؤ کو پھر کمیونسٹ پارٹی کا چیئرمین اور عوامی فوج کا سپریم کمانڈر منتخب کر لیا گیا۔

۲۶ جون کو جب ہم چین پہنچے تھے تو اس سے چند روز قبل چیئرمین ماؤ نے نیوزی لینڈ کے وزیرِ اعظم سے ملاقات کی تھی۔ ۲۷ جون ۱۹۷۶ء کو وزیرِ اعظم اور بیگم بھٹو نے رات کے ۹½ بجے چیئرمین ماؤ سے ان کی اقامت گاہ پر تقریباً آدھ گھنٹہ تک ملاقات کی۔ ہمارا وفد چین سے وطن واپس آگیا تو چین کی وزارتِ خارجہ کی طرف سے ایک اعلان کیا گیا کہ "آئندہ چیئرمین کسی بھی غیر ملکی سربراہِ مملکت یا مہمانوں سے ملاقات نہیں کریں گے"۔ مغربی ممالک کے مبصرین نے چین کی حکومت کے اس اعلان کا یہ مطلب لیا کہ چیئرمین ماؤ کافی علیل ہیں۔

ہوا کو فنگ

چوتھی قومی پیپلز کانگریس کے انعقاد کے موقع تک مسٹر چو این لائی زندہ تھے مگر مرتبے کے لحاظ سے نیشنل کانگریس کے صدر مسٹر چو تہہ، چیئرمین ماؤزے تنگ کے بعد سب سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ لیکن بین الاقوامی سطح پر چین کے وزیر اعظم ہمیشہ ماؤ کے بعد اہم شخصیت مانے جاتے ہیں۔ جب مسٹر چو این لائی کا انتقال ہوا تو بیرون ملک چین کی قیادت میں تبدیلی کے بارے میں بے شمار قیاس آرائیاں کی جانے لگیں۔ چونکہ مسٹر تن سیاؤ پنگ پہلے نائب وزیر اعظم تھے۔ ان کو قائمقام وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ چین کے آئین کے مطابق وزیر اعظم کے انتخاب کے لئے نیشنل پیپلز کانگریس کے اجلاس کی منظوری ضروری ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم گذشتہ صفحات میں ذکر کر چکے ہیں۔ تن سیاؤ پنگ کی ترمیم پسند لائن کے بارے میں اکتوبر ۱۹۷۵ء ہی سے ملکی سطح پر بحث و تمحیص ہونے لگی تھی۔ چو این لائی کے انتقال کے بعد اگرچہ تن سیاؤ پنگ کو کچھ عرصہ کے لئے قائمقام وزیر اعظم مقرر کیا گیا لیکن ۷ فروری ۱۹۷۶ء کو سنٹرل کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اس میں چیئرمین ماؤ کی تجویز پر ہوا کو فنگ کو تن سیاؤ پنگ کی جگہ قائمقام وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ ۷ اپریل ۱۹۷۶ء کو پھر سنٹرل کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں ہوا کو فنگ کو مرکزی کمیٹی کا پہلا وائس چیئرمین اور وزارتی کونسل کا وزیر اعظم منتخب کر لیا گیا۔ یہ یاد رہے کہ وزیر اعظم چو این لائی کی زندگی میں ہوا کو فنگ ساتویں نائب وزیر اعظم تھے۔ اس طرح حکومت میں ان کی آٹھویں پوزیشن تھی۔ پارٹی میں بھی تقریباً ان کی یہی پوزیشن تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انکا اچانک وزیر اعظم بن جانا عالمی حلقوں میں خاص دلچسپی اور

حیرت کا باعث بنا۔

وزیرِ اعظم ہوا کو فنگ کی حتمی تاریخِ پیدائش معلوم نہیں ہو سکی لیکن ایک اندازے کے مطابق ان کی عمر پچپن اور ۶۰ سال کے درمیان ہے۔ بہر حال یہ تحقیق شدہ بات ہے کہ ہوا کو فنگ ۱۹۳۴ء میں شروع ہونے والی لانگ مارچ میں ۲۰ سال کے تھے۔ پہلی مرتبہ ہوا کو فنگ کو اس وقت اہمیت ملی جب ۱۹۵۵ء میں انہیں صوبہ ہونان کے ضلع سیانگ تان کا پارٹی سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء میں انہیں ہونان کی صوبائی حکومت میں ڈائریکٹر تعلیم و شناخت کے عہدے پر فائز کیا گیا ۱۹۵۸ء میں ڈپٹی گورنر ہونان کے علاوہ صوبائی پارٹی کا متبادل سیکرٹری بنا دیا گیا اور انہیں سائنسی امور کی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ اگلے سال یعنی ۱۹۵۸ میں ہوا کو فنگ پارٹی کے مکمل سیکرٹری چنے گئے، ساتھ ہی صوبے ہونان کی کمیونسٹ پارٹی کے وائس چیئرمین کا عہدہ بھی انہیں سونپا گیا۔ انہوں نے ۱۹۶۴ء کو پارٹی کی تیسری نیشنل پیپلز کانگریس میں ہونان صوبے کے سرکاری وفد کی قیادت کی۔ ۱۹۶۵ء میں انہیں چیئرمین ماؤ کی جائے پیدائش شاؤ شان میں ایک اہم آبپاشی کے منصوبہ کی ذمہ داریاں سونپی گئیں جو انہوں نے نہایت سلیقے سے سرانجام دیں اور ملک بھر میں شہرت حاصل کی۔

۱۹۶۶ء سے ۱۹۶۹ء تک، ثقافتی انقلاب میں ہوا کو فنگ نے نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کے انقلابی عمل اور کردار پر کسی قسم کی گرد نہ پڑی۔ ستمبر ۱۹۶۷ء میں جب چیئرمین ماؤ چنگ شا کے علاقے میں تشریف لے گئے تو ہوا کو فنگ نے صوبائی انقلابی کمیٹی کی استقبالیہ کمیٹی کے سربراہ کی حیثیت سے ان کا استقبال کیا۔

اور دوسرے مقامی قائدین کے ساتھ اس کمیٹی کے اجلاس میں بھی شرکت کی اور علاقے کی مؤثر نمائندگی کی۔ اپریل ۱۹۶۸ء میں یہاں کی صوبائی کمیٹی کے سینئر وائس چیئرمین مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۹ء میں چین کی کمیونسٹ پارٹی کی نویں کانگریس کے موقع پر ہواکو فنگ کو پارٹی کی ہائی کمان کی نشستوں پر جگہ دی گئی۔ اور اسی کانگریس میں ان کو پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا رکن منتخب کر لیا گیا

جولائی ۱۹۷۰ء میں ہواکو فنگ کو صوبہ ہونان کی انقلابی کمیٹی کا قائمقام چیئرمین بنایا گیا۔ اگست میں انہیں ہونان کی مقامی فوجی کمان کے سیاسی وِنگ کا ڈپٹی لیڈر چنا گیا دسمبر ۱۹۷۰ء میں ہونان چین کا پہلا صوبہ تھا جہاں پارٹی کے ڈھانچے کی صوبائی شاخ کی تنظیمِ نو کی گئی اور ہواکو فنگ کو فرسٹ سیکرٹری منتخب کیا گیا۔

۱۹۷۱ء میں یومِ مئی کے موقع پر ہواکو فنگ کو پیکنگ طلب کر لیا گیا، اور ۱۹۷۱ء کی "لن پیاؤ سازش" کے واقعات کے دوران "ہوا" پیکنگ ہی میں رہے، اور اکتوبر ۱۹۷۲ء یعنی سازش کے مکمل خاتمے تک یہیں رہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے نہایت اہم خدمات سرانجام دیں۔ پارٹی کی وہ دستاویزات جن میں لن پیاؤ کی سازش کے دوران ہواکو فنگ کی کارکردگی کی رپورٹ چھاپی گئی ہے۔ بہت کوشش کے باوجود نہیں مل سکی' البتہ ہانگ کانگ میں جو دستاویزات دوبارہ شائع کی گئیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ "لن پیاؤ کی سازش" کی تحقیقات کرنے کے لئے چین کی حکومت نے جو ایک خصوصی کمیٹی مقرر کی تھی ہواکو فنگ اس کے سیکرٹری جنرل تھے۔ "لن پیاؤ" کے ٹولے کے خلاف مقدمات چلانے اور مناسب کارروائی کرنے کی اہم ذمہ داری بھی ہواکو فنگ کے سپرد تھی۔ نومبر ۱۹۷۲ میں ہواکو فنگ جو

میں واپس چلے گئے یہاں کنٹن" کے مقامی ملٹری ریجن کے کمشنر کی حیثیت سے ان کا نام سامنے آیا۔ اسی کے ساتھ ہی ہونان کے فوجی کمان کے اوّل کمشنر مقرر کر دیئے گئے۔

اپریل ۱۹۷۳ء میں ہوا کو فنگ دوبارہ دالحکومت پیکنگ میں اپنے فرائض سرانجام دینے کے لئے بلائے گئے۔ اس دفعہ انہیں غیر ممالک سے زراعت کے ماہرین اور وفود کا استقبال کرنے اور ان سے گفت و شنید کرنے کی خدمات پر مامور کیا گیا۔ اسی سال اگست میں ان کو پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے "سیاسی بیوریو" میں شامل کر لیا گیا لیکن ان کے واضح فرائض اور کام کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا، یا ابھی تک منظر عام پر یہ بات نہ آسکی کہ ہوا کو فنگ کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔ جون ۱۹۷۴ء میں جب ثقافتی انقلاب شروع ہوا اور کنفیوشس ازم کے خلاف مہم چلائی گئی تو پیکنگ میں ایسے قدآدم اشتہارات بھی لگائے گئے، جن میں ہوا کو فنگ کی ہونان کے زمانے کی کارکردگیوں پر کڑی نکتہ چینی کی گئی تھی۔ مگر تھوڑے عرصے بعد یہ اشتہارات ہٹا دیئے گئے۔ جنوری ۱۹۷۴ء میں ہوا کو فنگ کو نائب وزیرِ اعظم اور وزیر برائے پبلک سیکورٹی مقرر کیا گیا۔ یاد رہے کہ چین میں اس وقت بارہ نائب وزراء اعظم تھے جن میں انکا چھٹا (۶) واں نمبر تھا۔ مارچ ۱۹۷۵ء میں ان کے ذمے نیشنل پیپلز کانگریس کی سٹینڈنگ کمیٹی کی طرف سے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ ۱۹۴۹ء کے انقلاب کے بعد کے "کومنتانگ" کے نظر بند راہنماؤں کے بارے میں رپورٹ مرتب کریں۔ ستمبر ۱۹۷۵ء میں ہوا کو فنگ نے قومی زرعی کانفرنس کی صدارت کی، جس کا عنوان تھا "زراعت میں تاچئی سے سیکھو"۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، ہوا کو فنگ کو یہ تمام

مراحل طے کرنے کے بعد کمیونسٹ پارٹی آف چین نے ملک کا وزیراعظم چنا اور ماؤزے تنگ کے بعد پہلا وائس چیئرمین بھی منتخب کیا۔

ہواکوفنگ چین کے دوسرے قائدین کے مقابلے میں بہت کم عمر کے ہیں وہ نہایت چاک و بند ہیں، ذہین ہیں اور ان کی شخصیت میں جاذبیت اور بھرپور کشش ہے۔ کافی ہنس مکھ اور زندہ دلی کے مالک ہیں۔ بات بات پر مسکرا کر محفل کو رونق بخشتے ہیں۔ ہمارے وہاں ہوتے ہوئے۔ انہوں نے جو دو تقریریں کیں ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پائے کے مقرر بھی ہیں۔ جن بے شمار چینی دوستوں سے ہماری گفتگو ہوئی انہوں نے ہواکوفنگ کی قیادت پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا اور یہ کہا کہ تن سیاؤ پنگ اور ان کے ٹولے کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ توقع ہے کہ ہواکوفنگ عرصہ دراز تک چین کے صفِ اول کے رہنماؤں میں شمار کئے جاتے رہیں گے۔

وَانگ ہُنگ وِین

جیسا کہ اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ ماؤزے تنگ کے بعد ہوا کوفنگ پہلے وائس چیئرمین ہیں اور وزارتی کونسل کے وزیر اعظم بھی ہیں، جبکہ وَانگ ہُنگ وِین کسی وزاتی عہدے پر فائز نہیں ہیں، بگر ہوا کوفنگ کے بعد پارٹی کے دوسرے وائس چیئرمین اور پارٹی کے "سیاسی بیورو" کے ۱۸ ممبران میں جو کہ ملک کا سب سے اعلیٰ سیاسی اور انتظامی ادارہ ہے، اس میں وَانگ ہُنگ وِین نمبر ۲ پر ہیں جبکہ ہَوا کوفِنگ نمبر ۹ پر ہیں۔ اس طرح "سیاسی بیورو" کی سٹینڈنگ کمیٹی کے سات ممبران میں سے مَاؤزے تُنگ کے بعد ان کا دوسرا نمبر ہے، ہَوا کوفِنگ پانچویں نمبر پر ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وزیر اعظم کا عہدہ حقیقت میں نمبر ۲ نہیں ہے۔ اصل میں "سیاسی بیورو" اور اس کی سٹینڈنگ کمیٹی کے ممبران پر نظر ڈالنے سے مرتبے کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس ترتیب کو سامنے رکھا جائے تو وَانگ ہنگ وِین ہی اصل میں چیئرمین ماؤ کے بعد نمبر ۲ پر ہیں، جبکہ ہَوا کوفِنگ وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہونے کے باعث پارٹی کے وائس چیئرمین ہیں۔

جب میں پاکستان سے چین کے دورے پر روانہ ہوا تھا تو بے شمار نوجوان ترقی پسندوں اور مزدور رہنماؤں نے مجھ سے کہا تھا کہ واپسی پر میں انہیں بتاؤں کہ چین میں شنگھائی کے ایک نوجوان مزدور رہنما جو ثقافتی انقلاب کے بعد چیئرمین ماؤ کے بہت قریب ہو گئے تھے، کس مرتبے پر فائز ہیں۔ یہ نوجوان مزدور رہنما وَانگ ہُنگ وِین ہی ہیں جن سے متعلق میں نے چین میں جو مزید معلومات حاصل کیں وہ یہ ہیں۔

وانگ ہنگ وین کے بچپن اور نجی معاملات کے بارے میں بہت کم تفصیلات مل سکی ہیں۔ تاہم سب سے پہلے انہوں نے کوریا کی جنگ میں چین کے نوجوان رضاکاروں کے ساتھ بہت کم عمری میں حصہ لیا۔ (اس وقت بھی ان کی عمر ۲۰ سال سے کم تھی)۔ ثقافتی انقلاب کے وقت وانگ ہنگ وین سنگھائی کی نمبر ۱۷ ٹیکسٹائل مل میں غیر معروف اور بالکل معمولی سطح کے کارکن تھے۔ یہاں پر دو اور معروف لیڈر چنگ چن چیاؤ اور یاؤ وین یُن جو اب "سیاسی بیوریو" میں بھی ہیں، ان کی قیادت میں سنگھائی کے علاقے میں ثقافتی انقلاب کی مہم کامیابی سے چلائی گئی۔ اس مہم میں وانگ نے صنعتی مزدوروں کی تنظیم کی اور ثقافتی انقلاب میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہاں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ماؤزے تنگ کی موجودہ بیوی مادام چیانگ چنگ بھی سنگھائی کی رہنے والی ہیں جہاں وہ ۱۹۳۳ء میں کمیونسٹ پارٹی کی رکن بننے سے پہلے فلم انڈسٹری سے وابستہ تھیں۔

سنگھائی جیسے اہم علاقے میں جب ماؤ کے حامیوں نے ۱۹۶۶ء کے آخر میں، لیاؤ شاؤچی کے ٹولے کا مکمل خاتمہ کر دیا تو سنگھائی کی میونسپل کمیٹی جس کو صوبے کا درجہ حاصل ہے اور مرکز کے ماتحت ہے، وانگ اس کی انقلابی کمیٹی کے نائب صدر چنے گئے۔ ۱۹۶۹ء کو پارٹی کی نویں کانگریس کے موقع پر وانگ کو ملکی مرکزی کمیٹی کا رکن منتخب کیا گیا۔ ۱۹۷۱ء میں انہیں سنگھائی کی پارٹی کا سیکرٹری بنا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ۱۹۷۲ء میں انہیں پارٹی کے مرکزی دفتر میں کام کرنے کی ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔ ۱۹۷۳ء میں سنگھائی کی ٹریڈ یونینوں کی فیڈریشن کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۷۳ء کے آخر میں جو پارٹی کی دسویں قومی کانگریس ہوئی، اس میں وانگ کو پارٹی کا "سیاسی بیوریو" سٹینڈنگ کمیٹی کا ممبر منتخب کیا گیا اور اس کے ساتھ ہی پارٹی کے وائس چیئرمینوں میں سے چو این لائی کے

بعد دوسرے وائس چیئرمین اور پارٹی کی ہائی کمان میں ماؤزے تنگ اور چو این لائی کے بعد تیسرے درجے پر فائز ہوئے مگر چو این لائی کے انتقال کے بعد پارٹی کے "سیاسی بیورو" میں چیئرمین ماؤ کے بعد انہیں دوسری پوزیشن مِل گئی۔

وانگ کی اتنی چھوٹی عمر میں اعلیٰ منصب پر پہنچنے کی وجوہات کے بارے میں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ ان کو عروج ثقافتی انقلاب کے دوران حاصل ہوا۔ چونکہ ثقافتی انقلاب کے مقاصد میں یہ بات تھی کہ چین میں رجعت پسند اور ترمیم پسند عناصر اور پارٹی میں سست اراکین کا محاسبہ کیا جائے۔ اس مہم میں نوجوان مزدور اور کسان کارکنوں نے سب سے اہم رول ادا کیا۔ وانگ، ثقافتی انقلاب کے مقاصد کے اور ماؤزے تنگ لائن کے بہترین نمائندے کی حیثیت سے طویل جدوجہد کے بعد سامنے آئے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں ماؤ کے معتمد ساتھیوں کا درجہ حاصل ہو گیا۔ پیکنگ میں ۱۹۷۲ء کے بعد وانگ چیئرمین ماؤ کے پاس اہم موقعوں پر اکثر دیکھے گئے اور غیر ملکی سربراہانِ مملکت کے دوروں کے دوران چیئرمین ماؤ کے ساتھ موجود رہے۔ ستمبر ۱۹۷۳ء میں جب فرانس کے صدر پمپیدو نے چین کا دورہ کیا اور چیئرمین ماؤ سے ملنے گئے تو ان کی اقامت گاہ کے باہر دروازے پر صدر پمپیدو کا استقبال وانگ ہنگ وین نے کیا اور ماؤزے تنگ کے کمرے میں انہیں لے گئے اور مذاکرات میں شریک رہے۔

ہمارے پیکنگ کے قیام کے دوران وانگ ہنگ وین کسی تقریب میں نہیں تشریف لائے۔ میں نے جب ان کے بارے میں چینی اور غیر ملکی مبصرین کی رائے پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ وانگ پارٹی کے مرکزی دفتر میں اہم فرائض سرانجام دیتے ہیں اور خاص خاص تقریبات میں شرکت کرتے ہیں۔

یہہ چئن ینگ

جنوری ۱۹۷۵ء میں ہونے والی چوتھی نیشنل پیپلز کانگریس کے اجلاس میں ہائی کمان کی نشستوں پر چو این لائی اور وانگ ہنگ وین کے بعد یہہ چئن ینگ کی نشست تھی، اس کے بعد تن ہسیاؤ پنگ بیٹھے تھے اور آٹھویں نمبر پر ہواکو فنگ کی نشست تھی۔ سٹیٹ کونسل کے وزراء کی مرتب ہونے والی فہرست میں بارہ نائب وزرائے اعظم کے بعد سب سے اوپر وزیر خارجہ چیاؤ کوآن ہوا کا نام تھا، اس کے بعد یہہ چئن ینگ کا نام وزیر دفاع کی حیثیت سے درج ہے۔ چو این لائی کے انتقال کے بعد چین کی کمیونسٹ پارٹی کی ہائی کمان میں جو ردو بدل کیا گیا اس کے مطابق ماؤزے تنگ کے بعد جو چار وائس چیئرمین ہیں ان میں ہواکو فنگ اور وانگ کے بعد یہہ چئن ینگ کا تیسرا نمبر ہے۔ پارٹی کے "سیاسی بیورو" کے ناموں میں ان کا چوتھا نمبر ہے جبکہ ہواکو فنگ کا نواں نمبر ہے۔ "سیاسی بیورو" کی سٹینڈنگ کمیٹی میں یہ تیسرے نمبر پر ہیں اور ہواکو فنگ پانچویں نمبر پر ہیں، نائب وزرائے اعظم کے بعد کابینہ کے وزراء میں وزیر خارجہ کے بعد ان کا نام وزیر دفاع کی حیثیت سے فہرست میں شامل ہے۔ اس لحاظ سے ان کے پاس مندرجہ ذیل عہدے ہیں:-

(۱) وائس چیئرمین آف سنٹرل کمیٹی کمیونسٹ پارٹی۔

(۲) ممبر سیاسی بیورو آف سنٹرل کمیٹی کمیونسٹ پارٹی۔

(۳) ممبر سٹینڈنگ کمیٹی آف سیاسی بیورو۔

(۴) وائس چیئرمین کمشن برائے فوجی امور آف سنٹرل کمیٹی کمیونسٹ پارٹی۔

(۵) وزیر دفاع

یہہ چین ینگ ۱۸۹۹ء میں "کوآن تانگ" صوبے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے سکول میں حاصل کی۔ بعد ازاں اپنے والدین کے ساتھ سنگاپور اور "ہونوئی" کا سفر کیا۔ ۱۹۲۴ء میں جب "ویمپوآ" ملٹری اکیڈمی میں بطور انسٹرکٹر کام کر رہے تھے تو کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ سُرخ فوج قائم ہونے کے بعد کمیونسٹ فوجوں کی اہم مقامات پر کمان کرتے رہے۔ جب ۱۹۲۷ء میں "نان چانگ" کی عوامی تحریک ناکام ہو گئی تو "یہہ" ہانگ کانگ چلے گئے۔ یہاں ان کی ملاقات چواین لائی سے ہوئی جو اس وقت شدید علیل تھے۔ "یہہ" نے ان کی تیمارداری اور دیکھ بھال کی ۱۹۲۹ء میں انہوں نے پیرس اور ماسکو کا دورہ کیا۔ جہاں "یہہ" نے ڈرامے اور اداکاری میں تربیت حاصل کی۔ بعد میں جب وہ چین واپس آئے تو انہوں نے ایک ڈرامہ گروپ کی تشکیل کی اور اس گروپ نے ان کی قیادت میں "جاپان کی مزاحمت کرو" کے موضوع پر انقلابی ڈرامہ ملک بھر میں سٹیج کیا۔ ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۶ء میں لانگ مارچ کے ہراول دستہ میں شریک رہے۔ جاپان کی جارحیت کے خلاف لڑی جانے والی جنگوں میں عظیم کارہائے نمایاں سرانجام دینے کے سلسلے میں ۱۹۴۵ء میں چیئرمین ماؤ نے انہیں اول درجے کا سونے کا تمغہ دیا۔

آزادی کے بعد مرکزی عوامی حکومت کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں قومی دفاعی کونسل کے وائس چیئرمین اور پیپلز لبریشن آرمی کے مرکزی ہیڈکوارٹر میں ڈائریکٹر مقرر کئے گئے۔ ۱۹۵۵ء میں انہیں مارشل کا خطاب دیا گیا۔ جب چین میں فوجی اعزازات رائج کئے گئے تو ان کو "فرسٹ اگست آرڈر" یعنی خود مختار آزادی کا تمغہ

دیا گیا۔

۱۹۵۶ء میں انہوں نے برما میں چین کے اعلیٰ فوجی وفد کی قیادت کی۔ ۱۹۵۸ء میں جب ایک وفد بھارت گیا تو اس کی قیادت بھی یہہ نے کی۔ ۱۹۵۷ء میں ایک اعلیٰ سطح کا فوجی وفد ماسکو گیا تو اس کے یہ ڈپٹی لیڈر تھے۔ ۱۹۵۸ء میں ان کو پیپلز لبریشن آرمی کی فوجی اکیڈمی کا صدر اور سیاسی کمشنر مقرر کیا گیا۔

۱۹۶۶ء میں ان کو کمیونسٹ پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے فوجی کمشن کا وائس چیئرمین مقرر کیا گیا۔ ۱۹۶۹ء میں پارٹی کی نویں کانگریس میں ان کو سیاسی بیوریو کا ممبر بنایا گیا۔ اور ۱۹۷۳ء میں پارٹی کی دسویں کانگریس میں ان کو سیاسی بیوریو کی سٹینڈنگ کمیٹی میں ممبر تین پر ترقی دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی "ہواکوفنگ" اور "وانگ" کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے تیسرے وائس چیئرمین منتخب کئے گئے۔ چین کے سابقہ وزیر دفاع "لن پیاؤ" کی سازش کی ناکامی اور ان کے انتقال کے بعد یہہ چین ینگ وزارتِ دفاع کے سربراہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں تاہم اس عہدہ پر مستقل تقرری کی توثیق جنوری ۱۹۷۵ء میں چوتھی نیشنل پیپلز کانگریس نے کی۔

ہمارے چین کے قیام کے دوران سرکاری مذاکرات میں وزیر دفاع کی حیثیت سے یہہ چین ینگ نے حصہ لیا۔ اس کے علاوہ ضیافتوں میں بھی بدستور موجود رہے۔ اس وقت ان کی عمر ۷۷ سال کے قریب ہے۔ لیکن یہ نہایت چاک و چوبند، ذہین اور پھرتیلی شخصیت کے مالک ہیں۔ لانگ مارچ کے زمانے کے صفِ اول کے معدودے چند رہنماؤں میں سے ہیں۔ پارٹی میں ان کا مقام چیئرمین ماؤ اور وانگ کے بعد تیسرے نمبر پر ہے۔ ان کے پاس اہم سیاسی عہدوں کے علاوہ چین

میں اہم ترین عہدہ یعنی پیپلز لبریشن آرمی کی سیاسی کمیٹی کے سربراہ کا عہدہ بھی ہے۔
سیاسی مبصرین کے مطابق اپنے آبائی صوبے میں بھی ان کا گہرا اثر و رسوخ ہے۔

مادام چیانگ چِنگ

یہ چیئرمین ماؤ کی موجودہ بیوی ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں صوبہ "شان تنگ" میں پیدا ہوئیں ان کا اصل نام "لی چنگ چِن" تھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد "ڈرامہ کے سکول" میں اداکاری کی تربیت حاصل کی۔ اس کے بعد ایک "تانگ نا" نامی اداکار سے شادی کر لی، اور اپنا نام "لی چنگ چِن" کی بجائے "لاں پنگ" رکھ لیا۔ انہوں نے شنگھائی کی فلم انڈسٹری میں کام کیا اور کافی شہرت حاصل کی، مگر ان کی شادی کامیاب نہ ہو سکی اور ۱۹۳۷ء میں اپنے خاوند سے انہیں طلاق لینا پڑی۔

مادام چیانگ چِنگ جب شنگھائی کی فلم انڈسٹری میں کام کر رہی تھیں تو انہوں نے خفیہ طور پر ۱۹۳۳ء میں کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت حاصل کر لی۔ لیکن سیاست میں زیادہ شہرت حاصل نہ کر سکیں۔ لیکن ۱۹۳۷ء میں طلاق حاصل کرنے تک، اس میں شک نہیں کہ مادام ایک مشہور سیاسی ورکر کی حیثیت سے کمیونسٹ پارٹی میں جانی پہچانی جاتی تھیں۔ ۱۹۳۹ء میں جب "ماؤزے تنگ" کی دوسری بیوی روس چلی گئیں تو چیئرمین ماؤ سے انہوں نے شادی کر لی۔ شادی کے بعد اگرچہ ماؤ کی رفیقۂ حیات کی حیثیت سے مادام چیانگ نے بے پناہ عوامی خدمات سرانجام دیں مگر ان کا نام عوام کے سامنے ایک لیڈر کی حیثیت سے نہیں لایا گیا۔

۱۹۶۶ء کے ثقافتی انقلاب کے دوران مادام چیانگ نے خواتین اور خاص طور پر شنگھائی اور دوسرے علاقے کے مزدوروں میں ثقافتی انقلاب کے اغراض و مقاصد کو روشناس کرانے کے لئے انتھک کام کیا اور ان کا نام ملک میں روشن ہو گیا۔ درحقیقت

مادام چیانگ ثقافتی انقلاب کے ماہرین میں سے ایک ہیں۔ اس دوران ان کو پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے "ثقافتی انقلابی گروپ" کا فرسٹ ڈپٹی لیڈر چنا گیا۔ اس گروپ کی قیادت پارٹی کے دانشور "چن پُوتا" کر رہے تھے۔

ان کو بعد میں ترمیم پسندانہ اور رجعت پسندانہ نظریات کی تشہیر کے سلسلے میں معزول کر دیا گیا تھا۔ مادام قوم کی نظر میں بہت محترم ہیں اور عوام ان کی بے پناہ عزت و تکریم کرتے تھے اور کرتے ہیں۔ ثقافتی انقلاب میں انہوں نے بہت ہی نمایاں کردار ادا کیا جس سے چینی عوام کے دلوں میں ان کا احترام اور بڑھ گیا۔ مادام چیانگ کو پرلتارۂ فن و ثقافت کے ماہر کی حیثیت سے بھی چین میں بلند ترین مقام حاصل ہے۔

۱۹۶۹ میں پارٹی کی نویں قومی کانفرنس کے موقع پر مادام کو پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے سیاسی بیوریو کا ان کی ثقافتی انقلاب کے دوران نمایاں خدمات کے صلے میں، رکن چنا گیا۔ اس طرح ان کو چیئرمین کی شریکِ حیات ہونے کے باوجود پہلی مرتبہ ۱۹۶۹ء میں اہم سیاسی پوزیشن دی گئی۔ ۱۹۷۳ء میں پارٹی کی دسویں کانگریس کے موقع پر مادام کو اس اہم عہدے پر دوبارہ منتخب کر لیا گیا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سیاسی بیوریو کے اہم رکن اور ماؤ کی بیوی ہونے کے باوجود مادام چیانگ، ماؤ کی ان میٹنگوں میں شرکت نہیں کرتیں جو غیر ملکی معززین اور سربراہانِ مملکت کے ساتھ ہوتی ہیں۔ البتہ مادام غیر ملکی سیاسی لیڈروں کو دوسرے پارٹی کے اہم قائدین کے ساتھ غیر رسمی تقریبات میں ملتی ہیں۔

لی سیئن نن

آپ وزارتی کونسل میں ہواکوفنگ کے بعد دوسرے نائب وزیرِاعظم اور سیاسی بیوریو کے پندرھویں ممبر ہیں۔ ان کا بھی چین کی صفِ اوّل کی شخصیات میں شمار ہوتا ہے۔ ان کو ۱۹۴۵ء میں پہلی مرتبہ پارٹی کی ساتویں کانگریس کے موقع پر مرکزی کمیٹی کا رکن منتخب کیا گیا۔ ۱۹۵۶ء میں پارٹی کی آٹھویں کانگریس میں لی سیئن نن کو اہم ترین سیاسی عہدہ دیا گیا یعنی سیاسی بیوریو کا انہیں رکن چنا گیا۔ یہ تب سے اسی عہدہ پر بدستور چلے آرہے ہیں۔

لی سیئن نن ۱۹۰۵ میں ایک غریب گھرانے میں صوبہ "ہوپے" میں پیدا ہوئے۔ جب ۱۹۲۷ء میں شمالی علاقوں کی آزادی کے سلسلے میں انقلابی فوج کے دستے "ہوپے" آئے تو "لی" کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہونے کے ساتھ سرخ فوج میں بھی بھرتی ہوگئے۔ ان کو اعلیٰ ذہانت، سیاسی پختگی اور قائدانہ صلاحیتوں کی بدولت بہت جلد اہم سیاسی مقام حاصل ہوگیا۔ ۱۹۳۵ء میں انہیں سرخ فوج کے چوتھے محاذ کی دسویں فوج کے سیاسی کمشنر کا عہدہ ملا۔ اس سال جب ان کی فوج کے دستے لانگ مارچ کے دوران مرکزی سرخ فوج کے دستوں سے آکر ملے تو چیئرمین ماؤ سے ان کی پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی۔

جب جاپان نے چین کو اپنا نشانہ بنایا اور منچوریا پر قابض ہوگیا اور کومنتانگ نے سرخ فوج سے اتحاد کرکے جاپان کے خلاف جنگ کا آغاز کیا تو انہوں نے مرکزی چین میں جاپان کے خلاف گوریلا دستوں کی قیادت کی تھی۔ "لی" ۱۹۴۱ء میں نئی چوتھی سرخ فوج کے ڈویژنل کمانڈر مقرر ہوئے۔ آزادی کی طویل جدوجہد کے دوران بیشمار مایوسیوں اور حادثات کے باوجود "لی" نے اپنی فوجوں کی قیادت نہایت جرأت

سے کی اور ہمیشہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

۱۹۴۹ء میں ان کو مرکزی علاقوں کی عبوری حکومت کی کونسل کا رکن بنایا گیا۔ اس کے علاوہ ان کو چوتھی سرخ فوج کا ڈپٹی کمانڈر بنایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی "ہوپے" صوبے کی فوجی کمان کا کمانڈر اور سیاسی کمشنر بھی مقرر کیا گیا۔ اس موقع پر ان کو صوبہ "ہوپے" کا چیئرمین یعنی گورنر بھی بنا دیا گیا۔

آزادی کے بعد لی سیئن نن کو عوامی انقلابی فوج کی کونسل کا ممبر منتخب کیا گیا۔ انہوں نے اس حیثیت میں سنٹرل پیپلز گورنمنٹ کی طرف سے بے شمار مالی اقتصادی اور زرعی اصلاحات کی کمیٹیوں کے سربراہ کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیئے۔ ۱۹۵۴ء میں جب چین کا پہلا آئین منظور ہوا اور سنٹرل پیپلز گورنمنٹ کا نام تبدیل کر کے سٹیٹ کونسل رکھ دیا گیا تو ان کو نائب وزیر اعظم، وزیر خزانہ اور وائس چیئرمین، مالی اور اقتصادی کمشن مقرر کیا گیا۔ (اب یہ صرف نائب وزیر اعظم اور ممبر "سیاسی بیورو" ہیں)۔ (وزیر خزانہ، وائس چیئرمین مالی اقتصادی کمشن کے باقی عہدے ان سے لے لئے گئے ہیں)۔ ۱۹۵۴ء میں انہیں نیشنل دفاعی کونسل کا ممبر اور ڈائریکٹر فنانس اور ٹریڈ جنرل آفس بھی مقرر کیا گیا۔ ۱۹۶۲ء میں ان کو وائس چیئرمین قومی منصوبہ بندی کا نیا عہدہ دیا گیا۔

لی سیئن نن کو نیشنل پیپلز کانگریس کے چاروں قومی اجلاسوں کا ڈپٹی لیڈر منتخب کیا جاتا رہا ہے۔ جنوری ۱۹۷۵ء میں ہونے والی چوتھی نیشنل پیپلز کانگریس کے پہلے اجلاس میں ان کو "ہائی کمان" کا ممبر چنا گیا۔ ثقافتی انقلاب تک وزارت خزانہ کا عہدہ انہیں کے پاس تھا۔ مگر ثقافتی انقلاب کے دوران بے شمار رہنماؤں کی معزولی اور ردوبدل

کی وجہ سے ان کی انتظامی ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ اس لئے ان سے وزارتِ خزانہ واپس لے لی گئی۔ تاہم مجموعی طور پر قومی سطح پہ مالی اور اقتصادی معاملات میں ان کا کافی عمل دخل رہا۔ چوتھی نیشنل پیپلز کانگریس کے موقع پر ان کو دوبارہ نائب وزیرِ اعظم منتخب کرلیا گیا۔ اور تنَ سیاؤپنگ کے ہٹائے جانے کے بعد سینئر نائب وزرائے اعظم میں سے ایک ہیں۔ اس کانگریس کے موقع پر ہی وزارت خزانہ کا عہدہ ان سے لیکر مقابلتًا نوجوان مسٹر چَنگ چِنگ فُو کے سپرد کر دیا گیا۔

لِی سِیئن نِن نے جن بے شمار غیر ممالک کا دورہ کیا ہے۔ ان میں البانیہ، روس، چیکوسلاویکیہ، رومانیہ اور کمبوڈیا قابلِ ذکر ہیں۔ اپریل ۱۹۷۵ء میں وزیرِ اعظم چواین لائی کی حیثیت سے انھوں نے ایران اور پاکستان کا بھی دورہ کیا۔

چیاؤ کوآن ہوا

آپ چین کے وزیر خارجہ ہیں اور کافی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ وزیر خارجہ کی حیثیت سے اقوامِ متحدہ میں ان کی تقریریں ایشیائی عوام کو گرماتی رہی ہیں۔ یہ پاکستان میں کئی مرتبہ تشریف لا چکے ہیں۔ چیاؤ کوآن ہوا، وزیرِ اعظم بھٹو کے اسوقت سے دوست ہیں جب بھٹو صاحب وزیرِ خارجہ تھے۔ یہ ایک زندہ دل شخصیت ہیں۔ ہمارے چین کے دورے کے دوران خصوصی ضیافتوں میں وفد کے اراکین سے گھل مل کر باتیں کرتے رہے اور اکثر و بیشتر قہقہے لگاتے رہے۔ قہقہہ ان کی جاندار شخصیت کا ایک لازمی جزو بن کر رہ گیا ہے۔

آزادی سے پہلے ان کا نام "جمنیز چیاؤ" تھا۔ یہ ۱۹۱۳ء میں صوبہ "کیانگ شو" میں پیدا ہوئے چین میں یونیورسٹی سے فلاسفی اور جمالیات کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے آپ جرمنی تشریف لے گئے۔ ۱۹۳۸ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر کے چین واپس لوٹے۔ صوبہ "کوآن تنگ" کے ہیڈ کوارٹر کینٹن میں مقامی فوجی کمان کے سیاسی شعبے کے سربراہ مقرر ہوئے۔ آپ جرمن کی کمیونسٹ پارٹی کے بانی اراکین میں سے ہیں۔ آزادی کی جنگ کے ایام میں ۱۹۴۴ء کے بعد کئی سال تک انہوں نے پارٹی کے پرچے کی اشاعت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ پارٹی کے جریدے کینٹن اور ہانگ کانگ سے شائع ہوا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے تمام دنیا میں پارٹی اور ہمدرد لوگوں سے رابطہ کا کام سرانجام دیا۔

۱۹۴۹ء میں چین کی سیاسی مشاورتی کانفرنس یعنی قومی اسمبلی کی ابتدائی کمیٹی

کے ممبر مقرر ہوئے پہلی حکومت میں جو اکتوبر میں قائم ہوئی وزارتِ خارجہ کی کمیٹی برائے خارجہ پالیسی کے وائس چیئرمین بنا دیئے گئے۔ اس سال ہی چین کے عوامی خارجہ پالیسی کے ادارے کے نائب صدر مقرر ہوئے اور یہ عہدہ ان کے پاس ۱۹۷۲ء تک رہا۔

۱۹۵۰ء میں چیاؤ کوآن ہوا نے کچھ عرصہ کے لئے وزارتِ خارجہ کے "شعبہ برائے ایشیا" میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء میں سلامتی کونسل کا کوریا کے معاملے میں جو اجلاس ہوا اس کے وفد کے سیاسی مشیر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ ۱۹۵۴ء میں مسٹر چو این لائی جو کہ چین کے وزیرِاعظم بھی تھے، ان کے اسسٹنٹ کی حیثیت سے ان کی تعیناتی ہوئی۔ ۱۹۶۴ء میں وزیرِ خارجہ کے عہدہ پر ان کو ترقی دی گئی۔ ۱۹۷۴ء میں "چی پنگ فیائی" کے وزارتِ خارجہ کے عہدہ سے علیحدہ ہونے کے بعد ان کو چین کا وزیرِ خارجہ بنایا گیا۔

نائب وزیرِ خارجہ کی حیثیت سے چیاؤ کے پاس مغربی یورپ، امریکہ، اقوامِ متحدہ کی بین الاقوامی تنظیمیں قانون اور غیر ممالک کے ساتھ معاہدوں کے محکمے تھے۔ ۱۹۷۱ء میں چین کے پہلے وفد کے قائد کی حیثیت سے انہوں نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کی۔ بعدازاں ۱۹۷۲-۷۳ء میں بھی اقوامِ متحدہ کی نمائندگی کر چکے ہیں۔

۱۹۷۳ء میں پہلی مرتبہ چیاؤ کو پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا رکن چنا گیا

چیاؤ کوآن ہوا نہایت ہی ذہین اور پُرکشش شخصیت ہیں۔ ان کا لب و لہجہ اثر انگیز ہے۔ انہیں کئی زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ ان کی پہلی شادی "گُنگ پنگ"

نامی لڑکی سے ہوئی۔ اس خاتون کو مسٹر ایڈگر سنو نے "حقیقی معنوں میں اعلیٰ شخصیت لکھا ہے ۱۹۷۰ء میں یہ خاتون انتقال کر گئیں۔ ۱۹۷۳ء میں چیاؤ نے ایک نوجوان لڑکی چنگ ہان چیہ سے دوبارہ شادی کر لی۔ یہ خاتون وزارتِ خارجہ کے ایشیا کے محکمہ میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہیں اور پاکستان کے معاملات کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ یہ خاتون شستہ انگلش بولتی ہیں اور نہایت با اخلاق اور ملنسار ہیں۔

پاک چین دوستی کا مختصر جائزہ

ساری دنیا جانتی ہے کہ دونوں ممالک نہایت قریبی دوست ہیں۔ پاک چین دوستی کی مثال دنیا کی تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ اس دوستی کو مستحکم کرنے کے لئے طویل عرصہ تک دونوں ملکوں کے عوام نے قربانیاں دی ہیں۔

چین کی آزادی کے وقت اور اس سے تھوڑا عرصہ پہلے پاکستان کی حکومت چیانگ کائی شیک اور ماؤزے تنگ کی انقلابی حکومت کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء کو چین آزاد ہوا اور دوست ملکوں سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد پاکستان نے ۴ جنوری ۱۹۵۰ء میں چین کو تسلیم کر لیا۔ اس وقت پاکستان دنیا میں ان چند ممالک میں سے تھا جنہوں نے چین کو تسلیم کیا تھا۔ پاکستان کے مخصوص حالات کی وجہ سے چین کے ساتھ تجارت کرنا ضروری تھی۔ اگلے دو سال میں چین کے ساتھ پاکستان کے تجارتی روابط میں خاصا اضافہ ہوا۔ ۱۹۵۲ء میں پاکستان نے ۸۳ کروڑ روپے یعنی ساڑھے پندرہ فیصد غیر ملکی برآمدات صرف چین کو کیں۔ کوریا کی جنگ کے بعد بھی چین کے ساتھ ہماری تجارت میں اضافہ ہوا۔

چین کے پہلے سفیر ۳ ستمبر ۱۹۵۱ء کو پاکستان میں تشریف لائے اور پاکستان کے پہلے سفیر جنرل رضا نے ۱۲ نومبر ۱۹۵۱ء کو چیئرمین ماؤ کو اپنی اسنادِ تقرری پیش کیں۔ چین کو تسلیم کرنے کے فوری بعد پاکستان نے اقوامِ متحدہ میں اور بین الاقوامی سطح پر اس کی مکمل حمایت کی۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۵۰ء کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس

ہیں اس وقت کے وزیرِ خارجہ ظفر اللہ خاں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "چین کو اقوامِ متحدہ میں شامل ہونے کے لئے درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ پہلے ہی اس کا ممبر ہے۔ فیصلہ صرف یہ کرنا ہے کہ چین کی اصل نمائندہ پیکنگ کی حکومت ہے یا فارموسا کی۔" ہمارے وزیرِ خارجہ نے دلیل پیش کی کہ پیکنگ کی حکومت ہی چین کی اصل نمائندہ ہے۔ ۱۹۵۰ میں جب چین نے تبت کے علاقے پر قانونی حکومت قائم کی تو پاکستان نے چین کی مکمل حمایت کی اور کہا کہ "تبت اس کا علاقہ ہے۔" اقوامِ متحدہ میں پاکستان نے اس مسئلہ پر غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کیا۔ لیکن اس وقت کے پاکستانی سفیر متعینہ امریکہ مسٹر اے ایچ اصفہانی نے چین کے مؤقف کی حمایت کی۔

۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۸ء کے درمیان پاکستان نے امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک کے سیٹو اور سنٹو کے فوجی معاہدوں میں شمولیت کر لی۔ مگر چین نے پاکستان کی مشکلات کو سمجھتے ہوئے اس کے فوجی معاہدوں کی مخالفت نہیں کی اور کشمیر کے مسئلہ پر ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان کے مؤقف کی بھرپور حمایت کی۔ ۱۹۵۸ء میں نئی حکومت آنے کے بعد پاکستان کی خارجہ پالیسی میں مقابلتاً تھوڑی بہت تبدیلیاں آئیں۔ ۱۹۶۲ء میں جب ہندوستان اور چین کی سرحدوں پر جھڑپیں ہوئیں تو پاکستان نے عوامی دباؤ کے تحت چین کی حمایت کی۔

۱۹۶۳ء میں پاکستان کا چین سے ساتھ ایک دوستانہ معاہدہ ہوا جس کے تحت چین کے ساتھ تین سو میل لمبی سرحدوں کی حدود طے کی گئیں۔ اس معاہدہ کے بارے میں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے وزیرِ خارجہ کی حیثیت سے گفت و شنید کی۔

اس کے ساتھ پاکستان اور چین کے تعلقات کا ایک خوشگوار دور شروع ہو گیا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستان پر جب مشکل ترین وقت آیا تو ساری دنیا جانتی ہے کہ چین نے ہماری زبردست حمایت کی۔ ۱۹۷۱ء کے بحران میں بھی چین نے پاکستان کے بہترین دوست کا کردار ادا کیا۔ اس طرح روز بروز پاکستان اور چین کے تعلقات مضبوط سے مضبوط تر ہوتے چلے گئے۔

عوامی حکومت بننے کے بعد پاکستان اور چین کے تعلقات میں مزید پختگی آئی ہے۔ ۱۹۷۱ء کے آخر میں جب ابھی یحییٰ خاں نے اقتدار نہیں چھوڑا تھا۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو، نے چین کا دورہ کیا اور پاکستان اور بنگلہ دیش کے معاملات پر چینی رہنماؤں سے بات چیت کی اور چین کی حمایت حاصل کی۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں چین نے پاکستان کی مکمل حمایت کر کے ثابت کر دیا کہ مشکل ترین وقت میں چین ہی پاکستان کا قابلِ اعتماد دوست ہے۔ بعد میں جب بنگلہ دیش نے اقوامِ متحدہ شمولیت کی درخواست کی تو چونکہ ابھی پاکستان کی حکومت نے بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا تھا اس لئے چین نے بنگلہ دیش کی رکن سازی کی درخواست کو ویٹو کر دیا۔ پاکستان نے اس وقت تک بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کیا جب تک تمام تر جنگی قیدی ہندوستان سے واپس نہ آگئے۔ اور اقوامِ متحدہ کی قرار دادوں پر عملدرآمد نہ ہو گیا۔ چین نے بھی بنگلہ دیش کو اس وقت تک تسلیم نہ کیا جب تک پاکستان نے تسلیم نہ کر لیا۔ عالمی سطح پر جہاں دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کے ساتھ سیاسی، اقتصادی اور فوجی میدان میں تعاون کیا ہے وہاں چین نے پاکستان کی آزادی، خود مختاری اور سالمیت کی زبردست حمایت کی اور توسیع پسندوں کے عزائم کو ناکام بنانے میں ہمارا

بھرپور ساتھ دیا۔ جب مئی ۱۹۷۴ء میں ہندوستان نے ایٹمی دھماکہ کیا تو چین نے ہندوستان کی ایٹمی دھمکی اور بلیک میلنگ کے خلاف پاکستان کا کھل کر ساتھ دیا۔

پاکستان اور چین کے خصوصی تعلقات یہاں تک ہیں کہ دونوں ملکوں کے رہنما اکثر و بیشتر ملتے رہتے ہیں عوامی حکومت قائم ہونے کے بعد جنوری ۱۹۷۲ء میں پھر بھٹو صاحب چین گئے۔

جب ہم چین میں تھے تو ضیافت میں میرے ساتھ ڈپٹی وزیرِ دفاع تشریف رکھتے۔ جب میں نے ان سے کہا کہ "مسٹر بھٹو چین کئی مرتبہ آئے ہیں" تو انہوں نے پھرتی سے کہا "اب بھٹو صاحب نویں مرتبہ چین آئے ہیں"۔ چین کے کئی بڑے رہنماؤں نے پاکستان کا دورہ کیا ہے۔ مسٹر چو این لائی بھی پاکستان تشریف لا چکے ہیں۔ عوامی حکومت بننے کے بعد اپریل ۱۹۷۵ء میں چین کے نائب وزیرِ اعظم لی سین نن تشریف لائے تھے۔ چیئرمین بھٹو نے ۱۹۷۲-۷۴ء کے دوروں میں چیئرمین ماؤ اور وزیرِ اعظم چو این لائی کے ساتھ باہمی امور پر اہم اور طویل مذاکرات کئے ہیں۔ اعلیٰ سطحی اجلاسوں کے علاوہ نچلی سطح پر بھی دونوں ملکوں کے درمیان مسلسل رابطہ رہتا ہے۔

ثقافتی، فنی، فوجی اور سپورٹس کے میدان میں بھی دونوں ملکوں کا گہرا تعاون رہا ہے۔ خاص طور پر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد پاکستان کی دفاعی ضروریات کے بارے میں چین نے ہماری بہت امداد کی ہے۔ اسی طرح اقتصادی میدان میں بھی کافی امداد دی گئی ہے۔ چین کے اصولوں کے مطابق امداد خود انحصاری اور خود کفالت کو

حاصل کرنے کے سلسلے میں دی جاتی ہے۔ جن اہم صنعتی منصوبوں میں چین نے ہماری امداد کی ہے، ان میں ٹیکسلا کی بھاری مشینری کا کارخانہ جس میں فولاد ڈھالنے کا کام کیا جائے گا، زیرِ تکمیل ہے۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل منصوبے بھی زیرِ عمل ہیں :-

(۱) تربیلا اور واہ تک دو سو بیس کلومیٹر بجلی کی لائن

(۲) صوبہ سرحد میں یوریا کی کیمیاوی کھاد کا کارخانہ

(۳) بلوچستان میں خام فولاد سے لوہا بنانے کا منصوبہ

(۴) ڈیرہ غازی کے علاقے "کاشمور" میں ایک چھوٹے سائز کا فولاد کا کارخانہ

(۵) صوبہ سرحد میں "حطار" کے مقام پر ایک اہم کارخانہ

(۶) اسلام آباد میں کھیلوں کے سلسلے میں ایک وسیع و عریض منصوبہ

(۷) شاہراہِ قراقرم کا عظیم منصوبہ

تجارت کے میدان میں بھی ہر سال زبردست ترقی ہو رہی ہے خاص طور پر پاکستانی مصنوعات چین میں بھیجی جاتی ہیں اور اس کے بدلے میں مختلف اشیاء پاکستان آتی ہیں۔ ثقافتی میدان میں بھی دونوں ملکوں کے درمیان وفود کے تبادلے ہوتے رہتے ہیں۔ پاکستانی طالب علم چین کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور چینی طالبِ علم بھی پاکستان میں اُردو اور دوسرے علوم و فنون سیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ گذشتہ سال چین کی وزارتِ تعلیم کا اہم وفد پاکستان آیا تھا۔ پاکستان کے وزیرِ زراعت شیخ محمد رشید ۷۶ء کے شروع میں اعلیٰ وفد کے ساتھ چین گئے تھے۔ اور اب زراعت کے میدان میں تعاون کے نئے مواقع تلاش کئے گئے ہیں۔ گذشتہ

سال، پیپلز پارٹی کا ایک اعلیٰ وفد جس کی قیادت مسٹر کمال اظفر نے کی تھی، پندرہ روز کے دورے پر چین گیا تھا۔ اس کے علاوہ پاکستانی شہری بھی انفرادی حیثیت میں سیر و سیاحت اور علم و ادب سیکھنے کے لئے چین جاتے رہتے ہیں۔ پاکستان کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں پاک چین دوستی کی انجمنیں قائم ہیں، اور یہاں چین کے تمام قومی تہوار منائے جاتے ہیں۔ اسی طرح چین میں بھی پاک چین دوستی کی انجمنیں ہیں۔ دونوں ملکوں کا لٹریچر بھاری تعداد میں آتا جاتا رہتا ہے۔ الغرض دونوں ملکوں کے درمیان عظیم اور لازوال دوستی کے رشتے قائم ہیں۔

چین کے بارے میں مزید معلومات

مکانات

میں نے کوریا کے باب میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ یہاں پر مکانات کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کوریا ایک چھوٹا ملک ہے۔ مگر وہاں آبادی کم اور زمین زیادہ ہے۔ نیز مکانات بنانے پر کافی توجہ دی گئی ہے۔ لیکن جب میں نے چین میں پوچھا کہ "یہاں پر سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے۔" تو مجھے بتایا گیا کہ "مکانات کا مسئلہ سب سے اہم ہے۔" پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ ماسوائے چند بڑے شہروں کے، جہاں انقلاب سے پہلے کے مکانات لوگوں کی نجی ملکیت میں ابھی ہیں۔ باقی تمام چھوٹے بڑے شہروں میں حکومت نے لاکھوں کروڑوں نئے مکانات اور فلیٹس تعمیر کئے ہیں اور ضرورت مندوں کو معمولی کرائے پر فراہم کئے جاتے ہیں۔ نوجوان جوڑے شادی کرنے کے فوراً بعد حکومت سے مکان طلب کرنے کے حق دار ہیں۔ یہ مکان تمام افراد کو باری باری ملتے ہیں۔ چونکہ ملک صنعت، زراعت، فوجی ساز و سامان حتیٰ کہ ایٹم بم اور میزائل کی تیاری میں بھی مصروف ہے اور اس پر ملکی اور غیر ملکی بھاری ذمہ داریاں ہیں، اس لئے بالخصوص بڑے شہروں میں مکانات کی تعمیر بھی نامکمل ہے۔ مگر یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ یہ مسئلہ کسی صورت میں بھی سرمایہ دار ملکوں میں پائی جانے والی شکل میں یہاں موجود نہیں ہے۔ ہر فرد کو حکومت کی مدد سے سر چھپانے کی جگہ دی جاتی ہے اور مکانات کی فراہمی کی تمامتر ذمہ داری حکومت کی ہے۔ دیہات میں مکانات تقریباً کمیون کی مدد سے بنائے گئے ہیں، جو کمیون ممبران کی ذاتی ملکیت ہیں۔ ملک میں وسیع و عریض

رہائشی مکانات فراہم کرنے کا منصوبہ زیرِ تکمیل ہے اور چند سالوں میں نہ صرف یہ مسئلہ مکمل طور پر حل ہو جائے گا۔ بلکہ رہائشی سہولتوں کا معیار بھی کافی اونچا ہو جائے گا۔

جب ہم پیکنگ سے باہر شاہراہ پر جا رہے تھے تو ارد گرد کے دیہات کے کچھ پکّے اور کچھ نیم پختہ مکان نظر آ رہے تھے (نیم پختہ سے میری مراد ایسے مکانات ہیں جو پتّھروں سے بنائے گئے تھے۔ مگر ان پر پلاسٹر اور سیمنٹ وغیرہ استعمال نہیں کیا گیا تھا) مٹّی کا ایک بھی کچّا مکان پورے چین میں نہیں ہے اور نہ ہماری طرح کی وہاں جھونپڑیاں ہیں، البتہ کہیں کہیں چین اور مشرقی ایشیا کی پرانی طرز کی بانس اور سرکنڈے کی بہت مضبوط جھونپڑیاں نظر آ رہی تھیں، بہت صاف ستھری اور خوبصورت تھیں کچھ جھونپڑیاں رہائش کے علاوہ جانوروں کو باندھنے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ چین کے دیہاتوں میں پانی کے نکاس کا مکمل بندوبست ہے۔ بیت الخلائیں اور اور دوسری جدید سہولتیں ہر جگہ موجود ہیں۔

شہروں اور دیہات میں جو مکانات لوگوں کی ملکیت ہیں وہ وارث کے انتقال کے بعد بچّوں کو ورثے میں مل جاتے ہیں ویسے تو ایسی نوبت آنے تک ہر خاندان کے بچّوں کو اپنی ضروریات کے مطابق مکانات مل چکے ہوتے ہیں بس کسی جگہ پر بچّوں کو والدین کے مکانات کی ضرورت پڑتی ہے۔

یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ چین کے تمام علاقوں میں بجلی فراہم کر دی گئی ہے۔ تمام دیہات خوبصورت ترتیب سے سڑکوں سے ملے ہوئے ہیں۔ یہ سڑکیں کہیں کہیں نیم پختہ بھی ہیں لیکن یہاں کی پختہ سڑکوں سے بہتر ہیں۔ پورے چین میں سڑکوں کا جال" اپنی مدد

آپ" کے اصولوں کے تحت بچھایا گیا ہے۔

تنخواہیں اور اخراجات ہم یہ بات پہلے کہہ چکے ہیں کہ چین میں زیادہ سے زیادہ چار سو یُن یعنی ایک ہزار روپے فی کس ماہوار تنخواہ ہے اور کم سے کم ۳۵ یُن یعنی ۸۷/۵ روپے ماہوار ہے۔ دوسری بنیادی سہولتیں یعنی مکان، تعلیم، صحت، ٹرانسپورٹ، سستا کپڑا، خوراک اور بچوں کے لئے فراہم کی جانے والی امداد اس کے علاوہ ہے۔ پچھلے دس سال سے یہاں تنخواہوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا اور نہ پچھلے بیس سال سے اشیاء ہی کی قیمتیں بڑھی ہیں۔ عوام کی مالی حالت بہت اچھی ہے۔ حکومت کیطرف سے بنیادی سہولتوں کی فراہمی کے سبب چین کے عوام ملنے والی تنخواہوں سے نہ صرف باآسانی اپنی تمام ضروریات پوری کر لیتے ہیں بلکہ بعض اوقات اپنے تمام اخراجات پورے کر لینے کے بعد کچھ پس انداز بھی کر لیتے ہیں۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ اس کی تنخواہ ۹۰ یُن ۲۲۵/ روپے ماہانہ ہے اور اس کی بیوی کی تنخواہ ۵۵ یُن یعنی ۱۳۷/۵ روپے ہے، دونوں میاں بیوی دس یُن فلیٹ کا کرایہ ادا کرتے ہیں جس کے دو کمرے، باورچی خانہ غسل خانہ وغیرہ ہے۔ گائیڈ کی والدہ بھی ساتھ رہتی ہے چونکہ اس نے نوکر نہیں کی تھی اس لئے اسے پنشن نہیں ملتی۔ اس کے اخراجات بھی ہمارا گائیڈ اور اس کی بیوی برداشت کرتے ہیں۔ ہمارے گائیڈ کے دو اور بھائی ملک کے دوسرے حصوں میں کام کرتے ہیں اور اپنے خاندان کے خود کفیل فرد ہیں۔ وہ اپنی بوڑھی والدہ کی کوئی مالی امداد نہیں کرتے۔ گائیڈ نے بتایا کہ ان کی والدہ کبھی کبھار چھٹیاں منانے کے لئے اپنے دوسرے بیٹوں کے پاس بھی چلی جاتی ہے۔ گائیڈ مسٹر "لی" کی پانچ سال کی ایک بچی بھی ہے جو اڑھائی سال کی عمر میں نرسری سکول جانے

لگی تھی اور اب کنڈرگارٹن میں پڑھتی ہے۔ جس کی سالانہ صرف دو یُن فیس ہے۔ کتابیں مفت ہیں۔ البتہ کپڑے اور خوراک والدین کی ذمہ داری ہے۔ انہوں نے بتایا کہ "نرسری گھر کے قریب ہے اور میں بائیسکل پر بچّی کو سکول چھوڑ آتا ہوں"۔ لیکن دور کے علاقوں میں بچّے بسوں پہ سکول جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں زمین دوز گاڑی بھی استعمال کی جاتی ہے۔ جس کا برائے نام کرایہ ہے۔ چین میں بائیسکل کی قیمت ۱۵۰ یُن یعنی سات سو روپے ہے۔ بچّوں کا بائیسکل ایک سو یُن میں آتا ہے۔ بچت کرنیوالے حضرات موٹر سائیکل تک خرید سکتے ہیں۔

اپنی تنخواہ کا حساب کتاب بناتے ہوئے مسٹر لی نے بتایا کہ وہ میاں بیوی تقریباً پچاس یُن خوراک پر خرچ کرتے ہیں، دس یُن مکان کے کرائے اور باقی متفرق اخراجات پر۔ اتنا خرچ کرنے کے بعد بھی مہینے میں بیس تیس یُن بچ جاتے ہیں جنہیں وہ بنک میں جمع کروا دیتے ہیں۔ اس پر انہیں دو فیصدی سالانہ منافع بھی ملتا ہے۔ مسٹر لی نے ہمیں بتایا کہ اس وقت ان کے پاس پانچ سو یُن بنک میں جمع ہیں۔ میاں بیوی دونوں کے پاس بائیسکل ہیں۔ ان کے گھر میں ریڈیو، ٹی وی، فرج، فرنیچر، دوسرا ساز و سامان اور ضرورت کے تمام کپڑے، بستر وغیرہ معقول تعداد میں موجود ہیں۔ انہیں کسی قسم کی مالی پریشانی نہیں اور نہ پورے چین میں کسی اور فرد کو کوئی مالی پریشانی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ سارے ملک میں شہری لوگوں کی زندگی ان کی طرح ہی ہے اور وہ کوئی دقّت یا پریشانی محسوس نہیں کرتے۔

تعلیم | ملک بھر میں کوئی شخص ان پڑھ نہیں ہے۔ انقلاب کے بعد

ناخواندگی کو ختم کر دیا گیا ہے۔ پورے چین میں نرسری کی تعلیم عام ہے۔ اڑھائی سال سے پانچ سال تک کی عمر کے بچے نرسری میں پڑھتے ہیں۔ والدین صرف ایک دن کے لئے بھی بچوں کو نرسری میں بھیج سکتے ہیں اور ہفتے کے لئے بھی۔ اس ضمن میں ان پر کوئی پابندی نہیں ہے کہ بچوں کو ہفتہ وار نرسری ہی میں داخل کروائیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات کام کاج کرنے والے والدین اپنے بچوں کو ہفتہ وار نرسری ہی میں داخل کرواتے ہیں۔ اس طرح ان کا وقت بھی بچتا ہے اور بچوں کی تربیت بھی بہتر ہوتی ہے۔ نرسری کے بعد سات سال کی عمر کے بچے کنڈر گارٹن میں تعلیم پاتے ہیں۔ پانچ سال کی پرائمری کی تعلیم اور پھر سیکنڈری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہر شہری کم از کم آٹھ سال تک سکول میں لازماً تعلیم حاصل کرتا ہے۔ بعد میں ہائی سکول، یونیورسٹی اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے اعلیٰ ادارے ہیں، باصلاحیت لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے کے مواقع میسّر ہیں۔ اس ضمن میں تفصیلاً ذکر کیا جا چکا ہے۔ لیکن یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ چین میں تعلیم فطری رجحانات کے مطابق رائج ہے۔ ابتدا ہی سے عملی تعلیم پر زور دیا جاتا ہے اور سیکنڈری سکول کی تعلیم کے بعد بچوں کو کھیتوں اور فیکٹریوں میں کام کرنے کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ یوں بچوں کے ذہنی رجحانات کا اندازہ آسانی سے لگا لیا جاتا ہے۔ چین میں تعلیم ماؤ کے اس مقولے کے تحت دی جاتی ہے کہ "عمل علم کی بنیاد ہے۔"

سماجی زندگی ہم جتنے دن چین میں ٹھہرے ہم نے فیکٹریوں، کمیونوں، تعلیم کے اداروں اور ثقافتی سنٹروں کے علاوہ پیکنگ شہر کی گلیوں، کوچوں میں بھی خوب گھوم پھر کر دیکھا۔ بڑے سٹوروں پر گئے، چھوٹی دکانوں اور

قہوہ خانوں میں بھی بیٹھے ہم نے پوری احتیاط سے یہ جاننے کی کوشش کی کہ ۸۰ کروڑ کی آبادی کے سوشلسٹ نظام کے بعد بھی کوئی سماجی مسائل ہیں یا نہیں۔ قارئین کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ چین میں سرمایہ دار ممالک کی طرح کا ایک بھی سماجی مسئلہ نہیں ہے۔ مثلاً زنا، چوری، ڈاکہ، قتل، دھوکہ دہی، غنڈہ گردی، سمگلنگ، ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ، اغوا، عصمت فروشی اور اسی طرح کے سینکڑوں، ہزاروں جرائم کا مکمّل خاتمہ ہوچکا ہے۔ بس کبھی کبھار معمولی نوعیت کے گھریلو جھگڑے ہو جاتے ہیں، یا نوجوانوں میں کوئی ادنیٰ سا تنازعہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جب کبھی ایسا ہو تو مقامی انقلابی کمیٹی فوراً حرکت میں آتی ہے۔ اکثر و بیشتر ایسے معاملات موقعہ پر ہی نمٹا دیئے جاتے ہیں۔ زیادہ تر یہ کوشش کی جاتی ہے کہ میاں بیوی کی صلح ہو جائے۔ البتہ شاذ کوئی معاملہ عوامی عدالت میں چلا جاتا ہے۔ ان عدالتوں کے صدر اور اراکین مقامی پارٹی کے رہنماؤں میں سے ہوتے ہیں اور وہ گھر کے والدین کی طرح ان معاملات کو نمٹا دیتے ہیں۔ یہاں وکلاء کا کوئی پیشہ نہیں، کمیٹی کے اراکین انصاف کے تقاضے مکمّل طور پر پورے کرتے ہیں۔ فریقین کے نکتہ نگاہ کو سنا جاتا ہے اور انہیں سمجھایا جاتا ہے۔ اگرچہ مقامی عدالت سے اوپر علاقائی طور پر اپیل وغیرہ کی گنجائش ہے اور قومی سطح پر سپریم جوڈیشل کونسل بھی موجود ہے۔ مگر شاید کوئی معاملہ وہاں تک پہنچتا ہو۔ چونکہ چین میں نجی ملکیت کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ اس لئے وہاں بھاری مقدمات اور رٹ درخواستوں کا چکّر بالکل نہیں اور نہ ہی پولیس کا محکمہ ہے۔ صرف علاقائی سطح پر پیپلز کانگریس اور انقلابی کمیٹیوں کے ماتحت پبلک سیکورٹی کا ایک محکمہ کام کرتا ہے جو پولیس کے فرائض سر انجام دیتا ہے۔ چین میں پولیس سٹیشن، تھانے،

چوکیاں وغیرہ نہیں ہیں۔ یہاں جو سیکورٹی کے افراد ہیں وہ عوام میں سے ہوتے ہیں اور عوام کے سامنے جواب دہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی قسم کی ناانصافی، رشوت، دلالی، تشدد اور اثر ورسوخ یہاں موجود نہیں ہے۔ چین کے بڑے شہروں میں صرف ٹریفک پولیس موجود ہے۔ دوسری انتظامی پولیس کہیں بھی نہیں ہے۔ عوام اپنی آپ حفاظت کرتے ہیں۔ چین کے اسی کروڑ عوام میں سے بچوں اور بوڑھوں کو چھوڑ کر باقی تمام افراد تربیت یافتہ ہیں اور معاشرے کی طرف سے جو اِن پر ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں انہیں احسن طریقے سے پوری کرنے کی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہر شہری فوجی تربیت بھی حاصل کرتا ہے۔

شادی بیاہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ چین میں ہر لڑکا لڑکی اپنی اپنی مرضی سے شادی کرتا ہے۔ والدین اس سلسلہ میں کوئی جبر نہیں کر سکتے۔ والدین، سکول اور تربیت کے دوسرے ادارے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو معاشرے میں باعزت رہنے کے آداب سکھاتے ہیں، نوجوانوں کی ذہنی تربیت کی جاتی ہے اور انہیں اخلاقاً ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ کم از کم ۲۳ سال کی عمر تک شادی نہ کریں۔ ویسے ۱۸ سال کی عمر کے بعد قانوناً شادی کی جاسکتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ چین میں نوجوانوں کے جذبات کی ایسی تہذیب ہو چکی ہے کہ وہ دیر سے شادی کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

سرمایہ دار ممالک میں خاندانی منصوبہ بندی پر کروڑوں روپیہ خرچ کیا جاتا ہے مگر پھر بھی شرحِ پیدائش میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ چین میں سوشلسٹ نظام کی بدولت ایسی عمدہ روایات پنپ چکی ہیں کہ یہاں خاندانی منصوبہ بندی نہ ہونے کے باوجود

پیدائش کی رفتار متوازن ہے۔ لازمی تعلیم، فیکٹریوں اور کھیتوں میں کام کرنے سے عوام تعمیری کردار کے حامل بن جاتے ہیں اور ان کا نصب العین، وطن و قوم کی خدمت بن جاتا ہے۔

چین میں جب نوجوان جوڑے شادی کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو والدین اور دوستوں کی طرف سے شادی کا دن پورے احترام اور تقدس سے منایا جاتا ہے۔ نکاح وغیرہ نہیں کیا جاتا۔ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے والا جوڑا مقامی انقلابی پارٹی کے دفتر میں ایک مخصوص رجسٹر پر والدین اور دوستوں کی موجودگی میں دستخط کر دیتا ہے۔ جس کے بعد دونوں میاں بیوی کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس رسم کے فوراً بعد مقامی عوامی ہال میں مختصر سی دعوت ہوتی ہے اور معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ جہیز، حق مہر اور تحفے تحائف کا رواج قطعی نہیں ہے۔ شادی کے بعد اکثر نوجوان جوڑے اپنے والدین کے ساتھ نہیں رہتے۔ حکومت، فیکٹری یا کمیون کی طرف سے مہیا کردہ فلیٹ یا مکان میں منتقل ہو جاتے ہیں۔

شادی کے بعد جوڑے خوشگوار زندگی بسر کرتے ہیں۔ گھریلو جھگڑے اور طلاق کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ شادی، نظریاتی ہم آہنگی، انقلابی جذبہ اور قوم و ملک کی خدمت کے اعلیٰ مقاصد سے مربوط ہے۔ شادی کو ایک مقدس رشتہ سمجھا جاتا ہے۔ جس کے تحت قوم اور ملک کی مل کر خدمت کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے۔

جب سے چین میں اشتراکیت کی بنیادیں مضبوط ہوئی ہیں وہاں ہر قسم کی برائیاں ختم ہو گئی ہیں حتیٰ کہ طلاق کے کیس تک ختم ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھار ایک آدھ طلاق کا

کیس ہوتا ہے جسے مقامی عوامی عدالتوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ عدالت دونوں میں صلح صفائی کرانے کی کوشش کرتی ہے اگر ایسا نہ ہو سکے تو نوجوان جوڑے کو علیحدہ ہو جانے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ طلاق کے بعد دونوں فریق آزادی سے دوسری شادی کر سکتے ہیں۔

مذہبی آزادی اور اقلیتیں چین میں بے شمار اقلیتیں مقیم ہیں۔ جن میں سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں کی ہے۔ تمام اقلیتوں کو آئین کے مطابق مذہبی، ثقافتی اور ہر قسم کی دوسری آزادی اور خودمختاری حاصل ہے۔ ایک اندازے کے مطابق چین میں تین کروڑ مسلمان آباد ہیں جن میں بہت سے کمیونسٹ پارٹی کے اعلیٰ عہدیدار ہیں اور حکومتی عہدوں پر بھی فائز ہیں۔ مسلمانوں کو اپنی مسجدوں میں عبادت کرنے کی اجازت ہے۔ پیکنگ میں ایک بہت بڑی مسجد ہے جہاں جمعہ کی نماز بڑے تزک و احتشام اور شان و شوکت سے پڑھائی جاتی ہے اور دوسری نمازیں بھی باجماعت پڑھی جاتی ہیں۔ دوسری مذہبی رسومات ادا کرنے کے سلسلے میں مکمل آزادی ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسری اقلیتیں جن میں بدھ، عیسائی اور قبائلی لوگ شامل ہیں، اپنے رسم و رواج آزادی سے پورے کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔

عام زندگی چینی عوام کی روزمرّہ زندگی بہت سادہ ہے۔ صبح سویرے اٹھ کر کام کرنے والے مرد اور عورتیں کھیتوں، فیکٹریوں، دفاتر اور دکانوں میں چلی جاتی ہیں۔ چینی بچّے سویرے سویرے خوبصورت لباس پہنے بائیسکلوں، بسوں پر یا پیدل اپنے اپنے سکولوں کو منظم طریقے سے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ والدین بھی اپنے کام سے وقت نکال کر بچّوں کو سکول چھوڑ آتے ہیں۔ دنیا کے دوسرے

ممالک کی طرح والدین اپنے بچوں کے مسائل میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔

چند ایک چینی دوستوں سے ہماری بات چیت ہوئی، انہوں نے گفتگو کے دوران اپنے بچوں کی صحت، تعلیم، کھیل کود، مستقبل اور ان کے رجحانات کے بارے میں کھل کر اظہار خیال کیا۔

یہ ناقابل یقین حد تک سچ بات ہے کہ پورے چین کی سڑکوں، بازاروں اور دیہاتوں میں کوئی بھکاری، اپاہج، معذور، بے روزگار، نکھٹو اور کاہل نظر نہیں آتا۔ سڑکیں بازار اور محلے صرف کام کرنے کے لئے آنے جانے والے لوگوں سے بھرے رہتے ہیں۔ کئی چوراہوں پر اور سیر و تفریح کے مراکز میں بے شمار لڑکے اور لڑکیاں آزادی سے گھومتے پھرتے اور ہنستے کھیلتے نظر آتے ہیں۔

پیکنگ کے بین الاقوامی شہرت یافتہ تن این من اسکوائر میں سارا دن اور ساری شام نوجوانوں، کسانوں، مزدوروں اور سیاحوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ یہاں پر بے شمار فوٹوگرافر بڑے بڑے کیمرے لگا کر بیٹھے رہتے ہیں اور تقریباً ہر آنے والا ان کی زد میں آجاتا ہے اور فوٹو کھنچوانا ہی پڑتا ہے۔ اسی طرح پیکنگ میں دوسرے تاریخی مقامات پر بھی ہزاروں کی تعداد میں بچے، بوڑھے اور نوجوان سیر و تفریح کرتے نظر آتے ہیں۔ چین میں دکانیں بازاروں سے ہٹ کر بند گلیوں میں واقع ہیں جہاں مکھیاں، مچھر اور گندگی بالکل نہیں۔ خرید و فروخت کی اشیاء کو دکاندار ڈھانپ کر رکھتے ہیں۔ ہمیں چین میں کہیں بھی ایک مچھر اور مکھی تک دکھائی نہیں دی۔ سبزیوں اور مچھلی کی دوکانوں پر جمگھٹا ہوتا ہے، چیزوں کی قیمتیں جن کا گذشتہ سطور میں تفصیلاً ذکر کیا جا چکا ہے، دس پندرہ سال کے دوران کم ہوئی ہیں، بڑھی نہیں ہیں۔ آٹا بہت

ارزاں ہے، البتہ گھی کم ہے لیکن اس کی جگہ وافر مقدار میں مکھن مارکیٹ میں دستیاب ہے اور سستا ہے۔ ریشمی کپڑا چین میں سستا ہے۔ جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں ریشم کی پیدا وار زیادہ ہے۔ نائیلون اور ریان بھی کاٹن سے سستے ہیں لیکن ریشم ان دونوں سے ارزاں ہے۔ سوت چونکہ کم پیدا ہوتا ہے اس لئے سوتی مصنوعات ذرا کم دستیاب ہیں تاہم چینی عوام کی ضروریات فراخدلی سے پوری کی جاتی ہیں۔ یہاں جوتے مغربی ممالک کے مقابلے میں نہایت سستے ہیں۔ شیشے اور چینی کے برتن اعلیٰ ترین ہیں اور بہت سستے ہیں۔ لکڑی کی اشیاء بہت خوبصورت اور ارزاں ہیں۔ قالین اعلیٰ مگر ذرا مہنگے ہیں۔ آسائش کی چیزیں مارکیٹ میں کم ہیں اور کافی مہنگی ہیں۔ چین میں خواتین بالکل زیورات نہیں پہنتیں، یہی وجہ ہے کہ سونے چاندی یا دوسرے مصنوعی زیورات، چوڑیاں اور عورتوں کی آرائش کا سامان ناپید ہونے کی حد تک کم ہے۔ یہاں تمباکو بہت ہوتا ہے، سگریٹ سستے اور اچھے ہیں۔ سگار یا پائپ وغیرہ نہیں ہیں۔

فیکٹریوں، کھیتوں اور بازاروں میں چھوٹی چھوٹی کینٹینیں اور ہوٹل ہیں جہاں دوپہر کے وقفے کے وقت لوگ عام رواج کے مطابق کھانا کھاتے ہیں مگر زیادہ تر گھروں میں کھانا پکایا جاتا ہے۔ فیکٹریوں، سکولوں اور کالجوں میں انتظامیہ کی طرف سے کھانے کے مکمل انتظامات ہوتے ہیں اور اگر کام کرنے کے دوران کھانے کا وقت ہو جائے تو مفت کھانا مہیا کیا جاتا ہے۔ ہم نے کسی کینٹین یا ہوٹل پر کھانا حاصل کرنے کے لئے عوام کی قطاریں نہیں دیکھیں۔ چین میں خوراک سستی ہے۔ وہ لوگ بھی ہماری طرح اپنے گھروں میں اچھی خوراک

تیار کرتے ہیں۔ زیادہ تر چینی اُبلے ہوئے چاول، سبزیوں کا شوربا، ہفتے میں دو دن گوشت، تین دن مچھلی کھانے کے عادی ہیں۔ ان کی خوراک متوازن اور غذائیت سے بھرپور ہوتی ہے۔

ہم پچھلے صفحات میں ذکر کر آئے ہیں کہ چین میں فضول قسم کی روایات بالکل نہیں ہیں صرف قومی تہوار جوش و خروش سے منائے جاتے ہیں۔ شادی بیاہ اور بچّوں کی پیدائش پر بھی خوشی منائی جاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر دوست احباب اور رشتے دار مِل جُل کر بیٹھتے ہیں۔ اگر کوئی شخص مرجاتا ہے تو فیکٹری، کمیون، یا محلّے کے افراد شایانِ شان تدفین کا انتظام کرتے ہیں۔ چین میں مُردوں کو دفن بھی کیا جاتا ہے اور جلایا بھی جاتا ہے۔ یہاں دونوں صورتیں رائج ہیں کسی ایک صورت کو اپنانے کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ کسی شخص کی وصیت کے یا اس کے خاندان کے فیصلے کے مطابق عمل کیا جاتا ہے۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ چین میں قبرستان بہت کم دیکھنے میں آئے ہیں۔

چین میں جہاں تعلیم، صحت، روزگار، خوراک کی فراہمی اور دوسری بنیادی سہولتیں ریاست کی ذمہ داری ہے۔ وہاں اگر کوئی شخص مرجائے تو اس کو احترام سے دفن کرنا بھی حکومت کے فرائض میں شامل ہے اور اسے بنیادی ضروریات کا حصّہ سمجھا جاتا ہے۔ ماؤ کے عظیم دیس میں کوئی انسان بھوکا، ننگا اور بے روزگار نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ علاقے کی انقلابی کمیٹی کا یہ فرض ہوتا ہے کہ لوگوں کی بنیادی سہولتوں کا مکمّل تحفظ کرے۔ بوڑھاپا تو چین میں بھی آتا ہے لیکن چین میں کوئی بوڑھا طبّی امداد نہ ملنے کے سبب نہیں مرتا، اپنی طبعی موت مرتا ہے۔ یہاں مہلک ترین امراض کا

علاج حکومت کے خرچ پر کیا جاتا ہے اور ہر شخص کو آخری حد تک طبی سہولتیں مفت فراہم کی جاتی ہیں اور اگر کبھی مقامی یا علاقائی سطح پر ماہر ڈاکٹر کی خدمات حاصل نہ ہو سکیں (ایسا بہت کم ہوتا ہے) تو مریضوں کو مرکزی بڑے ہسپتالوں میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ یوں تو انقلاب سے قبل بھی چین میں لوگوں کی عمریں لمبی ہوتی تھیں۔ مگر انقلاب کے بعد بہتر خوراک، طبی سہولتیں اور فزیکل کلچر رائج ہونے کی وجہ سے نہ صرف لوگوں کی صحت قابلِ رشک ہے بلکہ اس سے لوگوں کی اوسط عمریں بھی بڑھ گئی ہیں۔ یہاں تک کہ ساٹھ سال کی عمر میں ریٹائر ہونے کے بعد بھی لوگ کوئی دوسری ملازمت کرنا پسند کرتے ہیں۔

چین میں ٹریفک اتنی منضبط اور سڑکیں اسقدر محفوظ ہیں کہ یہاں حادثے بالکل نہیں ہوتے۔

۳۰-۵-۷۶ حسبِ دستور مجاہد صاحب نے پانچ بجے اٹھ کر نماز پڑھی، تلاوت کی اور پھر مجھے جگایا۔ میں صبح کی سیر کرنے کے لئے مہمان خانہ سے باہر گھومنے پھرنے چلا گیا۔ میرا دل آج چین سے پاکستان روانہ ہونے کے خیال سے کچھ اداس تھا۔ بیس پچیس منٹ کی سیر کے دوران میں نے چین میں جو کچھ دیکھا تھا، اس کی مکمل تفصیل اپنے ذہن میں دہرائی۔ چینی عوام کی مہمان نوازی، ان کے کردار و عمل کی عظمت اور ان کی زبردست ترقی کے واقعات میرے ذہن کے پردے پر لہرا رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ چیئرمین ماؤ کا خوبصورت چین امن و سکون کا گہوارہ بن گیا ہے۔ اس روز میں نے پیکنگ کی خوبصورت سڑکوں، بلند ترین عمارتوں، پھولوں، جھومتے پودوں، حسین و جمیل اور شاداں و فرحاں نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو

جی بھر کے دیکھا۔ سوشلسٹ نظام کی بدولت چین کی گود میں مسکراتی ہوئی زندگی میرے سامنے تھی اور گنگناتے ہوئے دل افروز مناظر گدگدیاں کر رہے تھے۔ میں بہت دیر تک سوچ کی پگڈنڈیوں پر دوڑتا رہا۔

ساڑھے سات بجے کے قریب میں اپنے کمرے میں واپس آیا اور کپڑے بدلے پھر میں اور مجاہد صاحب ناشتے کے کمرے میں گئے۔ یہاں شیخ رشید، مسٹر اور بیگم حفیظ پیرزادہ، مسٹر افضل سعید خاں اور ان کی بیگم پہلے سے موجود تھیں۔ ناشتے کی میز پر گذشتہ دنوں کے باہمی تجربات اور مشاہدات کا ذکر ہوتا رہا۔ ابھی ہم ناشتے کی میز پر ہی بیٹھے تھے کہ وزیر اعظم کی طرف سے وفد کے سینئر اراکین کو پیغام ملا کہ دس بجے پاکستان اور چین کے معاہدوں پر دستخط ہوں گے۔ اس لئے ان کی شمولیت ضروری ہے۔ وزرا صاحبان معاہدوں کی رسم میں شرکت کے لئے چلے گئے۔ اب ہم کچھ دیر کے لئے فارغ تھے۔ موقع کو غنیمت جانتے ہوئے میں، حنیف نارو اور مجاہد صاحب "فرینڈشپ سٹور" آ گئے۔ یہاں دوسرے دوست بھی موجود تھے جو چھوٹی بڑی خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ ہم نے بھی سٹور سے پاکستانی دوستوں کو دینے کے لئے چند رومال، لکڑی کے تحفے اور کافی تعداد میں ماؤ کیپ خریدیں۔ یہاں سے گیارہ بجے فارغ ہوئے تو ہم نے شہر کے مرکزی حصوں میں گھوم پھر کر اپنی حسرت پوری کی۔ بارہ بجے کے قریب کمرے میں واپس آئے۔ اس سے پہلے ہمارا سامان ہوائی اڈہ پر جا چکا تھا۔ ہم جلدی سے دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے ڈائننگ ہال میں چلے گئے۔ کھانا کھایا اور ایک بجکر ۲۰ منٹ پر گاڑیوں میں بیٹھ کر وزیر اعظم کی اقامت گاہ پر پہنچے۔ یہاں سے قطار میں ہمارا قافلہ ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہوا۔ آج بھی پہلے دن

کی طرح جگہ جگہ سرخ رنگ کے انگریزی اور چینی زبان میں لکھے ہوئے "پاک چین دوستی" کے بینر نصب تھے۔ ہر چند قدم کے بعد محرابیں بنائی گئی تھیں۔ چوراہوں میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہاتھوں میں پھول لئے ہمیں خیر باد کہنے کے لئے کھڑے تھے۔ شہر سے ہوائی اڈے تک سارے راستے میں ہزاروں کی تعداد میں عوام منظم طریقے سے ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہہ رہے تھے۔ میں نے ایک بار پھر تمام مناظر پر بھرپور نظر ڈالی اور میں اس خیال سے افسردہ ہو گیا کہ نہ جانے مجھے دوبارہ چین آنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے یا نہیں۔ اور کبھی پھر چین آؤں تو کہیں اس دھرتی کا عظیم دیوتا یعنی چیئرمین دنیائے فانی سے رخصت نہ ہو چکے ہوں۔ میرے لاشعور میں چھپا ہوا یہ خدشہ مجھے جھنجھوڑ کر رکھ گیا۔ کیونکہ چین میں میری تمام تر توجہ کا مرکز ماؤ تھے۔ اور میں انہیں ایک نظر دیکھنے کی شدید خواہش رکھتا تھا۔

دو بجے کے قریب ہم ہوائی اڈے پر پہنچے۔ حسب دستور وزیراعظم پاکستان نے مسلح افواج کے دستوں سے سلامی لی اور پھر اہم شخصیتوں، جن میں کمیونسٹ پارٹی کے پولیٹیکل بیورو کے اراکین، مرکزی کمیٹی کے ممبران، وزراء، دنیا کے تمام ممالک کے سفارت خانوں کے سربراہ اور دیگر معززین سے ہاتھ ملایا۔ ہوائی اڈہ پاک چین دوستی کے سرخ بینروں سے دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ نوجوان بچیاں ہاتھوں میں خوبصورت پھول لئے آرکسٹرا کی انقلابی دھنوں پر ہلکا پھلکا رقص کر رہی تھیں۔ تقریبات ختم ہونے تک وفد کے تمام افراد طیارے میں اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ سب سے آخر میں وزیراعظم اور بیگم بھٹو طیارے میں داخل ہوئے۔ پورے اڑھائی بجے جہاز کے کپتان نے جہاز کی پرواز کا اعلان کیا۔ طیارہ آہستہ آہستہ رن وے پر سے دوڑتا ہوا فضا میں بلند ہو گیا۔ اگلے پانچ گھنٹے جو ہم نے طیارے میں گزارے ان میں سے تقریباً ساڑھے چار گھنٹے چین کے علاقے کو عبور کرنے میں لگے۔

چین اتنا وسیع و عریض ملک ہے کہ پاکستان کی سرحد جو گلگت کی پہاڑیوں سے ملتی ہے، اس تک پہنچنے کے لیے تقریباً ساڑھے چار گھنٹے کا سفر ہے۔ ہمارا طیارہ کوہِ ہمالیہ کی بلند و بالا برف سے ڈھکی ہوئی اونچی چوٹیوں پر سے ہوتا ہوا اسلام آباد کی جانب بڑھ رہا تھا جہاز کے کپتان نے فلک بوس پہاڑی سلسلے پر سے گزرتے ہوئے "نیلا پربت" اور "کے ٹو" کی چوٹیوں کے بارے میں مختصر معلومات فراہم کیں۔ جب میں نے اشتیاق سے نیچے دیکھا تو مجھے برف کا ایک سمندر نظر آیا۔ ہر طرف برف کی دبیز سفید چادریں تنی ہوئی تھیں۔ یہ پہاڑی سلسلہ ایسا ہے جو سارا سال برف سے ڈھکا رہتا ہے۔ کچھ پہاڑیاں کالے رنگ کی نظر آرہی تھیں۔ جہاز کے کپتان نے ان پہاڑیوں سے متعلق بتایا کہ یہ برف کے تودوں یعنی گلیشیئر سے مکمل طور پر ڈھکی ہوئی ہیں اور جب برف بہت زیادہ پڑتی ہے اور درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے بھی نیچے گر جاتا ہے تو ان کا رنگ سیاہی مائل ہو جاتا ہے۔ ان بلند ترین پہاڑیوں کے درمیان مقابلتاً چھوٹی پہاڑیاں اور کہیں کہیں وادیاں بھی نظر آرہی تھیں جن میں سفید روئی کے گالوں کی طرح برف پڑی دکھائی دے رہی تھی، کسی جگہ برف کے تودے لڑھکتے ہوئے بھی نظر آرہے تھے۔ یہ نظارہ اتنا پرکشش تھا کہ میں ان میں کھو سا گیا تھا۔

طیارہ جونہی پاکستان کی حدود میں داخل ہوا تو ہنزہ کے لہلہاتے سبزہ زاروں کے دلفریب منظر نگاہوں کو حرارت دینے لگے، مجھ پر محویت سی طاری ہونے لگی، میری آنکھوں کے آگے برف زاروں اور مستی میں ناچتے سبزہ زاروں کی طلسماتی دنیا گھوم رہی تھی، کہ ہمارا طیارہ ایبٹ آباد اور پھر تربیلا ڈیم کو پیچھے چھوڑتا ہوا اسلام آباد کی جانب بڑھنے لگا اور میرے کانوں میں ایئرہوسٹس کی سریلی آواز گونجی

"حضرات ہمارا طیارہ چند لمحوں میں اسلام آباد کے ہوائی اڈے پر اترنے والا ہے۔"

طیارہ اڈے پر اترا، وزیرِ اعظم بھٹو نے پاکستانی افواج کے دستوں کی سلامی لی، اہم شخصیتوں سے ہاتھ ملایا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر پرائم منسٹر ہاؤس روانہ ہو گئے۔ ہمارے دوسرے دوست بھی اپنی اپنی منزلوں کی طرف چلے گئے۔ میں نے پی آئی اے کی ریزرویشن کی اگلی پرواز کا ٹکٹ خریدا اور دس بجے کے قریب لاہور کے ہوائی اڈہ پر پہنچ گیا۔ اور اپنے بارہ دن کے سفر کی ناقابلِ فراموش یادوں کے پھولوں کی مہک سمیٹتا ہوا گھر آ گیا۔ میں نے زندگی میں ایشیاء، یورپ اور دوسرے متعدد ممالک کے دورے کئے ہیں، گرانقدر مشاہدات کی دولت سمیٹی ہے، سوچ کے دریچوں میں تجزیئے کی قندیلیں روشن کی ہیں، جانچ پرکھ کے راستے چمکائے ہیں، چہروں پر لکھی ہوئی تحریریں بھی پڑھی ہیں، اور روحوں میں پلتے ہوئے گھاؤ بھی دیکھے ہیں۔ ظاہری چمک دمک کے پیچھے آہوں اور سسکیوں کا اُبلتا ہوا جہنم بھی دیکھا ہے۔ میری سیاسی روح کبھی مطمئن نہ ہو سکی اور مجھے وہ کچھ نہ مل سکا جو میں نے کوریا اور چین میں چند دن گزارنے پر حاصل کیا۔ انسانی قدروں کی بالادستی کے پھولوں سے مہکا ہوا دیس کوریا اور انسانی عظمتوں کے ضیا بار سورجوں کا دیس چین میرے شہرِ خیال میں نئی صبحوں کی شدید تڑپ کے اُجالے بھر گیا ہے۔ اور تمام نظاموں کی بے سکونی اور سیاہی واضح انداز میں میرے سامنے آ گئی ہے اور دنیا بھر کی تمام تر خوبصورتیوں کے باوجود میرا فکری ایمان ہے کہ "چین ہے تو چین میں"

عظیم ماؤ کو سلام

۹-۹-۷۶ کو میں "چین ہے تو چین ہیں" کے آخری صفحات لکھ رہا تھا کہ اچانک ریڈیو پاکستان سے اعلان ہوا "چیئرمین ماؤ انتقال کر گئے ہیں" یہ سنتے ہی مجھ پر بجلی ٹوٹ پڑی اور میرا ذہن چین کی گلیوں، کوچوں اور بازاروں کی پُر سکون زندگی کی تصویر کشی کرنے لگا مجھے زندگی میں سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ چیئرمین ماؤ سے ملاقات کروں مگر ایسا نہ ہو سکا۔

میں نئی منزلوں کا ایک ادنیٰ سا راہی اور نئی صبحوں کا متلاشی ماؤ جیسے عظیم ترین انسان کو کیا خراجِ عقیدت پیش کر سکتا ہوں۔ چین کی افیونی دھرتی سے اُبھرنے والا وہ سرخ سورج جو خود تو ڈوب گیا مگر جاگیرداری، سرمایہ داری اور استعماریت کے قیامت خیز اندھیروں میں ان گنت سورج اُگا گیا۔ جس نے جبر و استبداد سے بجھتی ہوئی زندگی کو امن و سکون کی قبا پہنائی۔

وہ ماؤ جس کا قلم سمندروں میں رواں پانیوں سے تیز اور پہاڑوں کی غراتی ہوئی فلک بوس

چوٹیوں سے بھی عظیم تھا اور جس نے گوریلا طرزِ جنگ کا فلسفہ دیکر۔ سامراج کے آہنی قلعوں کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔

وہ فکر و فلسفہ کا جہاں تاب ستارہ تھا اور عزم و عمل کا ناقابلِ تسخیر آفتاب۔

جب تک دنیا میں ظلم و جبر کے اندھیرے رقصاں ہیں ماؤ روشنی کا ہالہ بن کر آزادی پسندوں کے ساتھ ہوگا۔ جب تک تاریخ زندہ ہے۔ انسان کا ضمیر جاگتا ہے، بہاروں میں دلکشی موجود ہے۔ دھرتی کے گلشن پر خزاں کا منحوس سایہ پڑتا ہے

"ماؤ زندہ ہے اور زندہ رہے گا"

ظالموں کے خلاف بلند ہوتے ہوئے کروڑوں ہاتھ اور قدموں میں گرتے ہوئے لاکھوں تخت و تاج گواہی دے رہے ہیں کہ ماؤ زندہ ہے اور زندہ رہیگا" "اُسکے افکار زندہ رہیں گے۔

وہ ماؤ جس نے بتایا کہ "انقلاب بندوق کی نالی سے نکلتا ہے"

وہ ماؤ جسکا قول ہے کہ "جنگ کو جنگ کے ذریعے ختم کیا جاسکتا ہے" ——— ہمیشہ زندہ رہے گا۔

جب تک دنیا قائم ہے اور سورج زندگی کو حرارت بخشتا ہے۔ "ماؤ زندہ رہے گا۔"

میں سچائیوں اور صداقتوں کے اس سرچشمہ کو یہی خراجِ عقیدت پیش کر سکا ہوں کہ میں نے چین کے دورے کی تمام یادوں کو اکٹھا کر کے "چین ہے تو چین میں" کے قالب میں ڈھال دیا ہے اور ۹-۹-۷۶ کو اپنی کتاب کا مسودہ مکمل کر کے ماؤ کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کیا وہ ۹ ستمبر ۱۹۷۶ء کی تاریخ، جب چیئرمین ماؤ زے تنگ ہم سب سے جدا ہو گئے اور ہم سب میں آ گئے

ے : اُتر گیا ہے دلوں میں وہ دھڑکنیں بنکر
وہی جو کل تھا نگاہوں میں چاندنی کیطرح

تاج محمد لنگاہ

آئندہ کی مطبوعات

نظام کی تبدیلی کے تقاضے	تاج محمد لنگاہ
عظیم ماؤ زندہ ہے (مستند سوانح عمری)	〃
گواہی (اہم انٹرویوز اور تقاریر)	〃
حکم حضوری جب آیا (شام، سعودی عرب اور کویت جدید تاریخ کے آئینے میں)	آئی ایچ راشد اور وحید عثمانی
سی آئی اے اور اس کی سازشیں	ترجمہ: تاج محمد لنگاہ
پیپلز پارٹی اور اس کا کردار (جلد اول)	〃
صدا کی دستک (منظومات)	حزیں لدھیانوی
انقلابات (عہد حاضر کی انقلابی اور ارتقائی تحریکوں کا جائزہ)	ظہیر کاشمیری

PROSPECTS OF THIRD WORLD UNITY

by, Taj Muhammad Langah — Dr. Muhammad Aslam P.H.D

MACHIAVELLISM

by. Sana-u-Rehman

Z.A. BHUTTO

THE GREAT LEADER OF THIRD WORLD

by, Taj Muhammad Langah

A SHORT VISIT TO RUSSIA

by, Taj Muhammad Langah

JOURNEY TO THE WEST

by, Taj Muhammad Langah

ارتقا پبلی کیشنز - ۶۵ دی مال، لاہور